دوسری جنگ عظیم کی کہانیاں

(World War Two Stories & Novels)



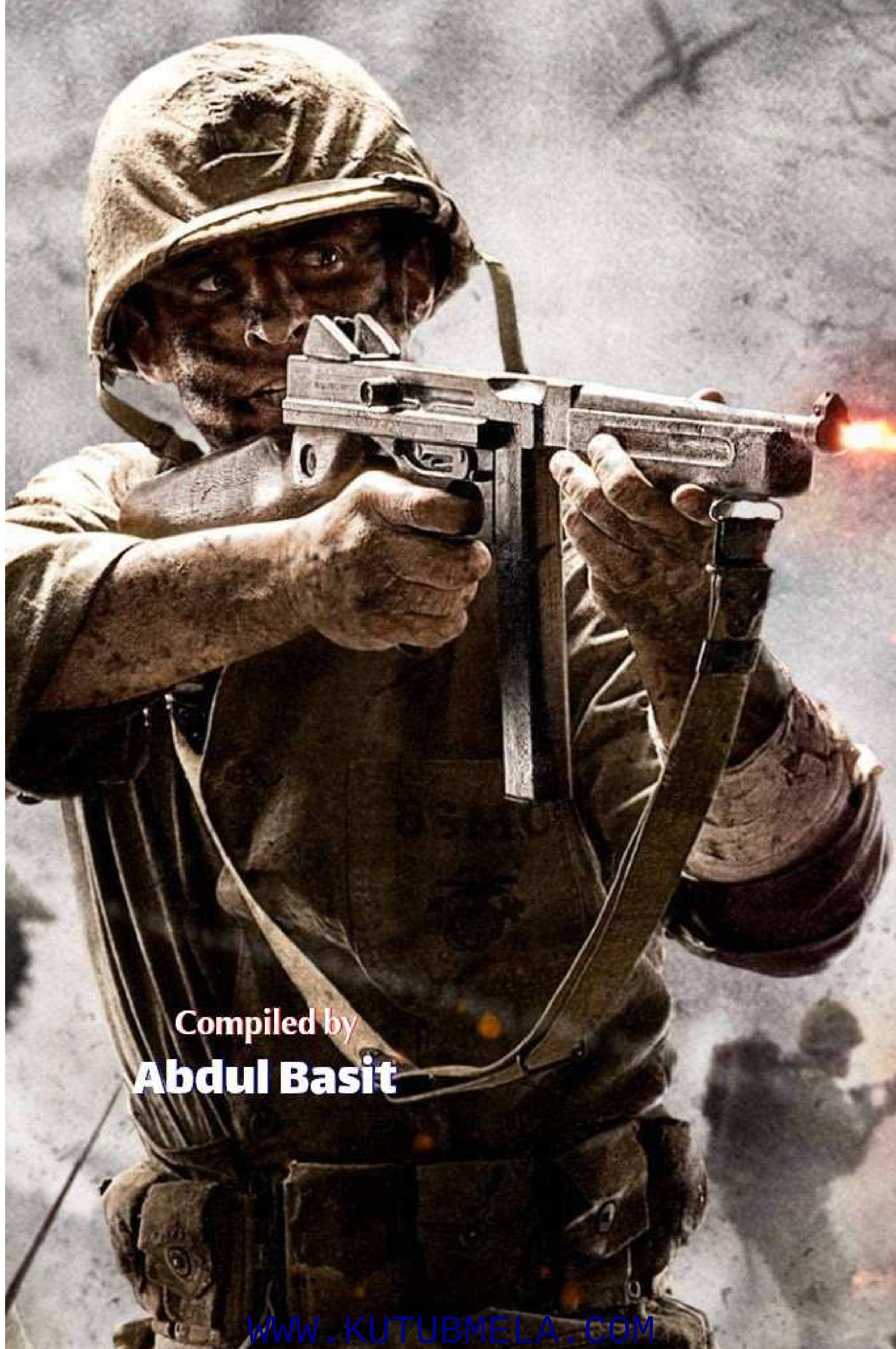
(3)

(محراب اردو ڈائجسٹ سے انتخاب)

دوسری جنگ عظیم کی کہانیاں

(World War Two Stories & Novels)




Compiled by
Abdul Basit

دوسری جنگ عظیم کی کہانیاں

*محراب اردو ڈائجسٹ سے انتخاب

*مشہور عالم ناولوں کی تلخیص

(3)

ہٹلر سے سازباز
روسی جاسوسی کارنامہ
اور وہ خاموش رہا
بلی نے جاپان کو شکست دی
خطرناک جاسوس
غلطی دانستہ کی گئی
آرنھم کا غدار
بحری بھیڑیا
13جون1944
70ہزار سے مقابلہ
نازیوں کے ہم
کامیابی نے قدم چومے
ایک عظیم ماں



دوسری جنگ عظیم کا سب سے خفیہ ہتھیار

برلن پر پہلا ہوائی عملہ

ویت نام کی دردناک ڈائری

قسمت کا لکھا

ننگا آسمان ننگی زمین

قیدیوں کے قیدی

خبطی وزیر اعظم

بندوقوں کے سائے تلے

جب جاپان ہار رہا تھا

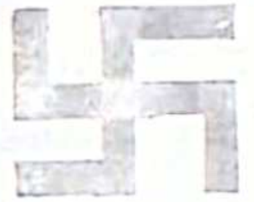
عورت اور جنگ

کیا ہٹلر اس بچے کا باپ تھا؟

توپوں کی زد میں

ہٹلر کا آخری دور

وہ شخص جس نے ہٹلر سے ساز باز کی



محمود اے یٰسین

جنگ کے شروع ہی میں اسٹاک ہام کے مسٹر ایرک ایرکسن (MR. ERIC ERICKSON) کو دشمن کے ساتھ تجارت کرنے اور جرمنی کی جنگی صلاحیتوں کو مدد بہم پہنچانے پر مورد الزام ٹھہراتے ہوئے اتحادی بلیک لسٹ پر چڑھایا جاچکا تھا۔ اتحادی انٹیلیجنس نے اطلاع دی تھی کہ ایرکسن جرمن تیل کی تجارت کر رہا ہے۔ اور اس کی مسلسل کھیپیں جرمنی میں بھیج رہا ہے اور یہ کہ گسٹاپو کے اعلیٰ حکام کے ساتھ اُس کے قریبی تعلقات ہیں۔

ایرکسن کے خاندان کیلئے یہ انکشاف ایک سکتہ طاری کردینے والا سانحہ تھا۔ اس کے پُرانے ساتھی جو تمام کے تمام شدت سے اتحادی پسند تھے اسے دیکھ کر اب اپنا راستہ بدل لیا کرتے اس کی بیوی کو سماج سے خارج کر دیا گیا۔ ایرکسن گرچہ سویڈن کا ایک شہری تھا، لیکن اس کی پیدائش اور تعلیم وتربیت بروکلین میں ہوئی تھی۔ اور کارنل سے اس نے گریجویشن کیا تھا۔ اب ریاستہائے متحدہ میں مقیم اس کے خاندان کی طرف سے اسے مذمتی خطوط موصول ہونے لگے لیکن اسے کچھ بھی روک نہ سکا۔

مسٹر ایرکسن امریکی سیلزمین نوعیت کا شخص تھا۔ اس قماش کا جس کا پیشہ اپنے مال ومتاع کے ساتھ ساتھ اپنا ذاتی وصف بھی بیچ ڈالنے پر رابطہ قائم کرلیتا ہے۔ وہ تیل کی تجارت میں اس لئے کُودا تھا کہ یہ تحریک پیدا کرنے اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جانے والی تھی۔ اس نے مشرق اور اس کے بعد یورپ میں بھی اپنے سال گزارے تھے۔

بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائیوں یعنی ۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۰ء کے درمیان "تیل کے تاجروں کا جم غفیر" ایک بین الاقوامی قبیلے کی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ ایک شخص کو ایک سال شانگ ہائی میں دیکھتے تو دوسرے سال لندن یا طہران میں۔ ایک سال آپ



فنکے اگر پستول نہ رکھتا تو گرفتار نہ ہوتا

اس کے ساتھ بڑے بے رحمی سے مقابلے کر رہے ہوتے تو دوسرے سال آپ دونوں غیر جانب داری سے ایک ہی طرف ہو کر رہ جاتے۔ امریکی، انگریز، ڈچ، جرمن سبھی ایک طرح کی مہاتی قمار بازیوں اور سازباز کی فضا میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایرکسن سویڈن میں ٹیکساز کا مینیجر بن گیا۔ پھر وہ سویڈن کا ایک شہری بن گیا اور اس نے اپنی ایک ذاتی کمپنی قائم کر لی جس کا مقصد امریکی تیل کے ذخیروں کو درآمد کرنا اور انھیں فروخت کرنا تھا۔

جلد ہی جنگ چھڑ گئی اور اسے نازیوں کے ساتھ تجارت کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت جرمنی تیل برآمد کرتا تھا اور یہ سوچنا ہی بیکار تھا کہ اتحادی کبھی بمباری کر کے مادی طور پر اسکی سپلائی پر اس طرح اثر ڈال سکیں گے۔ لہٰذا ایرکسن نے جرمن تاجروں کے ساتھ چاروں طرف سے کھیلنا شروع کر دیا۔ اس نے اسٹاک ہام میں جرمن چیمبر آف کامرس میں شمولیت اختیار کر لی۔ وہ اپنے بیشتر دوستوں سے کٹ کر رہ گیا، لیکن سویڈن کے بادشاہ کے بھتیجے پرنس کارل برناڈوٹ (PRINCE CARL BERNADOTTE) کے ساتھ اس نے اپنے تعلقات استوار رکھے۔ پرنس کبھی نازیوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

ایرکسن واقف تھا کہ گسٹاپو چیف ہینرخ ہملر (HEINRICH HIMMLER) ہی دراصل تیل کے تجارتی امور سے متعلق آخری فیصلہ سنائے گا۔ لہٰذا امید جس کے سہارے ایرکسن نے اپنا اصل کام انجام دیا، وہ ہر فنکے (HERR FINKE) تھا۔ سویڈن میں ہملر کا سربراہ نمائندہ اور ایک کٹر نازی شاہی خاندان کے افراد میں مل بیٹھنے کی لالچی خواہش فنکے کی دکھتی رگ تھی۔ پرنس کارل نے رابطہ قائم کرنے کے سلسلے میں مدد بہم پہنچائی اور ایرکسن نے زمین ہموار کی۔ جلد ہی وہ سویڈن میں اپنی قیام گاہ پر ہر فنکے کی میزبانی کا فرض انجام دے رہا تھا۔

دوسری امیدیں بہرحال نہیں بندھیں ——— خاص کر ہر لوڈوِک (Herr Ludwig) جرمن سفارت خانے کا کمرشیل اتاچی۔ وہ ایرکسن کو قطعی ناپسند کرتا تھا۔ لیکن باوجود لوڈوِک کی ناراضامندی کے ایرکسن کو ۱۹۴۱ء کے موسمِ بہار میں جرمنی میں داخلے کا اجازت نامہ مل گیا، معہ ان تعارفی خطوط کے جو اسے فنکے اور دیگر اشخاص سے ملے تھے۔

اسٹاک ہام سے باہر بروما فیلڈ کے مقام پر برلن جانے والے طیارے کو روک لیا گیا، جبکہ سویڈن کی پولیس نے ایرکسن کو طیارے سے اتر جانے کا حکم دیا۔ وہاں ان لوگوں نے اسکی اور اس کے سامان کی بڑی بڑی طرح اور ہر ممکن تلاشی لی لیکن کوئی بھی مشکوک چیز نہ پائی گئی اور اسے آگے سفر کرنے کی اجازت مل گئی۔

دوسری صبح برلن میں ایک آفیشیل کار اسے گسٹاپو کے

ہیڈکوارٹرز لے گئی۔ وہاں اس کی ملاقات دو آدمیوں سے ہوئی جو اس کے ساتھ طیارے میں موجود تھے ——— گسٹاپو ایجنٹس۔ وہ متفق تھے کہ بروما والے واقعے میں اتحادی سائنسدانوں کا ہاتھ تھا۔

ایرکسن نے خاص کر ہمبرگ میں جرمن تیل کے تاجروں سے بنا رابطہ بڑھایا۔ اس نے وہاں کی ریفائنریوں کا دورہ کیا منیجروں سے بات چیت کی اور کنٹریکیٹ جو کہ وہ حاصل کرنا چاہتا تھا اُن کی شرائط اپر بحثیں کیں۔ اس نے تیل کے تاجروں کی بھیڑ میں کسی کے لئے چاروں طرف نظریں دوڑائیں جس سے وہ واقف تھا۔ اوّلاً اسے کیپٹن فون ووش (COPTAIN VON WUSCH) ملا۔ ایک بُرا ناعیر اہم شخص جس نے اپنی تعلیم کا ایک مختصر حصہ انگلستان میں بھی حاصل کیا تھا اور کبھی شیل آئل کمپنی کا شریک کار بھی رہ چکا تھا چونکہ ایرکسن اپنے کاروبار کو راز میں رکھنا چاہتا تھا اس لئے فون ووش کے ساتھ اس نے بڑی رازدارانہ باتیں کیں۔ ایک روز ایرکسن نے فون ووش کو ایک خفیہ دستاویز دی جس نے اسے ٹین کے ایک بکس میں رکھا اور اپنے مکان کے پیچھے صحن میں دفن کر دیا۔ دوسرا رابطہ ہر فون اسٹورکر (HERR VON STURKER) سے تھا۔ تیل کا ایک ذخیرہ اندوز جس کا تعلق ہمبرگ کے ایک قدیم خاندان سے تھا۔ فون اسٹورکر کو بھی ایک کاغذ موصول ہوا۔ ایرکسن نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ دونوں میں سے کوئی ایک بھی اسے دوسرے کے ساتھ دیکھ نہ سکے۔

ایرکسن کے واپس سویڈن پہنچنے کے فوراً بعد ہی جرمن تیل کی پہلی کھیپیں شروع ہو گئیں، اور یہ اسی زمانے کی بات ہے جبکہ اتحادیوں نے اُسے بلیک لسٹ پر چڑھایا تھا۔ اسکے پُرانے دوستوں سے اس کی علیٰحدگی مکمل ہو گئی۔ ان میں سے کچھ تو فوراً اُٹھ کھڑے ہوتے اور ریستوران سے باہر نکل گئے۔ اگر وہ اس میں داخل ہوتا۔ اس کی سویڈش بیوی بڑی دشواریوں میں گھر گئی تھی۔



ایرکسن کی بیوی مہمانوں کی خاطر کرتے ہوئے

وہ اب تک نازی مخالف تھی، تاہم اسے اپنے شوہر کے نئے دوستوں کی میزبانی کرنا پڑتی تھی۔

اگلے چند مہینوں میں جو گذر گئے ایرکسن نے جرمنی میں تیل کی دوسری کھیپیں روانہ کیں اور گسٹاپو میں اپنے دوستوں کو بدستور ہموار کرتا رہا۔ وہ ان کے گھروں میں مدعو کیا گیا اور اس نے اُنکی بیویوں کے لئے سویڈن سے مکھن اور چمڑے کے کوٹ اور دیگر تحائف لا کر دئے اور اس نے فون ووش اور فون اسٹورکر جیسے لوگوں سے بھی تعلقات بحال رکھے، گرچہ جرمنی سے تیل حاصل کرنا مشکل ہو گیا تھا کیونکہ اتحادی بمباریاں وہاں شدت اختیار کر گئی تھیں۔ ایک مرتبہ جبکہ وہ ایک بڑی ریفائنری (REFINERY) کا معائنہ کر چکا تھا تو منیجنگ ڈائرکٹر نے اُسے رات کے کھانے پر ٹھہر جانے کے لئے کہا۔ اس نے پس و پیش کیا لیکن انکار ممکن نہ تھا۔ کھانا ڈائرکٹر کے آفس میں سرو کیا گیا۔ آدھی رات کے قریب محفل برخاست ہوئی اور ٹھیک آدھی رات کے بعد ہی اتحادی بمبار وارد ہوئے تھے۔ کوئی بھی پلانٹ سالم نہیں بچا۔ اتحادیوں نے آن کی آن میں دشمن کے ساتھ ایرکسن کی تجارت کا خاتمہ کر دیا۔

جرمن تیل پر اتحادیوں کا حملہ وسیع حد تک متاثر کن ثابت

ہوا۔ تاہم ۱۹۴۴ء کے بعد کے زمانے میں انڈسٹری
کے ٹھوس طریقے پر تعمیر شدہ کچھ حصے اب تک کام کر رہے تھے۔
اتحادیوں کی توقعات کے خلاف تعمیر کا کام بڑی تیزی سے
انجام دیا گیا۔ مزید برآں بیشتر ریفائنریاں اس قدر پوشیدہ طریقے
پر تعمیر کی گئی تھیں کہ ان پر اب تک آنچ نہیں آئی تھی۔

۱۹۴۴ء کے موسم خزاں میں اتحادیوں کی جنگی کوششیں
رائن کی کلائمکس والی جنگ کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھیں۔
ایرکسن کو بڑی سرعت سے کام انجام دینا تھا اگرچہ زیادہ سے
زیادہ پیسے بہم پہنچانا چاہتا۔ مدت سے اس کی تمنا تھی کہ وہ جرمن
تیل کی صنعت کا ایک مکمل اور بھرپور دورہ کرے۔ اب اس کے
لئے موقع تھا۔ اس نے قیاس کر لیا تھا کہ یہ ان مرحلوں میں سے
ایک ہے جن میں ایک سیلزمین کو سب سے چوٹی کی شخصیت
تک رسائی کرنا پڑتی ہے، اس معاملے میں ہنرخ ہملر تک۔

ایرکسن نے شاندار طریقے پر ایک بڑا ہاتھ مارا۔ اس
نوعیت کا جسے کوئی بارسوخ سیلزمین ہی پسند کر سکتا تھا۔
اس نے سویڈن میں تیل کی ایک عظیم الشان مصنوعی ریفائنری
بنوانے کا قصد کیا۔ پچاس لاکھ ڈالر کی لاگت سے۔ اسے
جرمنی اور سویڈن دونوں کے مشترکہ سرمایہ سے مالی امداد
بہم پہنچائی جانے والی تھی۔

یہ منصوبہ جرمنوں کو دو وجوہات کی بنا پر اپنی طرف
متوجہ کرتا تھا۔ اوّل یہ جرمنی کے لئے ایک غیر جانبدار ملک
میں تیل کا ایک ذریعہ مہیا کرتا تھا جو کہ اتحادی بمباروں کی
پہنچ سے دور تھا۔ دوم جرمنی کی شکست کی صورت میں یہ
ایک غیر جانبدار ملک میں نازی فنڈ کے انصاب کا ایک طریقہ
پیش کرتا تھا۔

ایرکسن نے ایک پروسپکٹس تیار کیا اور اسے فنکے
کی خدمت میں حاضر کیا جو بڑا خوش ہوا۔ چوٹی کے نازیوں
نے اس سے اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ بس صرف ایک
مخالف آواز تھی ـــــ ہرلوڈوک کی۔ وہ ایک ہی بات پر
اڑا ہوا تھا کہ ہنرخ ایک جعلساز ہے۔ لوڈوک فاران آفس
کا ایک فرد تھا، ربنٹروپ کی مخالف جماعت (RIBBENTROP's
FACTION) کے افراد میں سے ایک۔ جوں جوں جنگ طول
پکڑتی گئی یہ جماعت گسٹاپو کے خلاف نبرد آزما ہوتی گئی
دوسرے الفاظ میں ہنرخ ہملر کے خلاف۔ حسب دستور جیت
ہملر ہی کی ہوتی اور اس معاملے میں لوڈوک کو مخالف قرار
دے دیا گیا۔ گسٹاپو کے لئے ایرکسن قابل قبول تھا، اور اسکے
لئے ہملر سے ملاقات کی راہ ہموار تھی۔

اکتوبر ۱۹۴۴ء کا زمانہ تھا۔ ایک بار پھر ایرکسن نے برومافیلڈ
سے ایک طیارہ لیا اور بحر بالٹک کے گدلے پانیوں اور شمالی
جرمن کی ناہموار سطحوں پر سے گذرتے ہوئے ٹیلھوف ہوائی اڈے
کی جانب پرواز کر گیا۔ اسے برلن کے اعلیٰ ترین ہوٹل میں آتش
کے لئے اپارٹمنٹ دیا گیا جسے اتحادی بم اب تک مسمار نہ کر سکے
تھے، اور صبح کے وقت ایک بڑی سی سیاہ کار مع اپنے
گسٹاپو کے محافظ کے اسے لینے کے لئے آگئی۔

ہملر کے ہیڈکوارٹرز میں گسٹاپو کے چیف نے پرجوش
طریقے پر اس کا خیر مقدم کیا۔ "ہم نے ہر فنکے کی معرفت آپ سے
منسوب بڑی عظیم باتیں سنی ہیں۔" وہ بڑی دیر تک تیل کی ریفائننگ
پلانٹ اور ایرکسن کیلئے جرمن منصوبوں کے عمل درآمد (OPERATION)
کو پہلی فرصت میں دیکھ ڈالنے کی ضرورت سے متعلق باتیں کرتے
رہے۔ اس کے بعد وہ دوسرے امور پر مباحثہ کرنے لگے۔

"کیا ہوگا" اچانک ہملر پوچھ بیٹھا "اگر دفاعی فوجیں
سویڈن پر حملہ آور ہو جائیں؟"

"سویڈن والے بےجگری سے مقابلہ کریں گے" ایرکسن
نے جواب دیا۔

اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ حملہ پر اثر انداز ہونا ہنسی کھیل نہیں۔ وہ اپنی جگہ صحیح تھا۔ انٹرویو کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُسے ایک معتبر سندی دستاویز پیش کی گئی جس کی رو سے اسے کہیں بھی آمد و رفت کی اجازت تھی اور تیل کی صنعت میں کسی بھی شے کے معائنے کی مکمل آزادی تھی۔ اسے ایک کار اور پٹرول کی ایک وافر مقدار پیش کی گئی۔

ایرکسن نے کولون سے لے کر پریگ تک مرکزی یورپ کا مکمل طواف کر لیا۔ اس نے لیوانا (LEUNA) انمنڈورف (ANNENDORF) ہیلے (HALLE) ——— تمام بڑے پلانٹ کا معائنہ کیا۔ اس نے ان کے منیجروں سے بات چیت کی، پتہ لگایا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیا کرنے کا ارادہ ہے بحیثیت ایک سیلزمین کے نئے علاقے کا طواف کرتے ہوئے اس نے وہاں کا مکمل نقشہ حاصل کر لیا۔

اور اسے لے کر واپس سویڈن پہنچ گیا۔

جب جنگ ختم ہو گئی تو اسٹاک ہام کے امریکی سفارت خانے نے "سرخ" ایرکسن کے اعلیٰ پیمانے پر ایک لنچ کا اہتمام کیا۔ اس کے تمام پُرانے ساتھی مدعو کئے گئے۔ اس کی صحت کے لئے پئے گئے بے شمار جاموں اور مبارک بادیوں کے ساتھ اسے اس کی دنیا میں صحیح مقام پر لا کھڑا کیا گیا۔

اور یہ بتایا کہ کس طرح اتحادی انٹیلیجنس کا ایک نمائندہ جنگ چھڑنے کے فوراً بعد ہی ایک مختصر عرصہ کے لئے اسکے پاس آیا تھا۔ کس طرح ایرکسن نے ایک خفیہ جاسوس (SPY) کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے پر آمادگی ظاہر کی تھی لیکن اپنی خدمات کے عوض کسی بھی قسم کا معاوضہ لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ کس طرح خود اُسی کے ایما پر اسے بلیک لسٹ پر چڑھایا گیا تھا۔ کس طرح پرنس کارل برناڈوٹ جسکے ساتھ مل کر اس نے کام کیا بھی بھی اتحادیوں کا ایک ایجنٹ تھا۔ کس طرح تیل جو اُسے جرمنی سے ارسال کیا جاتا تھا ویکیوم آئل (VACUUM) اور برٹش پٹرولیم (BRITISH PETROLEUM) میں تبدیل کر دیا جاتا تھا اور حقیقی معنوں میں جرمنوں ہی کے خلاف استعمال میں لایا جاتا تھا۔ کس طرح وہ فون وونش، فون اسٹوکر اور اپنے دیگر رابطے قائم کرنے والوں کو بجیثیت خفیہ اتحادی معاونین ان کی خدمات کے حوالے سے دستخط شدہ خطوط دیا کرتا تھا تاکہ فتح حاصل ہو جانے کے بعد مصرف میں لائے جائیں۔ کس طرح ایسا ہر کاغذ اس کے سر پر لٹکی ہوئی دوسری تلوار تھی، اس طرح کہ وہ جرمنی میں مشکل ہی سے سو سکتا تھا، تمام راتیں محتاطانہ دستک کے لئے انتظار کرتے ہوئے گذرتی تھیں تھا کہ شاید ورموت اور کسی بھی ایسی دستک جس کا مطلب اس کی اطلاعات ——— اور اس کے فرض کی پرخطر راہ میں گامزن دوسروں کی اطلاعات بھی ——— مُفید ثابت ہوئیں۔ ان مہینوں میں دریائے رائن کی لڑائی سے قبل جرمن

تیل کے خلاف حملے اپنے کلائمکس پر تھے۔ ہمارے پائلٹ بڑی چھوٹی تمام ریفائنریوں کے صحیح محل وتوع سے واقف تھے کسی دن جب کوئی نیا پلانٹ مکمل ہو جاتا وہ اسے نقشے پر آتار لیتے اور اس کی طرف براہ راست پرواز کر سکتے تھے۔ پروا نہیں اسے کتنی ہی کڑی نگرانی میں رکھا گیا ہو۔ وہ فوجیوں کی خفیہ نقل وحرکت، طیارہ شکن توپوں کے انصاب اور دھوئیں کی چادر مسلط کئے جانے والے مقام کے محل وتوع سے بھی واقف تھے کسی ریفائنری کو نقصان پہنچانے کے بعد وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اسے مرمت کروانے میں کتنا وقت صرف ہوگا۔ اور اس دن جبکہ یہ طے پاتا کہ یہ پیداوار مہیا کرے گی، وہ دوبارہ واپس پہنچ جاتے۔

ورماخت (دفاعی فوجوں) اور لفتوافے (ہوائی فوجوں) کو تیل کی سپلائی بالکل قلیل مقدار میں ہونے لگی۔ جب ہم لوگوں کا آخری وسیع اچانک اور تابڑ توڑ حملہ شروع ہوا تو جرمن ٹینک بے یارومددگار جو اسے پناہ میں لئے ہوئے تھے میدانوں میں پڑے رہ گئے اور بیشتر جرمن طیارے تو پٹرول کی کمی کے باعث زمین پر آتار لئے گئے۔

ایرکسن کے دعوے پر اتحادیوں نے فون ونش فون اسٹوکر اور دوسروں کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا۔ ہرلوڈوک بہرحال ایک قیدی ہیں۔ مہینوں ادھر اُدھر شکلیں چھپائے پھرنے کے بعد آخر کار ہرننکے کبھی ڈنمارک میں ایک نقلی نام کے ساتھ گرفتار کر ہی لیا گیا۔

اور اب میلز مین ایرکسن پھر سے خوشی خوشی اپنی اسی پرانی محبت کی طرف لوٹ چکا ہے ——— یعنی تیل کی تجارت کی طرف۔ طہران سے لندن کے درمیان تیل کے تاجروں کی بھیڑ میں مدغم ہو کر۔



روسی جاسوس کا یہ کارنامہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا

شاہد قمر آفریدی



دنیا کے تین بڑے سربراہوں، فرینکلن، چرچل، اسٹالن کی زندگی ۱۹۴۳ء کے دوران تہران میں ہونے والی کانفرنس میں موت سے ہمکنار تھی۔ یہ ایک ایسی نازی سازش تھی کہ جس سے فرار ناممکن تھا مگر ایک روسی ایجنٹ نے بڑی خوبصورتی سے اپنے آپ کو نازی ایجنٹ کے روپ میں ظاہر ہو کر ان عظیم شخصیتوں کو موت کی آغوش سے نجات دلا دی۔

روسی محکمۂ جاسوسی کے کارندے نہایت چوکس اور ہوشیار رہتے تھے اور انھوں نے اس ہوائی جہاز کو ہی جو نہایت خفیہ طور سے پرواز کر رہا تھا اور جس میں وہ جرمن بھی موجود تھے جن کے ذمہ ان تین اہم شخصیتوں کا خاتمہ کرنا تھا۔ راستہ میں کردستان نامی جگہ پر اپنی مارٹر توپوں اور مشین گنوں کی بوچھار سے گرا دیا۔ اور اس طرح انھوں نے کانفرنس کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ ان کا یہ کارنامہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس نازی سازش کو ناکام اور ناکارہ بنانے کا سہرا روسی جاسوس سوتیلوف کے سر ہے، جو بچپن سے ہی خداداد صلاحیتوں کا مالک تھا اور بے حد ذہین بھی تھا۔ اسے کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا خاص طور سے وہ جرمن زبان نہایت روانی سے بولتا تھا۔ اس نے ۱۹۳۰ء میں وہ خفیہ ٹریننگ جس میں اپنے ملک کے کوڈ اشارے اور مختلف ایسی چیزیں جو بے حد خفیہ اور اہم ہوتی ہیں حاصل کیں، ٹریننگ


چرچل


اسٹالن


روزویلٹ

کے دوران اس کی ملاقات ایک ایسے شخص والٹر سے ہوئی جس کا خبطی چچا اسے جرمنی زبردستی بھیجنا چاہتا تھا مگر اس نے وہاں جانے سے صرف اس لئے انکار کر دیا کہ اس کی سگائی ایک روسی حسینہ سے ہوئی تھی، والٹر اس روسی دوشیزہ کے پیچھے اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار تھا کیونکہ اس کی ادائیں بے حد قاتلانہ تھیں۔

اور جب روسی جاسوس سوتیلوف نے اس واقعہ کا اپنے کیمپ میں شراب کے دوران حکام اعلیٰ سے تذکرہ کیا تو انھوں نے نہایت رازداری برتتے ہوئے والٹر کے بجائے ذہین سوتیلوف کو اپنے مشن کے لئے جرمنی روانہ کر دیا۔

سوتیلوف اپنی بے پناہ قدرتی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوتے وہاں کے ماحول میں رچ بس گیا اور ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے کسی نہ کسی طرح اس جاسوسی اڈہ میں ایک ہمدرد اور وطن پرست رکن کی حیثیت سے شامل ہو گیا۔ اسے اس کی اسی قابلیت، ذہانت اور محنت کی وجہ سے.... نہایت ذمہ داری کا کام سونپتے ہوئے ایران بھیجا گیا تاکہ وہاں سے وہ اتحادی فوجوں کی خفیہ حرکتوں کے بارے میں نہایت تفصیلی رپورٹ حاصل کر سکے۔

چیف ڈپٹی نازی سیکورٹی آفیسر نے جب سوتیلوف کا عمدہ کام اور قابل فخر کارناموں کا مطالعہ کیا تو اس کو فوراً تہران پلاٹ کا انچارج بنا دیا اس عہدہ کے لئے کسی مخصوص شخص کی ہی ضرورت تھی۔

سوتیلوف خفیہ مخصوص ٹرانسمیٹروں کے ذریعہ یہاں کے قیمتی راز ماسکو روانہ کرتا رہا۔ اور سوتیلوف نے یہاں کے تمام خفیہ راز اور کئی ایسی تجویزیں جن کی کانوں کان کسی کو خبر بھی نہ تھی اپنے ملک کے محکمۂ جاسوسی کو روانہ کر دیں اور وہاں کے شاطر جاسوسوں نے خود بخود اپنے طور سے اس کی بھیجی ہوئی خفیہ تجویزوں کی حقیقت بھی تلاش کر لی۔

اسی دوران سوتیلوف ایک سوئس بیوپاری کے بھیس میں تہران گیا۔ وہاں سوتیلوف کو اپنے ایک دوسرے ساتھی ستمیرلوف کی زبانی گلوشک جرمن جاسوس کا پتہ چلا جو بیحد عیار اور چالاک قاتل تھا اور جس نے یہ قتل کا منصوبہ اپنے ساتھیوں کے ذریعہ بنایا تھا۔ وہ ایک ایسے مضافاتی ایرانی

ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا جہاں اس کا اور اس کے ساتھیوں کا پتہ لگانا بے حد دشوار کام تھا۔

سوتیلوف نے ان قاتلوں پر کڑی نگرانی اپنے آدمیوں کے ذریعہ شروع کر دی تاکہ اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی ان کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ وہ نازی بھیس میں ہی کردستان گیا۔ اس نے اس علاقہ کا بخوبی جائزہ لیا جہاں قاتلوں کو پیراشوٹ کے ذریعہ اترنا تھا۔

یہاں سے ہی اس نے برلن وائرلیس کے ذریعہ اس بات کا پتہ لگایا کہ کس روز اور کس وقت یہ درندہ صفت قاتل حرکت میں آئیں گے۔

اور پھر اس نے فوراً ہی تہران واپس ہو کر کانفرنس کے ذمہ داران، جنرل واسلی، کرنل نکولائی کو بتایا کہ آئندہ کیا حالات پیش آنے والے ہیں۔

ان لوگوں نے نہایت غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ نازیوں کا پیراشوٹ سے اترنا یقیناً خطرہ کی بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پیراشوٹ سے اترتے ہی کردستان کے باغی لوگوں میں گھل مل جائیں جو اور بھی ..... خطرناک بات ہو سکتی ہے۔

سویت لوف نازی لباس میں



جال کی طرح پھیلا دیئے اور جب مقررہ وقت پر جوں ہی قاتلوں کا جہاز، روسی، ترکی سرحد پار کر کے ایران کے علاقہ میں داخل ہوا تو یکایک عقاب کی مانند تین جہازوں نے مختلف سمتوں سے آکر اس جہاز کو اپنے نرغہ میں لے لیا جس میں قاتل گروہ سوار تھا۔

لیکن نازی ہوائی جہاز کے نڈر قاتلوں نے ان کی اس وارننگ پر ذرا بھی توجہ نہ دی۔

چند لمحہ بعد جہاز نیچے گرا لیا گیا۔ جہاز میں آگ لگ گئی اور وہ مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ وہ قاتل جو دنیا کے بہترین دماغوں کو کانفرنس کی شمولیت سے پہلے ہی ختم کر دینا چاہتے تھے، خود ہی شکار بن گئے۔ اس عظیم کارنامہ کا سہرا روسی محکمۂ جاسوسی کے ایجنٹ سوتیلوف کے سر ہے جس نے تین قیمتی اور بیش بہا جانیں اپنی جان پر کھیل کر بچالی تھیں۔

اور جب اس تباہ شدہ جہاز کی تلاشی لی گئی تو ایک عجیب وغریب ساخت کا ایک طاقتور مارٹر ملا جس میں بھاری وزنی گرینڈ پھینکنے کا بہترین نظام تھا۔ وقت سے پہلے ہی سازش ظاہر ہوگئی ورنہ وہ خفیہ عمارت جہاں یہ تینوں بہترین دماغ، فرینکلن، اسٹالن اور چرچل موجود تھے، ایک مقبرہ بن جاتی۔

مگر یہ تینوں سربراہ جو جنگ کے خلاف امن کے لئے لڑ رہے تھے، کیسے فنا ہو جاتے؟ امن کے پیمبر کی ہمیشہ خدا حفاظت کرتا ہے۔

یہ کانفرنس نہایت کامیابی کے ساتھ بغیر کسی حادثہ کے ختم ہوگئی۔ اور سوتیلوف کو وہاں کے عوام نے قومی ہیرو کا خطاب دے دیا۔





سوتیلوف نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس سازش کو ناکام بنا دیا اور اسے قومی ہیرو کے خطاب سے نواز دیا گیا۔

آپسی مشوروں کے بعد یہ طے ہوا کہ جب قاتل جہاز میں سوار ہو کر کردستان کی جانب پرواز کر رہے ہوں تو روسی ہوائی جہاز ان کی اڑان کو روکیں اور نیچے زمین کی طرف اترنے کے لئے مجبور کریں۔

اگر نازی جہاز اس بات پر عمل نہ کرنے پر قطعی آمادہ ہوں تو ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو دشمن کے ساتھ ایسے موقعوں پر کیا جاتا ہے یعنی اس جہاز کو کسی بھی حالت میں تباہ کر دیا جائے۔

سوتیلوف نے چہار طرف اپنے روسی نڈر جاسوس

اور وہ خاموش رہا

مصنف :- گیونالڈر

تلخیص :- دیوان تاراچند

نازی فوجوں نے جس تیز رفتاری سے دوسری عالمگیر جنگ میں یورپ کے بیشتر ممالک پر قبضہ کرلیا تھا تو ایک بار اتحادیوں کے دل میں خوف وہراس نے اس قدر جگہ بنالی تھی وہ سوچ نہ سکے کہ اس اژدھا پر کس طرح قابو پایا جائے۔ مگر جس ہمت ہوشمندی اور دل گردے سے انہوں نے جرمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، وہ تاریخ کا ایک سنہری باب ہے آنے والی نسلیں اس پر جتنا بھی ناز کریں گی وہ کم ہوگا۔ مگر اس جنگ میں کئی ایسے نڈر بے باک اور دلیر اشخاص نے حصہ لیا جس کا کہیں ذکر نہیں ملتا کیونکہ وہ زمین دوز رہ کر نازیوں پر اتنی تباہیاں و بربادیاں نازل کرتے رہے جتنی شاید نازیوں کے ہوائی جہازوں اور دور مار توپوں نے نہ کی ہوں۔ وہ لوگ تھے تخریب کار اور شب خون مارنے والے۔ آدھی راتوں کو ریلوں اور سڑکوں کو تہ و بالا کرنے والے بہادروں کے نام جنہوں نے نازی فوجوں کی نیندیں حرام کردیں۔ پردہ راز میں رہیں گے کیونکہ وہ کسی فوج کے تنخواہ دار نہیں تھے۔ بلکہ سروں پر کفن باندھ کر قوم کو دشمنوں کے چنگل سے آزاد کرانے کی فکر میں تھے۔

اس کتاب کے مصنف نے ایک ایسے جانباز اور مرد مجاہد کی داستان بیان کی ہے جس کے پڑھنے سے قاری کے دل ودماغ پر کپکپی سی چھاجاتی ہے۔ اس نے اپنی زبان پر تالا لگا کر کئی سال تک انسانیت سوز ظلم وستم کو برداشت کرنا اپنی روزمرہ کی زندگی کا حصہ سمجھ لیا تھا۔ جرمنوں نے انتھک کوششیں کیں کہ وہ اپنی زبان سے شب خون مارنے والے فرانسیسیوں کی بابت کوئی راز اگلے۔ لیکن اس نے خاموشی ہی میں زندگی کی امان پائی۔ وہ تن تنہا۔ مصیبتوں اور صعوبتوں کو گلے لگاتا رہا۔ اکیلا پن، بھوک پیاس سردی اور برف وباراں اس کے مصمم ارادوں کے سامنے بچوں کے کھیل ثابت ہوئے۔ اس جانباز اور سرفروش سپاہی کا نام جارج ڈیوڈ تھا جسے برطانوی حکام نے چھ ماہ کی مسلسل اور جاں سوز تربیت دے کر چھاتے کے ذریعہ جرمن فوجوں کے پیچھے مقبوضہ فرانس میں رات کے اندھیروں میں کسی جگہ اتارا۔

جارج ڈیوڈ کا کام جرمن فوجوں کی نقل وحرکت، ان کے تیل کے ذخیروں، ان کے خفیہ ہوائی اڈوں اور اسلحہ خانوں کی موجودگی کا پورا پورا پتہ مقامی شب خون مارنے والوں کے ذریعہ لندن۔ پہونچانا تھا۔ تاکہ ان خبروں سے لیس ہوکر اتحادی بمباروں کے لیے سہولتیں پیدا ہوسکیں۔

ایک اندازے کے مطابق ڈیوڈ نے خاموش اور اپنی زبان پر قفل لگا کر جتنا نقصان جرمن فوجوں کو پہنچایا۔ غالباً میدان جنگ میں ہزاروں اتحادی فوجی بھی نہ پہنچا سکتے تھے۔

غرضیکہ جارج ڈیوڈ کی داستان دوسری عالمگیر جنگ کی کہانی ہے۔ جو قتل وخون اور طوفان سے لبریز ہے جس قوم میں جارج ڈیوڈ جیسے نڈر بے خوف اور جانباز افراد موجود ہوں وہ قوم ہر پریشانی دکھ اور تکلیف کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کر سکتی ہے۔

(مدیر)

۱۵ اگست ۱۹۴۶ء کا روز تھا یعنی ہندوستان کی آزادی ملنے سے ٹھیک ایک سال پہلے موریل ڈیوڈ کناڈا کے ایک غیر معروف ریلوے اسٹیشن پر کھڑی اس گاڑی کا انتظار کر رہی تھی جس میں اس کا شوہر جارج ڈیوڈ دوسری عالمگیر جنگ ختم ہونے پر اپنے وطن لوٹ رہا تھا کہ اتنے میں پلیٹ فارم کی طرف گاڑی آتے دیکھ کر واپس لوٹنے والے سپاہیوں کے لواحقین اور دوستوں نے شور مچایا کہ ان کے پیاروں کو واپس لانے والی گاڑی آگئی ہے۔

موریل ایک بنچ پر بیٹھی ماضی کے دھندلے دنوں کی یاد

میں محو تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس کا سہاگ کس حالت میں واپس لوٹ رہا ہوگا، جنگ میں اس کو کوئی چوٹ نہ لگی ہو. اس نے اس کے انتظار میں کس طرح لمبا عرصہ گزارا تھا، یہ بات صرف اس کے دل کو ہی معلوم تھی جب پوری دنیا جنگ کی لپیٹ میں آگئی تو موریل کے فکر وانتظار نے اس قدر طول پکڑا کہ وہ پاگل سی ہو اٹھی. اگرچہ اُسے باقاعدگی سے حکومت کی طرف سے جارج کی صحت کے بابت خطوط ملتے رہے۔

جونہی ریل گاڑی پلیٹ فارم کے اندر داخل ہوئی سپاہیوں نے گاڑی کی کھڑکی سے گردنیں باہر نکالیں تاکہ وہ اپنے ملنے والوں کو پہچان سکیں کہ وہ لوگ کہاں کھڑے ہیں. گاڑی کے رکتے ہی موریل کی اضطرابی بڑھ گئی کیونکہ ابھی تک اسے ڈیوڈ نظر نہ آیا تھا کہ اتنے میں اس کے کانوں میں آواز پڑی۔

موریل :۔ اس کے کانوں میں آواز پڑی. اس کے سامنے اس کا سہاگ کھڑا ہوا تھا. جس کے کندھوں پر فلائٹ لیفٹیننٹ کے عہدے کے نشانات تھے. موریل ایک دم اس کے ساتھ چمٹ گئی پلیٹ فارم پر اس قدر شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی میاں بیوی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹیکسی سٹینڈ کی طرف چل دیئے کہ موریل نے پوچھا۔

"راجہ جی! جب تم محاذ پر روانہ ہوئے تھے تو تمہارے سر کے بال بھورے تھے لیکن آج دودھ کی مانند سفید کیوں نظر آرہے ہیں۔"

"میری جان یہ عمر کا تقاضا ہے جب میں یہاں سے گیا تھا تو میری عمر آج سے چھ سال کم تھی، کیا عمر بڑھنے سے انسان کے بالوں پر برف نمودار نہیں ہوتی؟"

"لیکن میری عمر بھی تو بڑھی ہے لیکن یہاں کسی سفیدی کا نام نہیں" موریل نے ٹیکسی بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنے گاؤں کی ہوا میسر رہی اور میں نے جنگ کی وجہ سے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے. اور پھر ....."

جارج نے موریل کے لبوں پر اپنے لب رکھ دیئے۔

ٹیکسی ان کے گھر کی طرف بھاگ رہی تھی وہ دونوں کسی اور ہی دنیا میں پہونچے ہوئے تھے. کہ اچانک موریل کا د جارج کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا. وہ ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہوگئی. جارج نے حیرانگی سے پوچھا۔

"موری کیا ہوا۔"

"جب تم یہاں سے گئے تھے تو تمہارے دائیں ہاتھ کی سب انگلیاں ثابت وسالم تھیں. آج ان میں ایک انگلی غائب ہے" "ارے تم انگلی کی بات کہہ رہی ہو. بات یوں ہوئی انگلینڈ میں ہم ایک بار فٹ بال کھیل رہے تھے کہ پاؤں پھسلنے سے میں کھیل کے میدان میں گر پڑا. میرے دوست مجھے اٹھانے کی غرض سے میری طرف بھاگے. کہ اچانک میرے ایک ہاتھ میں میرے ایک دوست کا وزنی بوٹ پڑ گیا میرا ہاتھ بری طرح کچلا گیا. آپریشن کے وقت ڈاکٹروں نے میری انگلی کاٹ دی۔

گھر جاکر موریل نے وقت ضائع کیے بغیر ناشتہ تیار کیا۔

جب دونوں کھانا کھانے میں محو تھے. تو موریل نے جارج کے چہرے پر اداسی رقص کرتے دیکھی موریل کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی. اور وہ سوچنے لگی کہ بجائے خوش وخرم ہونے کے اس کا خاوند گم سم کیوں ہے؟ آخر کار اس نے پوچھ ہی لیا۔

"کیا تمہیں کوئی اندرونی بیماری ہے جسے تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہو. ڈارلنگ ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ کیا ماجرا ہے"

"کچھ نہیں بس یونہی سوچ رہا تھا۔"

"کیا سوچ رہے تھے۔"

"کہ تم وہ نرس ہو جو تورنگنی کے ہسپتال میں میرے ساتھ بڑی رحمدلی کا برتاؤ کرتی تھیں۔

"اس کا نام تورنگنی تھا۔"

تورنگنی اس کا نام نہیں تھا. بلکہ تورنگنی فرانس میں ایک قصبے

کا نام ہے۔ جہاں میں حادثہ میں زخمی ہو کر داخل ہوا تھا۔

چائے کا گرم گرم پیالہ پیتے ہوئے اس نے موریل کو پچھلے چھ سال کی پوری داستان سنائی جو مصیبتوں اور صعوبتوں سے بھری ہوئی تھی۔

دوسری عالمگیر جنگ یورپ میں طول پکڑ چکی تھی اور چاروں طرف مہیب موت کے سائے چھا گئے۔ جارج ڈیوڈ کی عمر اس وقت پینتیس برس سے آگے نکل چکی تھی لیکن اس کی خواہش نے اُسے مجبور کیا۔ وہ بھی ہوائی جہاز چلانے کی تربیت حاصل کر کے نازیوں کے اسلحہ کے ذخیروں کو تباہ و برباد کر کے سکونِ قلب حاصل کرے اس پر مایوسیاں چھا گئیں جب رائل کینیڈی کے ہیڈ کوارٹرز سے اُسے اطلاع ملی کہ بوجہ زیادہ عمر اس قابل نہیں ہے کہ اُسے پائلٹ کی ٹریننگ دی جائے لیکن اگر اس کی خواہش ہے کہ وہ ہوائی جہاز چلانے کے بجائے دوسرے فوجی کاموں میں دلچسپی لے سکتا ہے تو اس کی عرضداشت پر نظرثانی ہو سکتی۔

اس نے ہاں میں جواب دے دیا۔

نفسیات کے ماہرین نے جارج کے دل و دماغ کا معائنہ کر کے رپورٹ دی کہ وہ ایسے کام میں نہایت کامیابی حاصل کر سکتا ہے جہاں بات چیت کرنا بہت کم ہو۔ لہٰذا چھ ماہ تک اُسے فوج کے مختلف شعبوں میں تربیت دی گئی۔ اگلے روز اُسے حکم ملا کہ وہ لندن جا کر مسٹر جونز سے ملے جو وزارت دفاع کی خفیہ برانچ میں کسی اہم کام پر تعینات ہے۔

مسٹر جونز ایک تجربہ کار آفیسر تھا اس نے اپنی جوانی کی عمر میں دنیا کے تقریباً تمام ممالک کی سیر کی تھی خاص کر وہ جرمنی کی دفاع کے معاملات میں ایک اہم شخصیت کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ وہ جارج سے تین تین گھنٹے روزانہ ملاقات کرنے کے چار روز بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ حکومت کو جس شخص کی ضرورت تھی وہ جارج ہے۔ جب اسے بتایا گیا کہ اُسے فرانس ہو جا کر، ریڈیو

ڈاکٹر ہیری کا طبی معائنہ کر رہا ہے

سے پیغامات ارسال اور وصول کرنا گولی چلانا۔ ریلوے لائن اور سڑکوں کو ڈائنامیٹ سے اڑانا ہوگا، تو وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر بولا۔

"حضور! اسی کام کو کرنے کے لیے میں مدت سے خواب دیکھ رہا تھا۔ آپ مجھے ان کاموں میں ضرور تربیت دیجیے۔ پھر دیکھیے میں کس جانفشانی سے اپنا کام کرتا ہوں۔"

لیکن جارج ان کاموں میں آرام بہت اور تکلیفیں بہت زیادہ ہیں۔ بلکہ موت ہمیشہ تمہاری ہمکنار رہے گی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے تم کب اس کی گود میں سو جاؤ۔"

موت کی گود میں سونے کے لیے تو حضور ہم سب پیدا ہی ہوئے ہیں۔ موت ابدی نیند کا دوسرا نام ہے اس لیے موت میرے

لیے ڈر کی شے نہیں ہے۔

جارج کا یہ بےباکانہ جواب سن کر مسٹر جونز مسکرا دیا۔

جب جارج نے اسلحہ کی تربیت میں اے گریڈ حاصل کرلیا تو اُسے شب خون مارنے کی ڈیڑھ ماہ کی ٹریننگ دی گئی۔ اس نے اس بات میں بھی دسترس حاصل کرلی کہ آواز پیدا کیے بغیر کس طرح دشمن کی شہ رگ پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

ایک دن ٹریننگ سینٹر کے سربراہ نے جارج کو بتایا کہ جلد ہی اُسے فرانس کے ایک قصبہ تورنگی کے قریب بذریعہ چھاتہ اتارا جائیگا۔ وہاں جاکر اس نے اپنے آپ کو پیری توشیطے ظاہر کرنا ہوگا۔ اس کی اطلاع کے لیے سربراہ نے جارج کو یہ بھی بتایا کہ پیری کی پیدائش ۱۰ اگست ۱۹۰۲ء کو ہوئی تھی۔ اس کے باپ کا نام مارسل اور ماں کا نام توشیطے تھا۔ وہ دونوں غیر شادی شدہ تھے لیکن وہ کئی برسوں تک ایک ہی مکان کے مکین بنے رہے۔

قانون کی نظر میں پیری ان کی ناجائز اولاد تھی لیکن تورنگی کے باشندوں نے کبھی اس بات کا برا نہیں مانا تھا کیونکہ دونوں ہی شریف النفس تھے وہ اکٹھے رہتے ہوئے لوگوں کے روزانہ جھمیلوں سے دور تھے کیونکہ اس کے والدین (؟) غریب تھے اس لیے پیری کی پرداخت اچھی طرح نہ ہوسکی وہ اوائل عمر ہی سے کم روذالوجود رہا۔
ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسی وقت سے تم اپنے آپ کو جارج ڈیوڈ کے بجائے پیری جانو۔ چونکہ پیری کے والدین (؟) الگ تھلگ رہتے تھے اس لیے گاؤں والوں کو کچھ پتہ نہیں کہ پیری کہاں رہتا تھا اور کیا کام کرتا تھا۔ اور کب گاؤں سے گیا اور کب گاؤں میں آیا۔ پیری کے ساتھ کسی شخص کو دلچسپی نہ تھی پیری کا فوٹو دیکھو ہوبہو تمہارے جیسا ہے۔ وہی ناک نقشہ، وہی ہونٹ۔ ویسے ہی کان۔

جارج سربراہ سے فوٹو لے کر اس کو غور سے دیکھنے لگا۔
وہ حیران و ششدر رہ گیا جب اس نے فوٹو میں خود کو کھڑے پایا
اب پروگرام کے مطابق جارج نے تورنگی اور اس کے ارد گرد کے دیہاتوں کے تلفظ سیکھنا شروع کر دیے۔ اور اپنے آپ کو پیری کے سانچے میں ڈھالنے کی خاطر ایک نیم پاگل شخص کے ساتھ بیٹھ کر روزانہ دو تین گھنٹے ضائع کرنا شروع کر دیے۔ ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ جارج کو یوں محسوس ہونے لگا کہ اس میں پاگل پن کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ اکثر اکیلے میں اپنی کنپٹیوں پر بار بار کھجلی کرنے لگا حتے کہ اس کو ایسا کرنے کی کوئی حاجت نہ تھی اُسے اس بات کی بھی تربیت دی گئی کہ وہ کھانا کھاتے وقت سالن اپنے کپڑوں پر ڈال لے بغیر کسی مطلب کے تیوریاں چڑھایا کرنا اور ہونٹوں کو اپنے دانتوں تلے دبایا کرے تاکہ دیکھنے والوں کو پتہ ہو کہ وہ نیم پاگل ہے۔ اس کے علاوہ اُسے ہدایات ملیں کہ کچھ عرصہ کے لیے ایک پیر میں بغیر ایڑھی کا جوتا پہنے تاکہ اُسے لنگڑا کر چلنے کی عادت پڑ جائے۔

وہ نفسیات کے ڈاکٹروں کی ہدایات پر عمل کرنے لگا۔
اس کی زبان میں خاطر خواہ لکنت پیدا ہو چکی تھی۔ وہ چلتا تو معلوم ہوتا گویا کسی حادثہ میں اس کی ٹانگ میں کوئی نقص پڑ گیا ہو۔ اُسے خوراک میں وہی اشیاء دی جاتیں جس کے تورنگی کے گرد و نواح کے لوگ عادی تھے۔

ایک دن جارج مکمل طور پر توشیطے بن گیا۔

چونکہ وہ ایسی جگہ اتارا جانے والا تھا جہاں چاروں طرف نازی فوجوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس لیے آنے والی تکلیفوں کے پیش نظر اس کو خالی پیٹ پیٹھ پر بھاری بوجھ وزن اٹھانے کی تربیت دی گئی اس سخت ٹریننگ کے دوران وہ بیچ بیچ گر گر کر بے ہوش ہو گیا لیکن اس کے حوصلے بلند سے بلند تر ہوتے گئے۔

اس کا اچانک امتحان لینے کی غرض سے ایک رات جب کہ وہ گہری نیند کے خراٹے لے رہا تھا کسی شخص نے اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے اور فرانسیسی زبان میں زوردار آواز میں پوچھا۔

"تم کون ہو؟ اور یہاں کیوں لیٹے ہو؟"

جارج نے تورنگی کے باشندوں کا تلفظ میں جواب دیا:

"میرا نام توشیطے ہے اور میں اپنے گھر میں لیٹا ہوا ہوں۔"

"تم کس جگہ پیدا ہوئے تھے؟"

سوال سن کر جارج نے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا لیا اور ناک سے نکلے ہوئے مواد کو ہاتھوں پر مل کر جواب دیا۔

"شیں رشنک۔ شنک۔ شناں۔" اور ہاتھوں کو یوں ہلانے لگا جیسے ریل گاڑی حرکت کر رہی ہو۔

"کیا بکواس لگا رکھی ہے ٹھیک ٹھیک جواب دو، ورنہ گولی سے مار دیے جاؤ گے۔"

اب جارج نے مکان کی چھت کی طرف دیکھ کر زور سے قہقہہ مارا اور کمرے سے باہر بھاگ گیا۔

اس کا امتحان لینے والے نفسیات کے ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے جارج کو اپنے پاس بلا کر کہا

"شاباش! پیری! تم اچانک ناگہانی امتحان میں پورے اترے، اب تمہیں کوئی شخص دھوکہ نہیں دے سکتا۔ آج شب کو پونے گیارہ بجے ہوائی جہاز تمہیں تمہارے نئے ٹھکانے پر پہنچا دے گا۔ بیوی کا خیال بھول جاؤ اس کی دیکھ بھال محکمے کے سپرد ہے۔ — جس سے تمہیں باقاعدہ ہدایتیں ملا کریں گی۔"

جب ہوائی جہاز جارج کو لے کر فرانس کی طرف پرواز کرنے لگا تو جہاز کے اندر لگے مائیکروفون میں اسے حکم ملا کہ وہ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد جہاز سے کود جائے کیونکہ اسے اتارنے کے بعد جہاز کو فوراً لوٹنا ہے۔"

جارج نے رسٹ واچ پر ٹکٹکی لگا دی تاکہ اسے کودنے میں کوتاہی نہ ہو۔ "چھلانگ لگاؤ" کا حکم سن کر جارج پیراشوٹ کے ذریعہ زمین کی طرف جانے لگا۔ زمین پر پہنچتے ہی اس کے پاؤں زمین پر دھنس گئے۔ تو اس کے کانوں میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو اس نے ائیرپورٹ پر کرنل مونز کے منہ سے نکلے تھے۔

"جب تم زمین پر اتر جاؤ تو پیراشوٹ کو بند کے دائیں ہاتھ کو گرجا گھر کے دامن میں جو گڑھا نظر آئے اس میں دبا دو۔" اس نے ان ہدایات پر فوراً عمل کیا۔ پھر گرجا گھر کی دیوار کے پاس کھڑے ہو کر اپنے پروردگار کے حضور میں سر جھکا دیا۔ پھر کمبل اوڑھ کر دیوار کے دیوار کے پاس ہی لیٹ رہا۔

مرغ نے جب اذان دی تو وہ خواب غفلت میں مدہوش تھا۔ صبح چھ بجے ٹھیک اس کی آنکھ کھل گئی تو بائیں بازو کو اسے چند مکان نظر آئے۔ جہاں مرغیاں دانہ چگ رہی تھیں۔ ایک بار پھر اس کے کانوں میں وہی الفاظ سنائی دیے۔ جو کرنل بیکر نے جارج کے مشن پر روانہ ہونے پر کہے تھے۔

"کسان کی بیوی جس کا نام طلطلی ہے۔ وہ ٹھیک چھ بجے مرغیوں کو دانہ ڈالے گی۔ اسے دیکھ کر تم اپنی جگہ سے مت ہلنا جب تک وہ گانا نہ گائے۔"

ابھی وہ بتائے ہوئے الفاظ کو ذہن سے کرید رہا تھا کہ اسے طلطلی گاتی ہوئی سنائی دی۔ جارج نے وقت ضائع کیے بغیر تین الفاظ اپنی زبان سے نکالے۔

"دروازہ بند کر دو۔"

طلطلی نے اس کی طرف دیکھا اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ گھر پہنچ کر طلطلی نے ایک پرانے صندوق سے راشن کارڈ نکال کر جارج کو دیتے ہوئے کہا۔

"پیری راشن کارڈ اور شناختی کارڈ کو سنبھال کر رکھنا۔ کیونکہ ان کے کھو جانے سے تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ تم بڑے لاپرواہ ہو۔ اپنی چیزوں کو سنبھالتے نہیں ہو۔ میرے ساتھ چلو میں تمہیں دکتاپ کے مالک کے پاس چھوڑ آتی ہوں تم اس کے ساتھ مل کر کام کرو گے۔ دیکھو کہیں کے میری بات پر دھیان دیتے ہو یا کنیزوں پر کھلی ہی کرتے رہو گے۔"

اس وقت پیری نچلا ہونٹ لٹکائے کنپٹیوں پر کھجلی کر رہا تھا۔ ورکشاپ کے مالک لیوتے نے جب پیری کو دیکھا تو وہ ہنس کر بولا۔

"میرے پرانے دوست طوشیطے کے بیٹے ادھر آؤ۔"

پیری کنپٹیوں پر بدستور کھجلی کرتا رہا۔

ورکشاپ کے دائیں طرف ایک کوٹھری تھی جو کافی عرصے سے غیر آباد پڑی تھی۔ لیوتے نے کوٹھری پر لگا ہوا تالا کھول کر کہا۔

"پیری یہ تمہاری رہائش گاہ ہے اسے جھاڑو سے صاف کر کے شب گزاری کرنا۔ بہت نفیس جگہ ہے۔ تمہیں یہاں گیدڑوں کی آوازیں کم سنائی دیں گی۔ ہاں میں تمہیں یہ بات بھی بتا دوں کہ تمہارے سب سے پرانے دوست جنگ پر گئے ہوئے ہیں گا ہم لوکس ہمارے گاؤں کا پادری ہے۔ گرجے میں جا کر اس سے ڈمیکاں مانگنا بھولنا نہیں۔ جب تم تورنگی سے چلے گئے تھے تو اس سے لوٹیاں مانگا کرتے تھے۔ وہ بے چارا تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔"

پیری نے لیوتے کی بات سن کر اپنا نچلا ہونٹ ڈھیلا چھوڑ کر منہ بنالیا۔

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ان کے سامنے ایک کار آکر رکی۔ اس میں جرمن خفیہ پولیس (گسٹاپو) کے کچھ آفیسر بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک آفیسر نے بلند آواز میں کہا۔

"کار میں دس لیٹر پیٹرول ڈالو۔"

پیری نے پیٹرول والی ٹنکی کھول کر پیٹرول والی ٹیوب ڈال دی تھوڑی دیر میں پیٹرول ٹنکی سے نکل کر ادھر ادھر پھیل گیا۔

"ارے گدھے تم کیا کر رہے ہو۔ تم مکینک ہو یا پاگل دیکھتے نہیں کہ پیٹرول ضائع ہو رہا ہے۔ ہینڈل کو گھما کر پیٹرول بند کرو۔"

"جنگ کی وجہ سے ہمارا پرانا نوکر کسی آفیسر کے ہاں خانساماں بھرتی ہو گیا۔ اس لیے اس گدھے کو کام پر لگا لیا ہے۔"

لیوتے نے یہ کہہ کر بات پیٹرول بند کر دیا۔

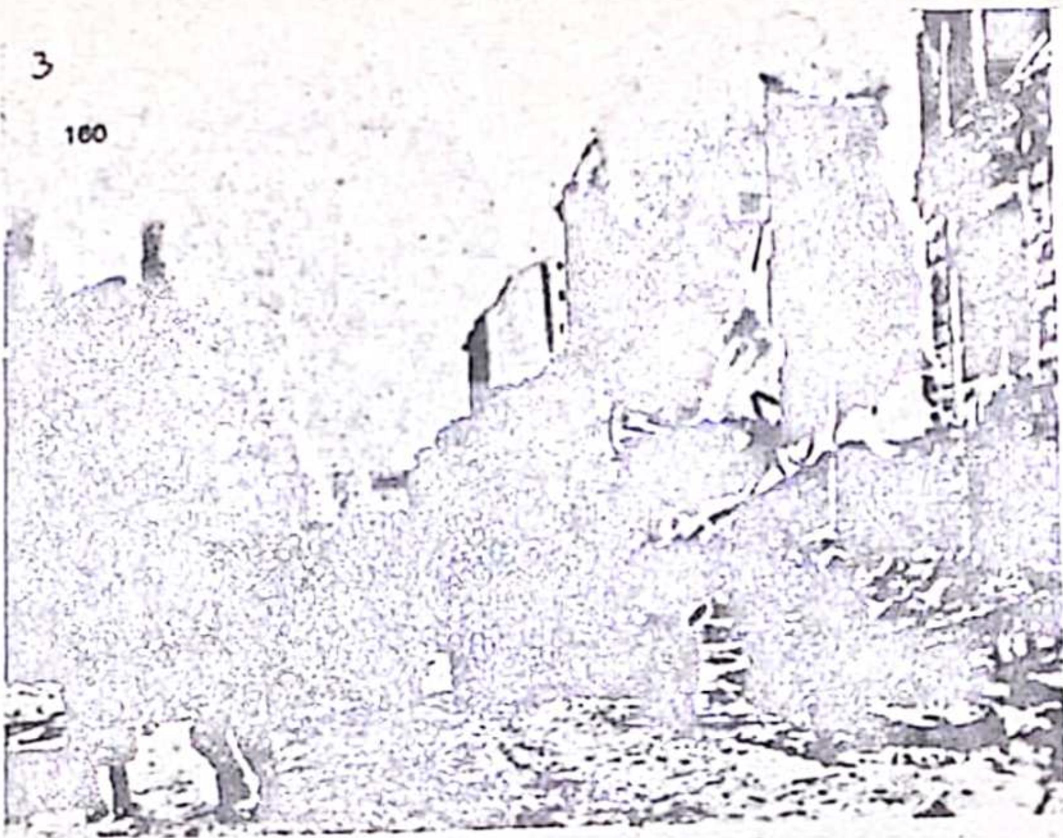
فوجی آفیسر کار کو اسٹارٹ کر کے آن واحد میں نظروں سے غائب ہو گئے۔ لیوتے نے پیری کو کامیاب اداکاری پر اُسے شاباش دی۔

اگلے روز گرجا گھر میں گاؤں کا ڈاکٹر ہنری سمتھ البرٹ طبلے، لوہار، بشون ریسٹورنٹ کا مالک یونس گرجے میں داخل ہوئے۔ تاکہ اتوار کی دعا خاطر خواہ حصہ لے سکیں۔ یہ سب لوگ نازی فوجیوں پر چھاپہ مارنے والے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جنھوں نے جرمن فوجیوں کے جہنم بپا کر رکھے تھے۔ وہ رات کے اندھیروں میں تیل کے ذخیروں میں ڈائنامیٹ لگا کر چھلاوے کی مانند غائب ہو جاتے۔ جرمن فوجیوں میں افراتفری مچ جاتی۔

گرجے کے پادری اور لیوتے کے سوا گاؤں میں کسی کو معلوم نہ تھا۔ کہ پیری تربیت یافتہ برطانوی جاسوس ہے اور وہ تورنگی کے علاقے میں اتحادی جاسوسیات کو مضبوط کرنے کے لیے وارد ہوا ہے۔ وہ تو اُسے فرانسیسی کمانڈو کا ہی آدمی سمجھتے تھے۔

کیونکہ پیری شب و روز اپنے لبوں پر قفل لگائے رکھتا لہٰذا تین چار آدمیوں کے سوا گاؤں کے عام لوگ اُسے فضول اور لغو گردانتے۔ لغو اس لیے کہ وہ اپنی ہتھیلی پر تھوک کر اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھپا لیتا

پیری کو تورنگی کے قصبے میں آئے ہوئے مشکل سے دو ہفتے کا عرصہ ہوا ہو گا۔ کہ اُسے وائرلیس کے ذریعہ برطانیہ سے پیغام موصول ہوا۔ اگلے تین روز میں پرانے قبرستان کے قریب چھاتوں کے ذریعہ آتشیں مادہ کی پیٹیاں اور اسلحہ کافی مقدار میں اتارا جائے گا۔ پیری اور اس کے جانباز ساتھی فوراً ان اشیاء پر قابو پا کر گرجا گھر کے تہ خانے میں چھپا دیں۔ ورنہ اگر یہ سامان جرمنوں کے ہتھے چڑھ گیا تو تورنگی کے تمام باشندے جرمن گولیوں کا نشانہ بن کر بھون دیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ



جرمنوں کی تباہ کاریاں

وہ ایک اطلاع کے مطابق چار روز کے بعد دریائے تورنگی کے پل پر سے فوجیوں کا ایک کارواں گزرے گا۔ اس پل کو بارود سے اڑانا اتحادیوں کے لیے بہت اہم ہے۔

ان پیغامات کے وصول ہوتے ہی گاؤں کے قصاب نے پل کو بارود سے اڑانے کے لیے اپنی اور اپنی بیوی کی خدمات پیش کر دیں۔ ان خدمات کی تہ میں قصاب کے دل و جگر میں نفرت کا جذبہ موجزن تھا کیوں کہ جرمنوں نے اس کے دونوں بیٹوں کو گزشتہ پچھلے سال میں گولی سے اڑا دیا تھا۔

رات آدھی کے قریب بیت چکی تھی۔ پیری، قصاب اور اس کی بیوی نے بجلی کی لمبی تاریں اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیں۔ قصاب نے گوشت لادنے والے بڑے سے ٹوکرے میں بیٹریوں کی کھال کے نیچے چھپا دیا۔ پل کے اڑانے والے بارود کے گولوں کو تھیلے میں ڈال کر سائیکل کے کیریر پر رکھ لیا۔

تین میل کے فاصلے پر تورنگی دریا کے پل بنا ہوا تھا جن پر سے تین بجے کے قریب جرمن لاریوں نے گزرنا تھا۔ پل کے دونوں جانب جرمن فوجیوں کی ایک ایک چوکی تھی۔ شمالی چوکی سے ذرا ہٹ کر پیری نے قصاب اور اس کی بیوی سے پل اڑانے والے سامان کو لے کر پلاسٹک کے تھیلوں میں ڈالا۔ پھر انھیں اپنی پیٹھ پر لاد کر دریا میں اتر گیا۔

پانی بلا کا سرد تھا۔ جونہی پیری نے اس میں اپنے ہاتھ ہلانے شروع کیے اسے یوں محسوس ہونے لگا گویا اس کے ہاتھ اور پاؤں جھڑ گئے ہیں۔ لیکن اس کے ناقابلِ تسخیر ہونے والے ارادے مضبوط سے مضبوط تر ہو گئے، اور وہ آواز پیدا کیے بغیر آبی جانوروں کی مانند تیرتا ہوا اپنی منزل پر جا پہنچا۔ پل کے شہتیروں کے ساتھ اس نے چھ جگہ ڈائنامیٹ لگا دیا۔ اور اس کے ساتھ بجلی کے تاروں کو جوڑ کر وہ آہستہ آہستہ دریا میں تیرنے لگا۔ واپس آ کر اس نے سب تاروں کو بیٹریوں کے ساتھ منسلک کر دیا۔

یہ ڈائنامیٹ وقتی بموں کے طرز پر ساخت کیے گئے تھے۔

ابھی پو پھٹنے میں کچھ دیر ہو گی کہ پیری کو قصاب کی بیوی سے پتہ چلا کہ پل کا آدھا حصہ ڈائنامیٹ کی نذر ہو گیا اور جرمنوں کی کئی لاریاں دریا کی تہ میں اتر گئی ہیں۔

اگلے چار مہینوں میں پیری کے ارسال کردہ پیغامات

پر عمل کرتے ہوئے برطانوی ہوائی جہازوں نے جرمن ٹھکانوں پر خوب گولہ باری کی۔ اور کبھی کبھی مجاہدوں کے استعمال کے لیے پیراشوٹ کے ذریعہ گولہ بارود اسٹین گنیں اور خورد و نوش کا سامان بھی اتارتے۔

تورنگنی دریا کے پل کی تباہی کے ٹھیک چھ روز بعد قصاب کی بیوی کو گستاپو نے حراست میں لے لیا۔ اور اُسے مجبور کیا کہ وہ جامہ تلاشی دے۔ لیکن وہ نہ مانی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی جامہ تلاشی کوئی جرمن آفیسر ہی لے سکتا ہے۔ معمولی سپاہی۔ فوجی اسے اپنے کمانڈنگ آفیسر کے سامنے لے گئے۔ جرمن کرنل کی۔ آنکھوں سے قہر ٹپک رہا تھا۔ اس کے بازو لمبے تھے۔ اس نے خونخوار بھیڑیے کی مانند غرّا کر کہا۔

"تم تلاشی کیوں نہیں دیتیں"

"لیکن میرا قصور کیا ہے؟ جس کی وجہ سے میری جامہ تلاشی لی جا رہی ہے۔"

"ہمیں شک ہے کہ تمہارے پاس بے آواز کا پستول ہے"

"اگر یہ بات ہے تو تلاشی لے لو ...." کہہ کر قصاب کی بیوی نے فراک کے اندر ہاتھ ڈال کر ہینڈ گرینیڈ بم نکال کر کرنل پر دے مارا۔ دو سپاہی کرنل اور قصاب کی بیوی کے جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ادھر ادھر بکھر گیے۔

ہیری کو قصاب کی بیوی کی موت کا بہت دُکھ ہوا۔ کیونکہ وہ عورت شیروں جیسا دل رکھتی تھی۔ اور ہر خطرے کو لبیک کہنا اس کا ایمان تھا۔ اس کی ناگہانی موت کا بدلہ لینے کی خاطر ہیری نے دستی بموں کو پھلوں کے نیچے چھپا کر لوکردن کو نازی کرنل کے بنگلہ۔ نازی فوجیوں کے کلب اور ریلوے بکنگ کلرک کے کمرے میں جانبازوں کے ذریعہ پہونچا دیے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ بم پھٹتے گئے اور نازیوں کو موت کے گھاٹ اتارتے رہے۔

ہیری اور قصاب پل میں بارود لگانے کی فکر میں

اس قدر جرمن فوجیوں کی ہلاکت کے بعد مقامی گستاپو فوراً حرکت میں آ گئی۔ جرمن فوجیوں سے بھری ہوئی ٹرک تورنگنی کے بازار میں آ کر کھڑی ہو گئی تھیں جو شخص بھی نظر آیا اُسے اپنی حراست میں لے لیا ہیری کا بھی ان کا شکار بنے بنا نہ رہ سکا۔ جب ہیری ٹرک میں بیٹھا ہوا تھا۔ تو برطانوی کرنل کے سابقہ الفاظ اس کے کانوں میں رینگنے لگے۔



جب
پیری
دس
برس
کا
بچہ
تھا

"جب تک تم پیری کا کردار ادا کرتے رہو گے جرمن تمہارا کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر ایک بار بھی تمہارے ذہن میں آگیا کہ تم تو جارج ڈیوڈ ہو بھر...... دنیا کی کوئی عظیم طاقت بھی موت کے پنجے سے نجات نہیں دلوا سکتی۔

گاؤں کے گرفتار شدہ لوگوں کو سینٹ لو کے مویشیوں کے ہسپتال میں پہونچا دیا۔ اسی ہسپتال کے احاطہ میں مشتبہ لوگوں کو پھانسی دی جاتی تھی۔

جارج (پیری) زمین پر بیٹھا ہوا ماضی کے دھندلے واقعات پر نظر دوڑا رہا تھا۔ کہ اس کی بیوی موریل کو کیا معلوم کہ اس کا سہاگ زندگی اور موت کے درمیان کش مکش میں کھڑا ہے۔ وہ بیچاری تو یہی خیال کرتی ہوگی کہ جارج کسی جگہ فوجیوں کے گودام میں کام کر رہا ہوگا۔

جس کمرے میں پیری بند تھا اس کے نیچے بہت بڑے چولہے بنے ہوئے تھے جن میں آگ جلا کر جہنم کی حرارت پیدا کی

جاتی تھی. جب پیری اور اس کے ساتھیوں کو گرمی کی وجہ سے سانس لینا مشکل ہو گیا تو آگ ایک دم بجھا دی گئی! اس کے بعد سردی جلانے کا چکر چلا دیا گیا. قیدیوں کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی برف کے تودے پر بٹھا دیے گیے ہوں. یہی عمل چار پانچ روز تک ہوتا رہا سب قیدی حیران تھے کہ موت سنگی سے ان کا تعاقب کیوں کر رہی ہے. ایک دم ان پر جھپٹ کر انھیں زندگی سے نجات کیوں نہیں دلواتی. انھیں کالی روٹی کے چند ننھے منے ٹکڑوں اور پانی کے تین گھونٹوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا تھا. وہ موت سے ہمکنار ہونا چاہتے تھے لیکن وہ مجبور تھے.

چھٹے روز ایک جرمن سپاہی نے آکر پیری کو بازو سے پکڑا اور اسے دھکے دیتا ہوا ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا جہاں میز کے قریب گسٹاپو کا میجر کھڑا ہوا تھا. اس کے سامنے میز پر ایک فائل. ربڑ کا لمبا سا چابک اور بجلی کی چند تاریں پڑی تھیں. ان اشیا کو دیکھ کر ایک لمحے پیری کے جسم میں کپکپی چھا گئی لیکن ہمت کر کے ایک سٹول پر بیٹھ گیا.

اس شخص کا نام طوشیطے ہے.

"کیوں اوے گدھ کی اولاد کیا تم نے تورنگنی میں کسی برطانوی جاسوس کو گھومتے پھرتے دیکھا ہے؟

میجر کی بات سن کر اپنے کندھے سیدھے کیے اور ناک کا نکلا ہوا مواد ہاتھوں میں ملنے لگا. یہ دیکھ کر پاس کھڑے نازی سپاہی نے اس کے دائیں گال پر زور سے طمانچہ رسید کیا. تھپڑ کھاتے ہی پیری ایک دم فرش پر سیدھے منہ گر پڑا جس کی وجہ سے اس کی نکسیر پھوٹ پڑی. اور اس کا چہرہ لال ہو گیا.

"تورنگنی دریا پر واقع پل کو اڑانے والے کون کون اشخاص تھے. اور ان کا لیڈر کون تھا. اگر تم سب واقعات درست بتا دو گے تو تمہیں ہسپتال لے جا کر تمہارا علاج کر دایا جائے گا. اور خوراک



جب وہ پیٹرول پمپ پر ملازم تھا

بھی اچھی ملے گی.

"تیں. تیں." پیری نے بے تحاشہ ہنسنا شروع کر دیا. سارجنٹ کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی اس نے پیری کو زمین پر لٹا کر فوجی بوٹوں سے ٹھوکریں لگانا شروع کیں. ہر ٹھوکر سے وہ کتے کے پلے کی مانند بلبلا اٹھتا. جب جرمن پیری سے کچھ دریافت نہ کر سکا اس نے سارجنٹ کو حکم دیا کہ گدھے کو وہاں سے لے جائے. وہ اپنا وقت خراب کرنا نہیں چاہتا.

کمرے میں واپس آکر پیری نے اپنے گرد و نواح نظر دوڑائی

اس کا ... زخمی تھا۔ بھاری بوٹوں کی مار سے اس کی پیٹھ پر کئی جگہ سے کھال اتر چکی تھی، اور اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی بھی کاٹ لی گئی۔ ان تکلیفوں کو دینے کے باوجود جرمن اسے کسی بات کے لیے بھی مجرم نہ ٹھہرا سکے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کی روح کو تازگی ملی اگرچہ اس کے جسم کے جوڑ جوڑ میں درد سرایت کر گئی تھی۔

چند منٹوں میں اُسے نیند آ گئی۔

تیسرے دن جرمن فوجی اسے پہلے والے کمرے میں لے گئے اس دفعہ وہاں میز کے بجائے صرف ایک کرسی تھی جس میں چمڑے کے لمبے لمبے تسمے لگے ہوئے تھے۔ کرسی کو دیکھ کر بیری کو چند سیکنڈوں کے لیے سکون ملا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ کرسی ایسی ہے کہ جس پر بیٹھ کر ملزم ملک عدم روانہ ہو جاتا ہے اپنی اذیتوں کا خاتمہ نزدیک دیکھ کر وہ ایک بار پھر قہقہوں کی آوازیں نکالنے لگا۔

سارجنٹ نے آگے بڑھ کر بیری کو کرسی پر پھینک دیا۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں تسموں سے اس طرح جکڑ دیے کہ اس کے لیے حرکت کرنا مشکل تھا۔ پھر سارجنٹ چلا کر بولا۔

"گدھے اپنا منہ کھولو۔"

جب اس کے اپنا منہ کھول دیا تو سارجنٹ نے اپنا ایک بڑا سا چمٹا اس کے اندر ڈال دیا۔ جس کے سبب اس کے سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ آگے چل کر کیا ہوگا کہ اس کے کانوں میں سارجنٹ کی کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی

"اگر زندگی کی خیر چاہتے ہو تو جو میں پوچھتا ہوں اس کا سوال کا جواب کاغذ پر لکھتے جاؤ۔ جن لوگوں نے تورنگی کا پل تباہ کیا ہے ان کے نام کیا ہیں؟"

بیری بت بنا ہوا بیٹھا رہا۔

دو منٹ کے بعد سارجنٹ نے اُبلتا ہوا پانی بیری کے



بیری اور نورہ شادی کے بعد

منہ میں ڈال دیا حلق میں ابلتا ہوا پانی جاتے ہی "ہائے" کہی پھر اس کی گردن ایک طرف کو جھٹک گئی۔

سارجنٹ دوبارہ جھٹکے کے ساتھ بیری کی گردن سیدھی کرنا چاہی لیکن وہ کرسی پر لٹکتی رہی یہ دیکھ کر اس نے بیری کے جسم کو تسموں سے آزاد کر دیا اور دو سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ اسے اس کے کمرے میں چھوڑ آئے۔

پتہ نہیں کتنی دیر تک بے ہوش رہا۔ لیکن جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے جسم کو بند بند میں درد ہو رہا تھا۔ اور منہ کے اندر آبلے پڑ گئے تھے۔ ان تکلیفوں کے باوجود اس کا ذہن اور دل انتہائی خوش تھے۔ کہ دوسری بار اس نے دشمن کو شکست دی ہے۔ اور وہ اس کے پھندے سے نکل گیا۔

تین روز تک منہ کے چھالوں کی وجہ سے کچھ کھا پی نہ سکا نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے وہ اپنا بازو تک نہ ہلا سکتا تھا کہ جرمن فوجی اسے کمرے میں لے گئے۔ جہاں فوجی نے اسے کرسی پر تسموں سے باندھ دیا تھا اُسے کمرے میں لائے گئے ابھی چند سنٹ ہی گزرے ہوں گے کہ گسٹاپو کے آفیسر آدھمکے۔

اگر تم چاہتے ہو کہ آرام و چین سے اپنی زندگی بسر کرو۔ ہم تمہیں فوراً آزاد کر دیں گے۔ بشرطیکہ تم بھی ہمارے ساتھ تعاون کرو۔ ہاں بتاؤ۔ پل اڑانے میں کس کس شخص کا ہاتھ تھا۔

"تمہارا اور اس سارجنٹ کا جو مجھے اس کمرے میں لایا ہے" یہ کہہ کر وہ قیں قیں کرنے لگا۔

قیں قیں کی بے ہودہ آواز سُن کر سارجنٹ نے اسے زور سے دھکا دیا۔ بیری منہ کے بل گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ جب اُسے ہوش آیا۔ تو اس نے اپنے آپ کو اپنے کمرے میں پڑے پایا اس کی قمیض پر خون کی تہیں جمی ہوئی تھیں کئی دن تک وہ اسی کمرہ میں لیٹے رہا۔ اور دشمن کو زک پر زک دینے کے خیال اس کو مسرت کی منزلوں کی طرف لے گئے۔

نازیوں کی چیرہ دستی دن بدن بڑھ رہی تھی۔ لیکن ہر نئی مصیبت اس کے لیے نئی مسرت اور شادمانی کا پیغام لاتی اس جیپ میں اس کے ساتھی تخریب کاروں کی زندگیاں پنہاں تھیں۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے لبوں پر قفل لگائے رکھے گا۔ چاہے اُسے خود کتنی ہی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔

تیسرے روز نازی فوجی بیری کو سلوتر خانے میں لے گئے۔ وہاں پر ایک بڑی سی میز پڑی تھی۔ اس پر بھی تسمے لگے ہوئے تھے۔ غالباً جانوروں کو باندھ کر ان کے زندہ جسموں پر مختلف تجربات کیے جاتے ہونگے۔

دو فوجیوں نے بیری کو پکڑ کر اس میز پر اوندھے منہ لٹا دیا اور وقت ضائع کئے بغیر اسے تسموں سے جکڑ دیا۔

چند منٹوں کے بعد ایک نرس اینٹھا کرنے والی پچکاری لائی اور اگر بیری کا پاجامہ کمرے نیچے کی طرف سرکا دیا۔

سارجنٹ ہاتھ میں ہنٹر لیے کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر بیری کو اپنی موت ناچتی دکھائی دی۔ سارجنٹ نے کرخت آواز میں کہا۔

اس بار اگر تم اصلیت کو چھپاؤ گے تو تم مجھے ڈان ویلکم نہ کہنا" یہ کہہ کر اس نے زور سے ہنٹر اس کی پیٹھ پر مارا۔ ہنٹر کی مار بیری نے بڑے ضبط کے ساتھ سہہ لی۔ یہ دیکھ کر سارجنٹ کے غصے کا پارہ اور بڑھ گیا اس نے نرس کو پچکاری کا ایک سرا بیری کے جسم کے نازک حصے میں داخل کرنے کا حکم دیا۔

پچکاری میں اُبلتی ہوئی کوئی شے بھری ہوئی تھی۔ جس نے بیری کے جسم میں جاتے ہی تلملی مچا دی۔ وہ درد کے مارے تڑپ اُٹھا۔

سارجنٹ نے بیری کا کان پکڑ کر کہا۔ پُل کو تباہ کرنے میں کس کس شخص نے حصہ لیا تھا؟

وہ جواب کیا دیتا وہ تو درد کے مارے بے ہوش پڑا تھا تسموں سے آزاد کر کے فوجیوں نے بیری کو فرش پر ڈال دیا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے کارناموں کی فتح کو یاد کر کے مسکرا دیا۔ کہ اس نے اپنے لبوں پر قفل لگا کر دشمن کے ارادوں کو پائمال کر دیا۔ اس کے علاوہ اُسے اس بات پر ناز تھا۔ کہ مصیبتوں اور صعوبتوں کے باوجود اس نے اپنی مادری زبان کا ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہ نکالا۔ کیا اس نے دشمن کو شکست فاش نہیں دی۔

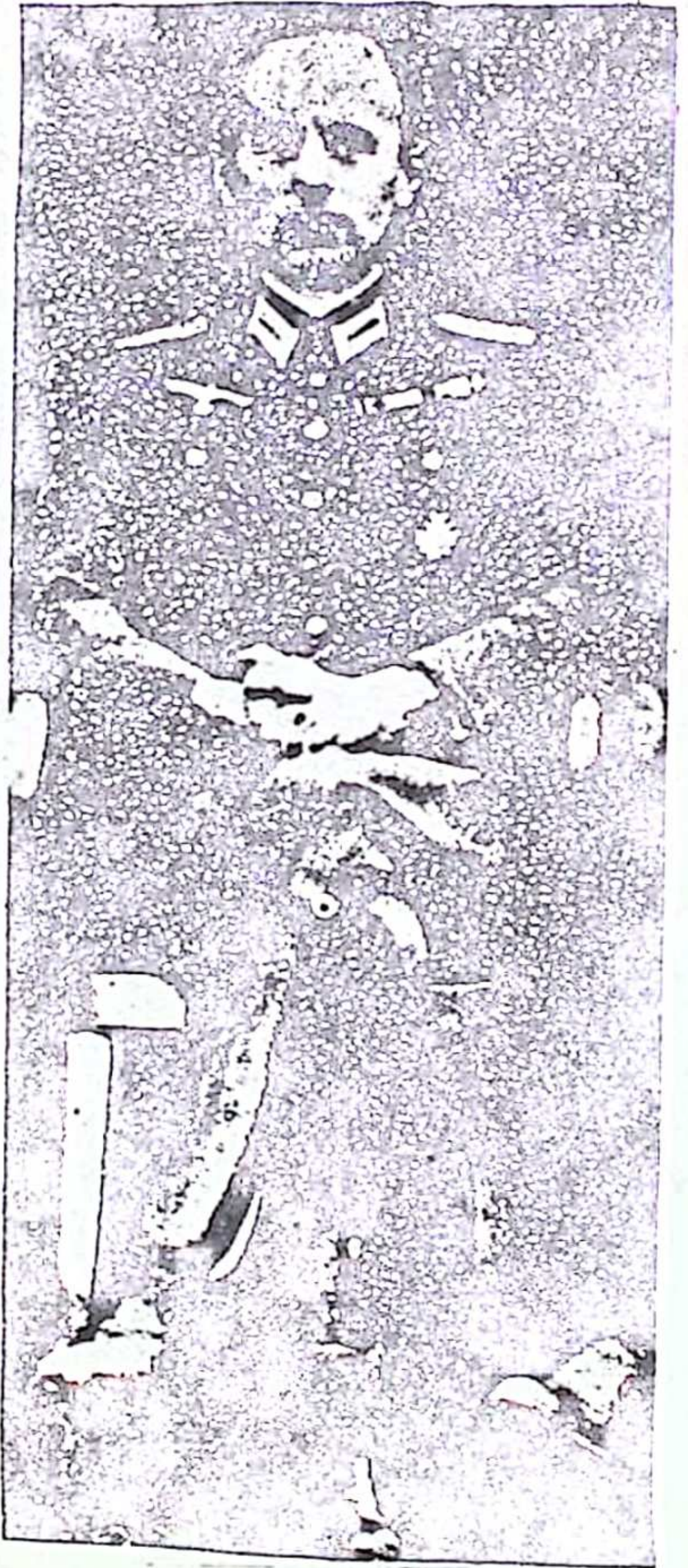
ایک بار وہ پھر مسکراتے ہوئے سو گیا۔

جب مُرغ نے اذان دی تو کوئی شخص اس پر جھکا ہوا

محراب سادودڈا تحریک دہلی فروری ۳، ۱۹۵۶ء

کہہ رہا تھا۔

"پیری! اٹھو! نازی فوجیں اس علاقے کو خالی کر کے



تورنگئی کا جرمن کمانڈنٹ

محراب اردو ڈائجسٹ دہلی فروری ۱۹۷۳ء

پسپا ہوگئی ہیں۔ اور اتحادی آگے بڑھ رہے ہیں۔ اٹھو اور میرے ساتھ اس جہنم سے نکلو۔"

یہ الفاظ سن کر پیری کے مردہ جسم میں نیا خون حرکت کرنے لگا۔ اس نے ہمت باندھ کر اجنبی کے پیچھے ہو لیا۔ سو گز کے فاصلے پر ایک پرانی عمارت پیری کو نظر آئی جس میں بجلی کی بتیاں جل رہی تھیں۔ دائیں ہاتھ کے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اجنبی نے کہا۔

"پیری طوشیطے اپنے غلیظ کپڑے اتار دو۔ چند منٹوں کے اندر اندر تمہارے نہانے کے لیے میں ابھی گرم پانی کی دو بالٹیاں بھجواتا ہوں۔"

کافی مدت کے بعد پیری نے غسل کیا تھا غسل کرنے کے بعد اس نے یوں محسوس کیا گویا وہ کسی نئی دنیا کا رہنے والا ہو۔ اسے نئے کپڑے دیکھ کر اجنبی بولا۔

"میرے دوست مبارک ہو۔ تورنگئی کے سب گرفتار شدہ باشندے رہا ہو گئے کیونکہ جرمنوں نے اتحادیوں کی پیش قدمی کی اطلاع پا کر اس گاؤں کو خیرباد کہہ دیا ہے۔"

شام کو تورنگئی کے سب باشندے گرجے میں جمع ہوئے اور مل کر خدا کا شکریہ ادا کیا جس کی مہربانی سے ان کا گاؤں نازیوں کے چنگل سے آزاد ہو گیا تھا۔

۱۹۴۳ء کی سردیاں شروع ہونے سے پہلے ہی برطانوی فضائیہ نے نازیوں کے ٹھکانوں پر اس قدر بم باری کی کہ چاروں طرف قیامت نظر آنے لگی۔ پادری نے پیری کو بتایا کہ اس کی کوششوں اور جانبازی کی وجہ سے اب تک بیسیوں اتحادی ہوا باز جرمنوں کے شکنجے سے بچ کر برطانیہ پہنچ چکے تھے۔ ریل اور سڑکوں کے بیشتر پل رسل و رسائل کے نا اہل ہو چکے تھے۔ اگرچہ جرمنوں نے بہتیرے جتن کیے کہ معلوم کر سکیں کہ ان شب خون مارنے والوں میں کون کون لوگ ہیں۔ لیکن تورنگئی کے بہادر باشندوں

نے دکھ اور تکلیف کے ہوتے ہوئے بھی اپنی اپنی زبانوں کو تالے لگا رکھے تھے. جرمنوں کا ہر ظلم ان کے ارادوں کو تقویت بخشتا تھا۔

جرمنوں کے پسپا ہونے کے بعد تورنگی کے باشندوں کی ہیئت ہی بدل گئی تھی. عورتیں اور دوشیزائیں دریائے تورنگی کے کنارے سیر کرتی ہوئی نظر آنے لگیں. بچوں نے بازار سے مختلف رنگوں کے پتنگ لے کر اڑانا شروع کر دیئے. وہاں کی سبزی منڈی میں آہستہ آہستہ رونق بڑھنے لگی. لوگوں کے چہروں پر تازگی نظر آنے لگی۔

ایک روز تورنگی کا پادری پیری کے پاس آیا اور کہنے لگا

"میرے عزیز دوست اب تم یہاں صرف تین گھنٹوں کے مہمان ہو. کیونکہ مجھے خفیہ ٹرانسمیٹر پر خبر ملی ہے کہ ٹھیک تین بجے دوپہر کو تم کو یہاں پر برطانیہ لے جانے کے لیے ہیلی کاپٹر گرجا گھر کے قریب اترے گا. تم نے یہاں آکر وہ کام سرانجام دیئے ہیں جن کو یہاں کے باشندے رہتی دنیا تک یاد رکھے گا۔"

تین بجے ٹھیک برطانیہ کا ہیلی کاپٹر زمین پر اترا اس کا پائلٹ پیری کے پاس آکر دھیمی آواز میں بولا.

"غالباً آپ جارج ہیں. میں آپ کو لندن لے جانے کے لیے آیا ہوں. چلئے ہم ابھی لندن کی جانب اڑیں گے۔"

اب پیری طوشیطے دوبارہ جارج ڈیوڈ بن گیا.

لندن پہنچ کر شاہی فضائیہ کی اسٹاف کار جارج کو افیسرز میس میں لے گئی. وہاں تین ڈاکٹروں نے اس کا خوب اچھی طرح طبی امتحان لیا. اس کے بعد اسے خواب آور گولیاں دیں. تاکہ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ انھیں استعمال کرے.

جب اس کی آنکھ کھلی تو آر. اے. ایف کے تین آفیسر اس کی چارپائی کے قریب کھڑے تھے. انہوں نے اس کے ساتھ ہاتھ ملائے اور اسے بتایا کہ آر. اے. ایف کے سب آفیسر اس کے مرہون منت ہیں. کیونکہ اس نے جرمنوں کے ان گنت مظالم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے. اس کے بعد کنیڈین رائل آرمی کے بریگیڈیر بیلے نے کہا

"جارج میں تمہیں بتانے آیا ہوں کہ تمہاری بیوی موریل ڈیوڈ بالکل ٹھیک ہے اور بڑی بے صبری سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہے. ہاں ایک بات تمہیں بتانا بھول گیا. پچھلے ماہ کی تین تاریخ کو تم فلائٹ لیفٹیننٹ بنا دیئے گئے ہو۔"

لیکن جب جارج نے کہا فرانسیسی زبان میں.

"میں تمہاری بات نہیں سمجھا. میں جارج کو نہیں جانتا. میں تو پیری طوشیطے ہوں اور مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تورنگی کا پل کس طرح ٹوٹ گیا." یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں موند لیں.

جارج کا جواب سن کر سب آفیسروں کو بہت افسوس ہوا کہ ابھی تک جارج ذہنی کوفت سے آزاد نہیں ہوا. بریگیڈیر کے پاس کھڑے نفسیات کا ماہر ڈاکٹر سمجھ گیا. کہ جارج کے دماغ پر تورنگی کے تباہ کاریاں ابھی تک مسلط جائے ہوتے ہیں اس نے جارج کی پیٹھ ٹھونک کر کہا.

"ڈیوڈ فکر نہ کرو. تم جلد ہی شفا پاؤ گے. جب تم اپنی بیوی کے پاس جا کر آرام سے زندگی بسر کروگے."

نارمل صحت حاصل کرنے کے لیے جارج کو چھ ماہ لگے حکام نہیں چاہتے تھے وہ علاج کرائے بغیر اپنے گاؤں واپس لوٹے. پوری صحت بحال کرنے میں جارج کو چھ مہینے صرف کرنا پڑے وہ نفسیات کے ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق ڈربی شائر کے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں مقیم رہا. جہاں وہ قدرتی مناظر سے لطف اٹھاتا ہوا شب و روز گذارنے لگا. چند دنوں کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کی گذری ہوئی توانائی واپس لوٹ رہی ہے.

ایک روز وہ جلد ہی بستر سے اٹھ بیٹھا. آسمان میں

محراب اردو ڈائجسٹ دہلی فروری ۱۹۷۶ء



ستارے ابھی تک آنکھ مچولی کھیل رہے تھے اس کے دل میں آیا کہ وہ تھینچے کر ریسٹ ہاؤس کی جھاڑیوں کو سنوارے جس طرح وہ اپنے آبائی گاؤں بینی بیگ میں جنگ پر روانہ ہونے سے پہلے جھاڑیوں کو سنوارا کرتا تھا۔ اس وقت قدرت کے نظاروں میں اس کا دل اس قدر کھویا ہوا تھا کہ جھاڑیوں کو چھانٹتے ہوئے اسے وقت کا کچھ پتہ نہ چلا وہ لنچ کھانا بھول گیا آخر کار تھک ہار کر وہ ایک بڑے سے پتھر پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی اسے نیند آگئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی وہ ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں اپنے پلنگ پر دراز تھا۔ ریسٹ ہاؤس کا اردلی پاس کھڑا کہہ رہا تھا۔

"جناب آج آپ بہت سوئے۔ دوپہر کا کھانا بھی آپ نے نہیں کھایا۔ دو بار ڈاکٹر آپ کو ملنے آیا تھا لیکن آپ کو سوتے دیکھ کر واپس چلا گیا۔"

لیکن میں تو ریسٹ ہاؤس کی جھاڑیوں کو سنوار رہا تھا یہاں کیسے آ گیا

"پتھر پر لیٹے ہوئے آپ سو رہے تھے۔ ہم آپ کو وہاں سے اٹھا کر یہاں لے آئے۔"

میں بیمار تو نہیں ہوں؟"

"ایسا نہ کہیے۔ آپ بالکل تندرست ہیں۔"

دن رات بڑی تیزی سے گزر رہے تھے۔ جارج روزانہ تین چار میل کی سیر کرنے جاتا۔ ایک روز ڈاکٹر نے کہا

"جارج تم کل کینیڈا جا رہے ہو۔"

"اتنی جلدی۔"

"لیکن جس تندہی اور پیار و محبت سے آپ نے میرا علاج کیا ہے اس کا قرض میں کس طرح اتاروں گا۔"

"گاؤں لوٹ کر دو مہینے کے بعد تم مجھے خط لکھنا اس میں ان تمام باتوں کا ذکر کرنا کہ تم نے ان دو مہینوں میں کیا کیا کیا کھایا۔ کن کن پرانے دوستوں سے ملے۔ تمہاری بیوی نے تمہاری لمبی غیر حاضری میں کس طرح زندگی کے دن کاٹے۔ جب میں تمہاری وصول کروں گا تو سمجھ لینا کہ تمہارا قرض اتر گیا۔"

"جارج تم نے مجھے کبھی خط نہیں لکھا کہ تم طوفانوں میں گھرے ہو۔"

"اگر میں مصیبتوں کی تفصیلات لکھتا۔ تمہیں کیا فائدہ ہوتا ــــ"

مورین نے فرط محبت سے اس کی گردن کو اپنی باہوں میں ڈال لیا۔

✿ ✿

رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی انسان ہیں اور اپنے دل میں انسانی جذبات رکھتے ہیں۔ ان کی برہمی اور غصہ فطری ہے۔ اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو وہ بیروت کی سڑکوں پر دستی بنے ہوئے بموں کی، دھواں دھار بارش کرنے لگتے ہیں۔ رائفل کی گولیاں اس طرح برستی ہیں جیسے ژالہ باری ہوتی ہے — بوڑھے اور ناتواں پناہ گزین بھی جنگجویانہ اسپرٹ رکھتے ہیں اور اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے اپنے ملک کو آزاد کرانے کا جتنا بھی کام کر سکتے ہیں اتنا کام کرتے ہیں۔ ایک بوڑھے پناہ گزین نے کہا۔ "کاش میرے ہاتھوں میں اتنی قوت ہوتی کہ میں بم مار سکتا اور رائفل چلا سکتا"۔

لبنان کے جو مسئلے ہیں وہ بہر حال دوسرے عرب ممالک سے بہت مختلف ہیں، فرض کر لیجئے کہ اگر مجاہدین آزادی اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں تو لبنان کی دوسری جانب اسرائیل ہے جہاں سے لبنان کی سرحدوں پر حملے شروع ہو جاتے ہیں اور اگر مجاہدین آزادی کو ان کی سرگرمیوں سے باز رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو پھر ان کا غصہ بھڑک اٹھتا ہے اور عرب اتحاد کا مسئلہ دوسرے تمام مسائل پر غالب آجاتا ہے۔

وقت سے ساز کر کے زندہ رہنا، لبنانیوں کی پرانی عادت ہے، جادہ حیات کے پیچ وخم ان کی زندگی کے سفر کو نہیں روکتے، وہ پیچیدہ سے پیچیدہ صورت حال کا سامنا کرنے کے عادی ہیں۔

فروری ۶۸ء کا واقعہ ہے کہ حکومت لبنان اور فلسطین مجاہدین حریت میں زبردست تصادم ہوا اور بڑی خونریزی ہوئی اس وقت متحدہ عرب جمہوریہ لیڈروں نے فریقین کے درمیان مفاہمت کرانے کی کامیاب کوشش کی لیکن ۷۱ء میں پھر لبنان کی سرکاری توپوں اور مجاہدین آزادی کے درمیان تشدد آمیز تصادم ہونے لگا اس وقت جو صورت حال ہے وہ یہ ہے کہ لبنان کے سامنے اس کا کوئی یقینی مستقبل نہیں ہے۔

سیاسی انتشار کے باوجود لبنان میں موسم بہار اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ آتا ہے فضا خوشبو سے معطر ہو جاتی ہے اور روش روش خوش رنگ پھول کھلنے لگتے ہیں، خوش نماں پرندے اپنی اپنی بولیوں سے انسانوں کا دل بہلاتے ہیں۔ بیروت تر پولی سڑک انتہائی خوبصورت سڑک ہے اس کے ایک طرف کشادہ سمندر ہے اور دوسری طرف سر بہ فلک پہاڑی چوٹیاں ہیں۔ اس سڑک کے کنارے جو گاؤں آباد ہیں ان کے سرشار و سرمست جوان اکثر پرانے زمانے کے سازوں پر اپنی مخصوص انگلیوں میں منچلے گیت گاتے ہوئے ملتے ہیں اور اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ زمانے کی ناساز گاریوں کے باوجود اس ملک کے عوام کس قدر شادماں ہیں اور کس قدر زندگی کی خوشیوں کا مزہ اٹھانے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ رباب ان کا مخصوص ساز ہے۔ اور جس طرح بندی سرگرم میں سارے گاما یا دھانی ایسے الفاظ ہیں اس طرح لبنانی سرگم میں، زیک روک زیک، ایسے الفاظ ہیں۔ لبنان کی سڑکوں پر اگر ایک طرف روس رائس کاریں دوڑتی ہوئے دکھائی دیتی ہیں تو دوسری جانب خچر بار برداری کا کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

لبنان کے زیادہ تر باشندے اپنے وطن سے

ایک بھوکی اور کمزور بلی نے جاپانیوں کو شکست دے دی



برما کے اس دُور دراز کیمپ میں سیاہ رنگ کی ایک موٹی تازی بلی کیا آئی، سپاہیوں کی بے کیف زندگی میں بہار آگئی۔ سب کو ایک نیا مشغلہ مل گیا جسے دیکھو اس کے لئے کھانے پینے کی چیزیں اُٹھائے چلا آرہا ہے۔ یہ بلی چند روز پیشتر ایک مکان کے ملبے پر نظر آئی تھی۔ سخت مقابلے کے بعد جاپانی پسپا ہو کر گاؤں خالی کر گئے تھے۔ بلی کے سوا یہاں کوئی جاندار زندہ نہ بچا تھا۔ سارجنٹ رینڈی اور اس کے چند ساتھی گاؤں کا جائزہ لینے گئے، تو بلی نے میاؤں میاؤں سے انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ رینڈی نے پیار سے اُسے چمکارا۔ بلی کچھ دیر اُس کی طرف دیکھتی رہی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو، پھر بجلی کی سی تیزی سے اُس کی طرف آئی۔ رینڈی نے اُسے اٹھا لیا اور کیمپ میں لے آیا۔ چند ہی روز میں بلی اُس کے ساتھ گھل مل گئی۔ جب تک رینڈی

اپنے ہاتھ سے کوئی چیز نہ دیتا، کھانے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ وہ دوسروں کے لائے ہوئے تحفے قبول کرتی نہ ان کے ساتھ کھیل کود میں حصّہ لیتی۔ دن بھر سائے کی طرح رینڈی کے ساتھ لگی رہتی اور رات کے وقت اُس کے بستر میں دُبک جاتی۔

رفتہ رفتہ رینڈی کو غیر محسوس طور پر اس سے لگاؤ پیدا ہو گیا اور وہ اُسے بچّوں کی طرح چاہنے لگا۔ اُس کی خوراک اور صفائی کی دیکھ بھال کرتا، پل بھر کے لئے نظر سے اوجھل نہ ہونے دیتا، خاص اہتمام سے نہلاتا، بالوں میں کنگھی کرتا اور اپنے کندھے پر بٹھا کر کیمپ میں سیر کو نکل جاتا۔ وقت ہنسی خوشی بسر ہو رہا تھا کہ اچانک کمپنی کو ایڈوانس کا حکم ملا۔ انھیں چند میل دور گھنے جنگلوں میں واقع دشمن کے ہیڈ کوارٹر پر قبضہ کرنا تھا۔ رستہ دشوار، دلدلی اور خار دار جھاڑیوں سے اٹا ہوا تھا۔ دشمن کو اچانک پکڑنے کے خیال سے ہر کام میں رازداری ضروری تھی، پیش قدمی کے لئے چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی خاصے غور و خوض کے بعد طے کی گئی۔

کمانڈنگ آفیسر کو بلّی کے متعلق بخوبی علم تھا۔ روانگی سے ایک دن پیشتر اُس نے رینڈی کو بُلا کر حکم دیا:

"بلّی کو ہرگز ساتھ نہ لے جانا، اس کے سبب کمپنی کے جوانوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ یاد رکھو سفر میں وہ نظر آ گئی، تو اُسے گولی مار دی جائے گی۔"

رینڈی کسی قیمت پر بلّی سے جُدا ہونا پسند نہ کرتا تھا مگر کمانڈنگ آفیسر کے سامنے اُس کی ایک نہ چلی۔ بادلِ نخواستہ اُس نے بلّی کو ایچ کمپنی کے باورچی کے سپرد کر دیا اور تیز قدموں سے اپنی کمپنی کی طرف چل دیا۔

اگلے دن جنگل سے گزرتے ہوئے وہ بلّی کے بارے میں سوچتا رہا۔ رات کے وقت جیسے کسی نے سارے جنگل پر سیاہ چادر تان دی۔ رینڈی مورچے میں اکڑوں بیٹھا اپنی سوچ میں غرق تھا کہ اچانک ہلکی سی غراہٹ سنائی دی اور اگلے ہی لمحے بلّی اُس کی گود میں آ گئی۔ رینڈی سمجھا خواب دیکھ رہا ہے، مگر یہ ایک حقیقت تھی۔ بلّی ایچ کمپنی سے چل کر اُس کے پاس آ گئی تھی۔ مسرت سے بے تاب ہو کر وہ اٹھ بیٹھا اور بلّی کو پُچکارنا چاہتا ہی تھا کہ کمانڈنگ آفیسر کا حکم یاد آ گیا۔ اُسے بلّی کی موت ہرگز گوارا نہیں تھی، لیکن ساتھ لے جا کر دوبارہ ایچ کمپنی میں چھوڑنے کا مطلب فرار اور اپنے فرائض سے غفلت ہوتا۔ بلّی بار بار پیار سے اپنا جسم اُس کے چہرے کے ساتھ رگڑتی تھی، وہ ہلکے سے میاؤں کہتی، تو رینڈی کو محسوس ہوتا جیسے چھوڑ کر آنے پر ملامت کر رہی ہے۔ معلوم ہوتا تھا اُس نے باورچی کے لاکھ جتن کرنے پر بھی خوراک کو منھ نہیں لگایا اور ایک دن کی بھوکی ہے۔ رینڈی کو فوراً اس کی بھوک کا احساس ہو گیا، اس نے جی کڑا کر کے فیصلہ کر لیا کھانے کو نہیں دے گا تاکہ وہ مایوس ہو کر چلی جائے۔ بلّی دوبارہ غرائی، رینڈی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا منھ بند کر دیا۔ قریب ہی ہلکی سی سرسراہٹ پیدا ہوئی تھی اور وہ ڈر گیا تھا کوئی آنہ جائے۔ آخر اس نے بلّی کو بھگانے کے لئے اس کے سر پر ایک زور دار چپت جمائی۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا، وہ مورچے سے باہر کود گئی۔ صبح ہوئی، تو کہیں نظر نہ آئی۔ دوسرے ساتھیوں نے بھی اس کی موجودگی کا تذکرہ نہیں کیا۔ رینڈی کو یقین ہو گیا وہ ایچ کمپنی میں واپس چلی گئی ہے۔ اگلے دو روز تک رینڈی اپنی کمپنی کے ساتھ دشمن کے ہیڈ کوارٹر کی طرف رینگتا رہا۔ چوتھے روز بلّی دوبارہ واپس آ گئی اور اس کی گود میں بیٹھ کر پیار سے غرّانے لگی۔ آواز میں اتنا سوز اور

... بار میاؤں پر رینڈی کو محسوس ہوتا اُس کے سینے میں کسی جاپانی نے اپنی سنگین گھونپ دی ہے۔ سفری ٹارچ سے اس نے بلّی کی حالتِ زار دیکھی، تو جی بھر آیا۔ وہی بلّی جو چند روز پہلے خوب موٹی تازی ہُوا کرتی تھی، فاقوں کے سبب سُوکھ کر ہڈّیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی۔ جسم کیچڑ سے لت پت تھا، پنجے ٹوٹے ہوئے اور خون آلود، اُسے افسوس ہونے لگا، نہ جانے کون کون سی رکاوٹیں پار کر کے اور مصیبتیں جھیل کر وہ اُس تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں، مگر ان میں کسی قسم کی نفرت یا شکایت نظر نہ آتی تھی۔ وہی پہلا سا اعتماد اور اُنس موجود تھا؛ البتہ لہجے میں کسی قدر التجا کی آمیزش تھی۔

بلّی کی نظروں کی تاب نہ لا کر رینڈی نے راشن کے بچے کھچے ڈبّوں میں سے ایک ڈبّہ نکال کر سامنے رکھا، اُسے دیکھ کر بلّی کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی، رینڈی ڈبّہ کھولنے ہی والا تھا کہ اُسے خیال آیا کھانے کو مِل گیا، تو بلّی ہرگز یہاں سے نہ جائے گی اور اس کا مطلب اپنے ہاتھوں اُسے موت کے حوالے کرنا ہو گا۔ اس نے اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے ڈبّے کو پوری قوّت سے بلّی کے سر پر دے مارا۔ چوٹ اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ ایک لمحے کے لئے بلّی سُن ہو کر رہ گئی، پھر شکایت بھری نظروں سے دیکھتی اور زخمی آواز میں میاؤں میاؤں کرتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اگلے روز وہ نہیں آئی۔ مگر رینڈی بھی رات بھر سو نہ سکا۔ بار بار اس کا معصوم چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ صبح وہ اُٹھا، تو آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ ایڈوانس کرتے ہوئے پانچ دن گذرے تھے کہ وہ جنگل کے ایک ایسے حصّے میں داخل ہوئے جو حقیقی معنٰی میں خطرناک اور دشوار گزار تھا۔

جاسوسوں کی اطلاع کے مطابق دشمن کا ہیڈکوارٹر اسی علاقے میں کسی جگہ واقع تھا، اس لئے ہر لمحہ مُڈ بھیڑ کا امکان موجود تھا۔ رینڈی اور اس کے ایک ساتھی جو کو حکم ملا آگے جاکر دشمن کی نقل و حرکت اور ہیڈکوارٹر کے صحیح محلِ وقوع کا پتہ چلائیں۔ دونوں سارا دن جھاڑیوں سے اُلجھتے اور دلدلوں سے بچتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ جنگل کے عین وسط میں انھیں جاپانیوں کا ہیڈکوارٹر نظر آیا۔ کئی خیمے گھنے درختوں میں چھُپے ہوئے تھے اور ہر طرف خاموشی کا عالم تھا۔ کوئی پہرے دار یا سپاہی نظر نہ آیا۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں انھوں نے پڑاؤ کے گرد ایک چکّر لگایا۔ جگہ جگہ ایسی علامات دکھائی دیں جن سے پتہ چلتا تھا حال ہی میں دشمن نے افراتفری کے عالم میں ہیڈکوارٹر چھوڑ دیا ہے۔ کئی جگہ گھاس پر پھٹے ہوئے کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف تازہ سبزی کا ڈھیر تھا۔ درختوں پر جاپانی فوج کی وَردیاں لٹک رہی تھیں جو دھونے کے بعد سوکھنے کے لئے ڈالی گئی تھیں، مگر جلدی میں وہ انھیں ساتھ نہ لے جا سکے۔ داہنے ہاتھ خیمے کے ساتھ ہی ایک بھدّی سی میز پر بچا کھُچا کھانا پڑا تھا، جو بولا:

"انھیں یقیناً ہماری آمد کی اطلاّع مل گئی ہو گی، جبھی ہیڈکوارٹر خالی کر کے فرار ہو گئے۔"

دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ وہ آہستہ آہستہ مرکزی خیمے کی طرف بڑھے۔ ایک جگہ رینڈی اچانک ٹھٹھک کر رُکا لمبی خودرَو گھاس میں کوئی شے حرکت کر رہی تھی۔ دونوں نے ہوشیار ہو کر حملے کی پوزیشن لے لی، مگر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہی سیاہ بلّی بھُوک کی وجہ سے لڑکھڑاتی ہوئی نکلی، جسے وہ ایچ کمپنی کے پاس چھوڑ کر آئے تھے۔ رینڈی حیران رہ گیا، بلّی نے کم و بیش بیس میل کا فاصلہ

باپیادہ طے کیا اور اُسے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ غالباً وہ کسی حالت میں اپنے مالک کا ساتھ چھوڑنا پسند نہ کرتی تھی۔ بلی خیمے کی طرف بڑھی، وہ اور جو بھی اُسکے پیچھے لپکے۔ ایک میز پر کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ بُھنا ہوا سالم مرغ پڑا تھا۔ ڈبے کی بند خوراک کھانے کے بعد مرغِ مسلّم کا تصور بہت دلکش تھا۔ جو بے تاب ہو کر اُس کی طرف لپکا۔ عین اسی لمحے رینڈی نے دیکھا بلی خیمے کے ایک کونے سے اچھلی اور ایک ہی جست میں میز تک پہنچ گئی۔

نہ جانے کیوں رینڈی کو دُکھ محسوس ہوا۔ جانور آخر کو جانور ہی رہتا ہے، اُس نے سوچا بھوک پیاس کی پروا نہ کرتے ہوئے اس بلی نے میرا پیچھا کیا، مگر اب گوشت کو دیکھ کر بے قابو ہو گئی ہے، اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ جو نے ایک پتھر اُٹھا کر بلی کی طرف پھینکا تاکہ وہ مرغ نہ لے جا سکے، مگر یہ کوشش بے فائدہ ثابت ہوئی۔ بلی کے پلیٹ پر کودتے ہی ایک دھماکہ ہوا اور خیمے کی طنابیں اکھڑ گئیں۔ رینڈی اور جو الٹے قدموں دوڑے اور خیمے سے کچھ فاصلے پر اوندھے منہ لیٹ گئے۔

چند منٹ بعد اٹھ کر دیکھا، تو خیمے والی جگہ سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور چاروں طرف بارود کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ جو بولا:

"خدا کی پناہ! مرغ کے نیچے بارودی سرنگ تھی۔ جاپانیوں نے ہمیں دھوکہ دیا تھا، وہ یقیناً آس پاس چھپے ہوں گے۔"

شام تک خاصی تلاش کے باوجود انھیں کوئی شخص نظر نہ آیا۔ تب انھوں نے خیمے والی جگہ کا اچھی طرح معائنہ کیا اور اُن پر یہ راز منکشف ہوا کہ جاپانیوں نے مرکزی خیمے کے نیچے ایک تہہ خانہ بنا رکھا تھا اور خطرہ محسوس کرتے ہی اسلحے کا ذخیرہ لے کر اس میں اُتر گئے۔ انھیں معلوم تھا اتحادی سپاہی بھوکے ہوں گے اور مرغ کو دیکھ کر صبر نہ کر سکیں گے، اُن کے مرغ کو چھوتے ہی بارودی سرنگ پھٹ جائے گی اور افراتفری میں جاپانیوں کو باہر آکر حملہ کرنے کا موقع مل جائے گا، مگر بلی نے اُن کے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا۔ اس چھوٹے سے جانور نے مرغ پر اس طرح جھپٹا مارا کہ وہ پلیٹ اور نیچے لگے ہوئے ٹائم بم سمیت اس خفیہ راستے میں جا گرا جو خیمے کے نیچے چھپے ہوئے جاپانی سپاہیوں تک جاتا تھا۔ اس راستے میں بم پھٹا، تو تہہ خانے کے اسلحہ کو بھی آگ لگ گئی اور سارے جاپانی اندر ہی بھسم ہو گئے

بعد میں جب اتحادی کمپنی کے باقی سپاہی بھی آن پہنچے تو انھوں نے یہ جگہ کھودی اور جاپانیوں کی سوختہ لاشیں برآمد کر لیں۔ اسی خفیہ راستے سے چند فٹ دور خیمے کے بالائی فرش پر اُس بلی کی لاش بھی پڑی تھی جس نے اپنی جان دے کر مالک کی جان بچائی۔

رینڈی کئی روز تک ملول رہا، وہ بار بار اپنے ساتھیوں سے کہتا: "بخدا، وہ سب کچھ جانتی تھی، اُسے معلوم تھا میں بھوکے ہوتے مرغ کو دیکھ کر صبر نہ کر سکوں گا، اس لئے اپنی جان پر کھیل گئی؛ ورنہ تم ہی بتاؤ جتنی دیر میں ہم نے پڑاؤ کا چکر لگایا، وہ بڑی آسانی سے مرغ چٹ کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اگر کھانے کا مسئلہ ہی تھا، تو باہر میز پر بھی کھانا پڑا تھا اور وہ بآسانی کھا سکتی تھی۔"

بلی کو رینڈی کے بقول جاپانیوں کی سازش کا علم تھا یا نہیں، اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے؛ تاہم یہ حقیقت ہے کہ ہیڈکوارٹر پر قبضے کے بعد اتحادی فوجیں آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئیں۔ اس کے برعکس یہ پڑاؤ جاپانیوں کے پاس رہتا تو اتحادیوں کو بہت سا جانی نقصان اٹھانا پڑتا۔ جنگ کے خاتمے پر رینڈی کی کمپنی کے جوانوں نے بلی کی ایک قبر بنائی اور اس پر لکھا:

"مرینڈی کی یہ بلی ہماری مدد نہ کرتی، تو ہم جاپانیوں کو شکست دینے میں کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔" ★★

اسکی یادداشت نے خطرناک جاسوس گرفتار کرادیا

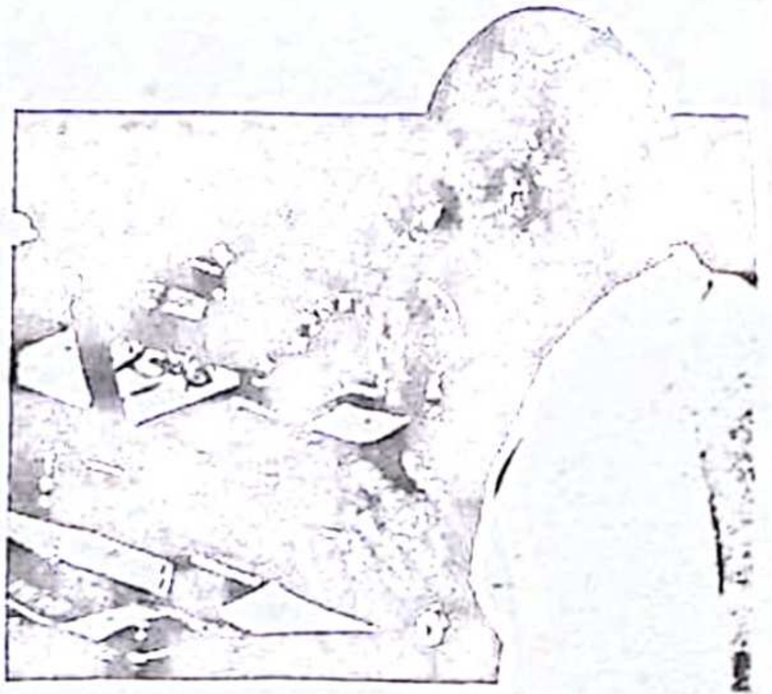
دیوان تاراچند

انگلستان میں اولڈ بیلی جیل خانہ کے صدر دروازے کے باہر لاطینی زبان میں مندرجہ ذیل مشہور عبارت کندہ ہے۔

"انصاف ہر حالت میں ہونا چاہیے۔ چاہے آسمان زمین پر کیوں نہ آگرے"

کرنل پنٹو برطانیہ میں نوزی طاقتوں کی جانب سے بھیجے گئے جاسوسوں کی خطرناک کارروائیوں کو کچلنے پر تعینات تھا۔ جب سکاٹ لینڈیارڈ (برطانیہ کی پولیس)، برطانوی فوجی حکام کو کسی غیر ملکی یا ملکی اشخاص کی غیر قانونی سرگرمیوں کی اطلاع ملتی تو وہ وقت ضائع کئے بغیر ان کو اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ کر کرنل پنٹو اور اس کے ساتھیوں کے سپرد کردیتے جو اپنی ذہانت اور سخت عرق ریزی کے بعد ان غیر ذمہ دارانہ اشخاص سے سب راز اگلوا کر کیفر کردار کو پہنچادیتے۔

کرنل پنٹو اور اس کے جانباز ساتھیوں نے شب و روز محنت کرکے جرمن خفیہ سروس کے ارسال کردہ جاسوسوں کو برطانیہ میں چند روز آزادانہ گھومنے دینے کے بعد فوراً اپنے قابو میں کرلیا۔ ان جرمن جاسوسوں کی یہ تجویز تھی کہ موقع پاکر برطانیہ میں ایسے حالات پیدا کردیں جس سے برطانوی حکومت کی جنگی مشینری درہم برہم ہوجائے۔ اور جرمن فوجیں



کرنل پنٹو

یلغار کرتی ہوئی برطانیہ کے ساحل پر اتر جائیں لیکن برطانوی جاسوسیا کے جال اس قدر مضبوط تھے کہ جس جرمن جاسوس نے یہاں آکر سانس لینے کی کوشش کی وہ وقت ضائع کیے بغیر دم توڑ گیا۔

برطانوی خفیہ حکام خاص کر کرنل پنٹو اور ان کے دستہ کے دوسرے سربراہوں کی بابت عام بات کہی جاتی ہے کہ وہ حراست میں لیے گیے مشتبہ لوگوں کے ساتھ دہشیانہ انسانیت سوز اور تیسرے درجہ کا سلوک کیے جانے کے قائل نہ تھے بلکہ وہ مجرم کو ہر قسم کی سہولت بہم پہنچانے میں کوشاں رہتے تاکہ وہ شخص اپنے آپ کو بے قصور اور معصوم ثابت کر سکے حتیٰ کہ مجرم حالات سے مجبور ہو کر خود ہی کہہ دیتا کہ۔

"ہاں میں دشمن کا بھیجا ہوا جاسوس ہوں اور میں برطانیہ میں اس لیے وارد ہوا ہوں کہ میں یہاں کے جنگی اقتصادی، معاشی اور سیاسی راز اپنے آقاؤں تک پہونچا سکوں"

اس کے بعد اسے رائج قانون کے تحت سزا دی جاتی اور جو شخص اُن کے کڑے امتحان میں کامیاب ہو جاتا اُسے عزت وقار کے ساتھ رہا کر دیا جاتا

ایک روز کرنل پنٹو لندن کے مشہور و معروف علاقہ پکاڈلی میں مٹر گشت کر رہا تھا چونکہ وہ انٹیلی جنس سروس کا آفیسر تھا لہٰذا وہ اپنے پاس سے گزرنے والے ہر شخص کو گہری نظر سے تاڑتا ہوا آگے بڑھتا جاتا تھا جنگی حالات پہلے سے کافی حد تک سدھر چکے تھے۔ برطانوی اور امریکی فوجیں شمالی افریقہ میں تیونس کے مقام پر جرمن فوجوں پر عقابی جھپٹا مارنے کے بے قرار کھڑی حکم کی منتظر تھیں مشرق میں اسٹالن گراڈ کے گرد و نواح جرمن فوجیوں کے قبرستان بن چکے تھے۔ جہاں پہلے آسمانوں پر جرمن فضائی افواج کا تسلط تھا۔ اب رائل ایئر فورس نے ان کی جگہ حاصل کر لی تھی۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے جرمن فوج پر بموں کی بارش برسا کر بادلوں میں یوں گم ہو جاتے جیسے چھلاوہ ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

کرنل پنٹو ابھی چند قدم ہی گیا ہوگا کہ اس کی نظر ایک نوجوان پر پڑی جس نے ولندیزی فوج کے آفیسروں کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ اس کی جھلک جس نے اُسے فوراً یاد دلایا کہ اس نے اس آفیسر کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہوا ہے۔ مگر کہاں کب اور کن حالات میں؟

چونکہ وہ گذشتہ کئی سالوں سے دشمن کے جاسوسوں کے پیدا کردہ کی روک تھام کے سلسلہ میں مصروف تھا اس لیے اس کا دماغ جاسوسیا کے سیکڑوں کیسوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ اس لیے ولندیزی افسر کے چہرے کو دیکھتے ہی اس نے سوچا کہ وہ کون ہے اور اس کا سابقہ ریکارڈ



وان گیلدار

ان تفصیلات کا مالک ہے اپنے دماغ پر دباؤ ڈالتا ہوا کرنل نیٹو اپنے دفتر کی طرف چل دیا۔ چونکہ وہ شخص ولندیزی لباس میں ملبوس تھا اس لیے اس نے اُسے ہالینڈ میں دیکھا ہوگا۔ وہ بھی جنگ شروع ہونے سے پہلے، اس شخص کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی اس لیے ضروری ہے کہ کرنل نیٹو نے اُسے بیس بائیس برس پہلے ہی دیکھا ہوگا۔ یعنی ۲۲-۱۹۲۳ء میں اب کرنل نیٹو کے خیالات نے پلٹا کھایا بھلا وہ اس شخص کو دیکھ کر اس کے ساتھ بری باتیں کیوں منسوب کرنا چاہتا ہے اس نے اس عرصے میں لاکھوں اشخاص کو دیکھا ہوگا۔ کیا سب کے سب مشتبہ کردار کے مالک تھے اگر نہیں تو اس شخص میں کیا بات تھی جس کی پرانی یاد اس کے دماغ کے نازک ترین حصے پر پرورش کر رہی تھی۔

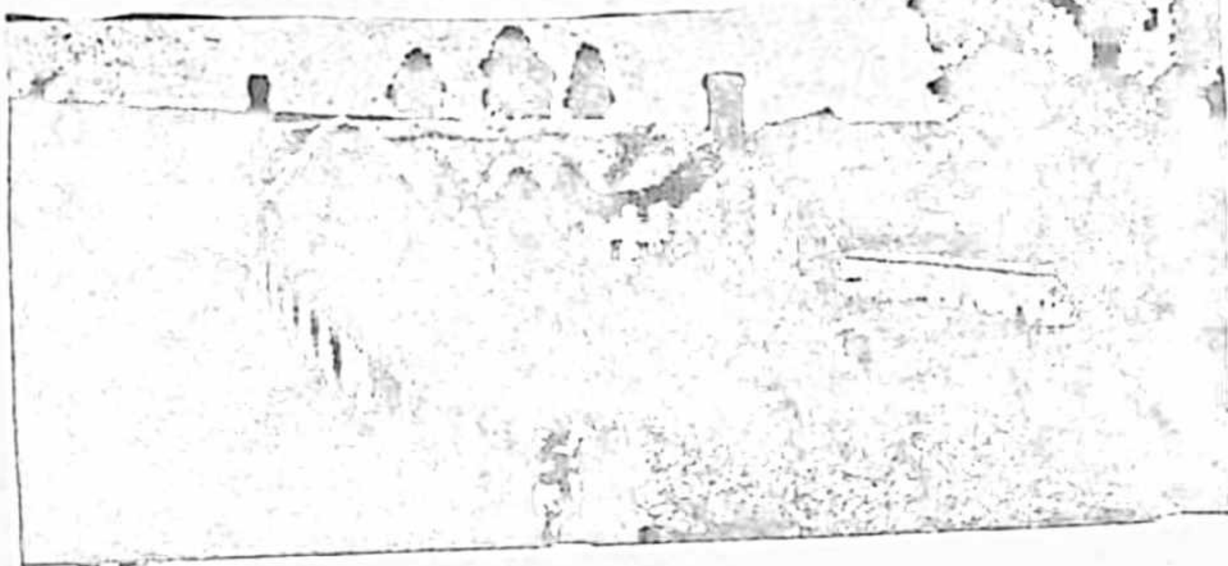
کرنل نیٹو یہ بات سوچ کر بے قرار ہو اٹھا۔

اُسے خوب یاد آیا ۱۹۳۲ء میں وہ ایمسٹرڈم کے صدر بازار میں گھوم رہا تھا اس نوجوان نے اپنی قمیض کے بائیں بازو میں "اخوت" کا نشان لگا رکھا تھا۔ ایمسٹرڈم میں "اخوت" ایک نئی پارٹی ظہور پذیر ہوئی تھی جس کا تعلق جرمنی کی نازی پارٹی سے تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ اور اصول سب نازی پارٹی کے ہی تھے۔

اس خیال کے آتے ہی کرنل نیٹو نے لندن میں مقیم ولندیزی فوجی ہیڈ کوارٹرز سے رابطہ پیدا کیا تاکہ وہ پتہ لگائے کہ وہ وہی نوجوان کون ہے اور اس کی سابقہ زندگی کیا ہے۔ وہاں سے اُسے پتہ چلا کہ اس نوجوان کا نام وان گیلدار (VAN GELDAR) تھا موقع پا کر وہ کسی جرنلسٹ کے ساتھ جرمن فوجیوں کی نگاہ سے بچ کر ہالینڈ سے بھاگ نکلا۔ اس نے اپنا نام بدل کر دیگار رکھ لیا تھا۔ آزاد ولندیزی حکومت کے صدر مقام سے یہ بھی کرنل نیٹو کو معلوم ہوا کہ گیلدار جنگ سے پہلے ہوم گارڈ میں افسر تھا جب وہ جنگ کے دوران اپنی جان بچا کر انگلینڈ پہنچا تو اُسے آزاد ولندیزی فوج میں بھرتی کر لیا گیا تھا کیونکہ اس کا سابقہ ریکارڈ بے داغ اور بے عیب تھا۔ ان تفصیلات کے باوجود کرنل شک وشبہ کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا۔ اس کی چھٹی حس نیش زنی کرتی رہی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس نے ڈچ نازی پارٹی کا نشان اپنے بازو پر کیوں لگا رکھا تھا۔ شاید جوانی کے جوش میں آ کر اس نے وہ نشان لگایا ہوگا۔ یا ہو سکتا ہے کہ اس نے نشان لگانے سے پہلے خوب سوچ بچار سے کام لیا ہوگا۔ بہرحال کرنل نیٹو شک کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔

اس نے ڈچ آرمی کے کمانڈنگ افیسر سے جہاں وان گیلدار تعینات تھا درخواست کی کہ وہ اُسے اس کے دفتر واقع ایٹن سکوئر ETON SQUARE روانہ کر دے۔

جب وان گیلدار کرنل کے سامنے آ کر کرسی پر بیٹھا۔ کرنل کی عقابی آنکھوں نے جائزہ لینا شروع کیا کہ گیلدار کس قماش کا آدمی ہے



وہ جگہ جہاں جاسوسوں سے پوچھ تاچھ ہوتی تھی۔

گیلدار نے چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں اس کے بازو لمبے تھے اور ان پر گھیرے بال اُگے ہوئے تھے دوران گفتگو کرنل کو پتہ چلا کہ گیلدار کی پیدائش ایک یہودی گھرانے میں ہوئی تھی لیکن ایک بلجیمی عورت کے ساتھ شادی کرنے کے بعد اس نے رومن کیتھولک مذہب اختیار کر لیا تھا جنگ شروع ہونے سے پیشتر وہ ہالینڈ میں کسی فلم کا ڈائرکٹر تھا۔ اس کے علاوہ اس نے کچھ عرصے تک بطور ڈچ ہوم گارڈ بھی کام کیا تھا لیکن جب کرنل پنٹو نے اس سے دریافت کیا کہ کیا اس نے کبھی کسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھا تھا، تو گیلدار نے اپنے چہرے پر رومال پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"کبھی نہیں۔ جناب میں نے آج تک کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھا۔"

کرنل پنٹو نے بات کا پہلو بدل کہا

گیلدار مجھے اس روز کی روئداد سناؤ جس دن تم ولندیزی سرحد پار کر کے بلجیم میں داخل ہوئے تھے۔

"مجھے بڑا افسوس ہے جناب ہم بلجیم میں کبھی داخل نہیں ہوئے تھے۔"

"کبھی نہیں" پنٹو نے معنی خیز انداز سے پوچھا۔

"پہلے ہم نے فرینک فرٹ (جرمنی) کی طرف سفر کیا۔ وہاں سے ہوتے ہوئے ہم سوئیٹزرلینڈ جنوبی فرانس میں وارد ہوئے جنوبی فرانس سے ہو کر ہم اسپین اور پرتگال پہونچے"

"تم نے بڑا ٹیڑھا سفر اختیار کیا۔ گیلدار مجھے یہ بتاؤ کہ جرمنی سے باہر تم کیوں کر نکلے۔ جب کہ وہاں پر چاروں طرف گسٹاپو (جرمن خفیہ پولیس) کے باز دپھیلے ہوئے تھے۔ جرمن پولیس اور فوج اتنی نرم نہیں تھی جو مسافروں کی جانچ پڑتال کئے بغیر اپنے علاقے میں سے خاموشی کے ساتھ انھیں وہاں سے جانے دیتی۔

یہ سن کر گیلدار نے بلند قہقہہ لگایا اور کہا

"جناب بات دراصل یوں ہوئی کہ ہم نے حکومت چلی (جنوبی امریکہ کا ایک ملک) کے سفر سے ویزا (پروانہ راہداری) حاصل کر لیا تھا جس کی پڑتال کرکے گسٹاپو نے ہمیں کچھ نہیں کہا۔ اور وہاں سے ہم صاف نکل آئے۔"

گیلدار کے اس بیان سے کرنل پنٹو مطمئن نہ ہوا لیکن اس نے گیلدار کی بات کو جھٹلایا بھی نہیں اس کی چھٹی حس اُسے خاموشی کی زبان میں آگاہ کر رہی تھی کہ گیلدار کی داستان میں سچائی کی بجائے مبالغہ زیادہ ہے۔ کیوں کہ گیلدار ایک یہودی تھا اور اس کے والدین بھی یہودی تھے۔ نازی سب غیر ملکیوں پر اعتبار کر سکتے ہیں لیکن یہودیوں پر نہیں۔ چاہے کسی یہودی نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب کیوں نہ اختیار کر لیا ہو۔ ان کی نظر میں ہر یہودی موت کا پیامبر تھا۔ اس لیے گیلدار کے لیے جرمنی میں سے آزادانہ طور پر سفر کرنا معنی رکھتا تھا۔

کرنل پنٹو نے گیلدار جیسے کئی اور مہاجروں کی چھان بین کی تھی اور اب جب تک وہ ان کی سابقہ زندگی کی تہ تک نہ پہونچا اس نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر کار گیلدار نے پنٹو کی لمبی اور نہ ختم ہونے والی گفتگو سے مجبور ہو کر مان ہی لیا کہ اس کا سفر جرمنوں کے تحت ہوا تھا۔

یہ سن کر کرنل پنٹو نے اُسے اپنے کمرے میں جانے کی اجازت دے دی۔

اس گفتگو کے بعد کرنل پنٹو نے برٹش کاؤنٹر انٹلی جنس سروس سے شروع کیا کہ وہ دو افیسر تعینات کریں جن سے گیلدار کا اگلے روز مزید باتوں کا پتہ لگانا تھا۔

دوسرے روز صبح افیسروں کے علاوہ کرنل بھی موجود تھا جب گیلدار کو مخصوص کمرے میں لایا گیا اس کے چہرے بشرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رات بھر بے خوابی میں مبتلا رہا ہو جب وہ کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا تو کرنل نے اپنا پورانا سوال دہرایا۔

"گیلدار مجھے تم یہ بتاؤ کہ کیا تم کبھی سیاسی پارٹی کے رکن بھی تھے؟"

"کبھی نہیں جناب" اس نے ایک دم جواب دیا۔

"برخودار۔ جلدی مت کرو۔ سوچ سمجھ کر میرے سوال کا جواب دو۔ کل بھی تم نے اس سوال کا جواب نہیں میں دیا تھا تم سیکھے ہوئے فوجی



دان گیلدار سے پوچھ گچھ

آفیسر ہو جلدی کرنے سے بہت سے نقصانات رونما ہو جاتے ہیں۔ میرے سوال کا جواب ایک بار پھر دو۔"

"کبھی نہیں گیلدار نے سوال پھر دوہرا دیا۔"

میری آنکھوں میں اپنی نظریں ڈال کر دیکھو اور یاد کر کے آیا تم نے کبھی سیاسی جماعت میں کام کیا تھا۔ اب کی بار تم درست جواب دینا ہاں میں تم پر ایک بات کا انکشاف کیے دیتا ہوں کہ ان دونوں افیسروں نے تمہاری بابت سب کچھ بتا دیا ہے کہ تم کون ہو۔ تم کو یہاں کس مقصد کے لیے کس نے روانہ کیا ہے۔ اور یہاں آنے سے پہلے تم نے کس کس مسئلوں پر تربیت حاصل کی تھی۔" اب کی بار کرنل کی آواز میں گرج تھی گویا وہ گرج کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی کرنل نے گیلدار پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور سمجھنے لگا کہ جس اعتماد کے ساتھ گیلدار جواب دے رہا تھا ہو سکتا تھا کہ وہ معصوم ہو لیکن ہو اس کی اپنی (نیٹو کی) یادداشت دھوکہ دے رہی ہو کہیں ایسا نہ ہو گیلدار اس کی یادداشت کا مفت میں شکار بن جائے۔ اپنے کندھوں کو جنبش دیتے ہوئے اس نے کہا۔

"دان گیلدار میں نے تم سے ایک سوال تین بار پوچھا تم نے اس کا جواب تینوں بار جھوٹ میں دیا لیکن یاد رکھو میرے پاس تمہارے ہم وطنوں کی شہادتیں موجود ہیں جن میں انہوں نے کہا ہے کہ تم اپنا وطن چھوڑنے سے پہلے تم نیشنل سوشلسٹ لوبند (ولندیزی نازی پارٹی) کے سرگرم رکن تھے۔" یہ کہہ کر کرنل نیٹو نے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائل کی ورق گردانی شروع کر دی گویا گیلدار کے ہم وطنوں کے دیے ہوئے بیانات کو ڈھونڈ رہا ہو۔

کرنل کو ورق گردانی کرتے دیکھ کر گیلدار کے چہرے کا رنگ اڑ گیا وہ گھبرا کر بول اٹھا۔

"جناب ڈر کے مارے میں نے جھوٹ بولا تھا دراصل اپنے سسر کی اکساہٹ سے میں اس جماعت کا رکن بنا تھا ورنہ دل سے میں اس جماعت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔"

"لیکن تمہارے سسر نے تمہیں کیوں مجبور کیا کہ تم اپنے وطن کے دشمنوں کی پارٹی میں شامل ہو جاؤ۔ مگر ایک بات کو مت بھولنا چالاک بننے کی کوشش میں تم مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے میری بات بڑے غور اور دل کی گہرائیوں سے سنو کیا تم فوج سے بے عزت ہو کر برخاست ہونا چاہتے ہو یا عمر بھر قید بھگتنا چاہتے ہو ہو سکتا ہے کہ ایک دن تم کو گولی کا نشانہ بننا پڑے۔ اس لیے میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم خود اپنے منہ سے اپنی بابت بتاؤ۔ کہ تم کون ہو اور برطانیہ کیا کرنے آئے ہو؟"

کرنل نیٹو کی بے باک باتیں سن کر گیلدار روتے ہوئے بولا۔

"مجھے انتہائی افسوس ہے کہ انجانے میں مجھ سے کیا کیا غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ میرے سسر نے مجبور کیا کہ میں "اخوت" میں شامل ہو جاؤں تاکہ وہ "اخوت" کے کارکنوں کی نظر میں بلند جگہ حاصل کر سکے اس وقت مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ "اخوت" جماعت کتنی خطرناک پارٹی ہے مجھے معاف کر دیا جائے۔"

وہ بیاس اور بے کسی کی تصویر نظر آنے لگا اور اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

اس کے بعد کرنل نے جتنے سوالات پوچھے گیلدار سب سوالوں کا خاطر خواہ جواب دیتا رہا۔ اس نے کرنل کو یہ بھی بتایا کہ کس طرح

جرمن حکام نے اُسے پرتگیزی ولندیزی اور امریکی کرنسی بھاری تعداد میں دی اس کے علاوہ جرمنوں نے بھاری اُسے اور اس کی بیوی کو بڑے آرام سے سوئٹزرلینڈ جنوبی فرانس اسپین پرتگیزی علاقے میں سے اُسے سفر کرنے میں مدد دی۔

کرنل بنٹو اس کی باتیں سُن کر کہنے لگا۔

"وان گیلدار اگرچہ تم چالاک اور ہوشیار بننے کی کوشش کرتے ہو لیکن تم مضبوط اور سخت مادے کی ساخت کے نہیں ہو۔ مجھے ایک بات بتاؤ کہ جب جرمن یہودیوں کے سخت دشمن ہیں پھر کس وجہ سے انہوں نے تم پر اس قدر نوازشیں عطا کیں۔ اس سوال کا جواب دو"

کرنل بنٹو کی باتیں سُن کر گیلدار سہم کر بولا۔

"جب ہالینڈ سے روانہ ہونے والا تھا تو وہاں جرمن آرڈ پھوڑ کے محکمے کے سربراہ ہر کنولے نے مجھے ایک طرف لیجا کر کہا دیکھو تم جرمنی سے ہو کر غیر ممالک کو جا رہے ہو۔ اگر تم نے یہاں کی کوئی خبر ہمارے دشمنوں کو فراہم کی تو یاد رکھنا جرمن خفیہ پولیس کے بازو بہت دراز ہیں وقت آنے پر وہ تمہاری گردن میں پھانسی کا پھندا بن جائیں گے تم ایک دم بھول جاؤ کہ تم کبھی جرمنی بھی گئے تھے"

"تم نے یہ تمام باتیں امریکہ اور کناڈا میں داخل ہوتے وقت وہاں کے انٹروگیشن (پوچھ تاچھ) کے سربراہوں کو کیوں نہیں بتائیں کیا تم پر ہر کنولے کی باتوں کا اثر بدستور تھا؟"

"آپ یوں ہی سمجھ لیجئے"

"پیرامیڈون - PYRAMIDON (ایک قسم کا پاؤڈر ہوتا ہے جس سے جرمن جاسوس ظاہر نہ ہونے والے حروف لکھتے ہیں) کی ٹیوب کا کیا بنا جو ہر کنولے نے تمہیں الوداع کہتے وقت دی تھی؟"

کرنل نے اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر پوچھا۔

کرنل کا سوال سُن کر گیلدار حیران و ششدر رہ گیا لیکن ایک لمحہ بعد وہ بول اٹھا۔

"اچھا آپ سفید سفوف کی بابت پوچھ رہے ہیں۔ وہ سفوف میری بیوی کے پاس ہے"

"پلوں کو اڑانے والا بارود اور ریڈیو ٹرانسمٹر کہاں چھپا رکھے ہیں؟"

"شمالی انگلستان کے علاقہ بروآن کے پاس ریت میں" گیلدار کے منہ سے خود بخود نکل گیا۔

اب کیس مکمل تھا لیکن ابھی کرنل بنٹو نے ایک سوال اور کرنا تھا انگلستان میں نازی جاسوسوں کی فہرست کہاں ہے جن سے مل کر تم نے برطانیہ میں تخریب کاری کرنا تھا؟"

"وہ ولیم سکولر کے پاس ہے۔"

"کون ولیم سکولر۔ کیا تم بروآن کے پادری کی بابت ذکر کر رہے ہو؟"

"جی ہاں"

"تم اس سے کب ملے تھے"

"جب میں فرینک فرٹ میں تھا"

ولیم سکولر پادری ہونے کے علاوہ بروآن ضلع کیٹی کی ریڈ کراس کا صدر بھی تھا کرنل بنٹو اُسے بخوبی جانتا تھا۔ اُسے جب پتہ چلا کہ ولیم بھی نازیوں کا تنخواہ دار ایجنٹ تھا۔ انتہائی دُکھ ہوا کیونکہ وہ بروآن کے لوگوں کی نظروں میں فرشتے سے کم نہ تھا۔ اپنے کمرے سے اٹھ کر کرنل سکاٹ لینڈ یارڈ کو ٹیلی فون کیا کہ سکولر کو فوراً حراست میں لے لیا جائے۔

گیلدار کی بابت کیس مکمل تھا۔ اگلے روز اُسے ڈچ کورٹ مارشل کے سامنے پیش کیا گیا ہنگامی اجلاس کے بعد اُسے ولندیزی فوج سے نکال کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ اُسے عمر بھر قید کی سزا دی گئی لیکن اُسے زندگی کے زیادہ دن گزارنا نصیب نہ ہوئے کیونکہ ہالینڈ میں جس جگہ اُسے قید کیا گیا وہاں جرمن ہوا بازوں نے بم باری کر کے جیل کو تہ و بالا کر دیا تھا۔

ولیم سکولر کو کیا سزا ملی اس داستان میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

**

یہ غلطی دانستہ کی گئی

کبیر کوثر

جاسوسی تاریخ توریت اور انجیل کی طرح پرانی ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف جاسوسی کارروائیوں کے قصے ہر قوم اور ملک کی پرانی تاریخ میں ملتے ہیں لیکن جس جاسوسی کارنامے کی کہانی آپ کو پیش کی جارہی ہے وہ کل ہی کی بات ہے۔ جب ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بموں کی بارش نے دنیا کی امن پسند مخلوق کے دل ہلا دیئے تھے۔

جاپان صلح کے لئے تیار تھا۔ امریکہ، چین، برطانیہ، فرانس اور روس کی بظاہر خواہش تھی کہ جاپان صلح پر آمادہ ہو جائے اور جنگ کے بادل افقِ عالم سے چھٹ جائیں۔ پھر بھی ہیروشیما اور ناگاساکی کے سرسبز کھیت، معصوم آبادی، پرانی تہذیب، تاریخی یادگاریں، اور صنعتی ارتقا کے محل ایٹم کی خوں ریز آتش سے جل کر راکھ ہو گئے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں تاریخ کا یہ سب سے بڑا جھٹکا مخالف قوم کی خفیہ سروس کا شرم ناک کارنامہ کہا جاسکتا ہے اور تاریخ ہمیشہ کالے کارنامے کے نام سے یاد کرتی رہے گی۔ چلن کہ جس پیمانہ قوت کا سرزمینِ ایشیا سے آغاز ہوا اس کی انتہا کب اور کس شکل میں ہوتی ہے۔ یہ مستقبل کے اوراقِ تاریخ پر لکھی جانے والی داستان ہے۔

ہیروشیما پر ایٹم بموں کی تباہی نمودار نہ ہوتی۔ سرزمین جاپان پر ہلاکت اور بربادی کے بادل خون کے سیاہ آنسو نہ بہاتے اگر ایک لفظ کا ترجمہ دانستہ طور پر غلط نہ کر دیا جاتا۔

وہ منحوس لفظ "موکوست سو" جو جاپانی زبان کے دو لفظوں "موکو" اور "ست سو" کا مرکب ہے۔ اگرچہ "موکو" کے معنی خاموش اور ستسو کا مطلب مار ڈالنا ہے لیکن مرکب شکل میں اس کے معنی ہیں "انتظار کیا جائے" اس ایک لفظ کا ترجمہ جان بوجھ کر "نظر انداز کر دیا گیا۔ اس غلطی نے جو سمجھ بوجھ کر

کی گئی تھی ایشیا کی تاریخ کا دھارا ہی موڑ دیا۔۔۔ لاکھوں آدمی بے گناہ موت کے گھاٹ اتر گئے۔ ایشیا میں مغربی طاقتوں کے اثرات کا قلع قمع ہو گیا روسی اثرات بڑھ گئے۔ کمیونزم، منچوریا، کوریا اور انڈوچائنا پر چھا گیا۔ چیانگ کائی شیک کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ چین پر ماوزی تنگ کی کمیونسٹ طاقتوں کا پرچم بلند ہو کر لہرانے لگا۔

ترجمہ کی یہ غلطی کیوں اور کس طرح ہوئی؟ مغربی طاقتوں کا خیال ہے کہ اس میں روسی خفیہ سروس کا ہاتھ ہے جس نے کمیونزم کو پھیلانے کے لئے جاپان کی بربادی اور شہنشاہیت کو زندہ درگور کرنے میں یہی مصلحت سمجھ کر اس لفظ کا ترجمہ غلط کر دیا لیکن اسے کلی طور پر روسی خفیہ سروس کا کارنامہ کہنا درست نہ ہوگا۔

یہ داستان پوٹسڈم کانفرنس سے شروع ہوتی ہے جب ۲۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو ایک اعلان پر چین، امریکہ اور برطانیہ کے دستخطوں پر ختم ہو جاتی ہے۔ جرمنی ہتھیار ڈال چکا تھا اٹلی کی کمر توڑی جا چکی تھی اور اب جاپان سے اس اعلان کے ذریعہ کہا گیا تھا کہ وہ اپنے ہتھیار ڈال دے۔ اس اعلان میں صرف جاپانی فوج کے نہتا کرنے کے لئے جاپان سے کہا گیا تھا۔ جاپان پر قبضہ مقصود نہ تھا۔ نہ شہنشاہیت کو جو جاپانی قوم میں مذہبی شکل میں موجود تھی ختم کرنے پر زور دیا گیا تھا۔

پوٹسڈم اعلان کے بعد جاپان کے وزیر اعلیٰ سوزوکی نے ریڈیو پر قوم سے مخاطب ہوتے ہوئے لفظ "موکوست سو" استعمال کیا جس کا مطلب تھا کہ پوٹسڈم اعلان پر سوچنے کے لئے جاپان کو مہلت دی جائے اور اس لفظ کا ترجمہ جب تین بڑوں یعنی ٹرومن ایٹلی اور اسٹالن تک پہنچا تو وہ یہ تھا کہ اس اعلان کو جاپان نے نظر انداز کر دیا ہے۔

بڑی طاقتوں کو جاپان کی موت کے بٹن دبانے کے لئے یہ بات کافی تھی۔ موت کا بگل ایشیا کے بازاروں میں بجا دیا گیا اور پلک جھپکتے ہی ہیروشیما اور ناگاساکی کے شہر و بازار میں انسانیت کی سڑی ہوئی لاشوں کو موت کے گدھ چاٹنے لگے۔

۲۶ جولائی کے اس اعلان سے کافی پہلے جون ۱۹۴۵ء میں جاپان کے سربراہوں نے صلح کی بات چیت شروع کر دی تھی اور اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اٹلی کی فوجی طاقت سڑ گل چکی تھی۔ اس کی لاش سے بدبو اور تعفن پھیل کر جرمنی کے صحت مند جسم میں سمیت پھیلا چکی تھی۔ جس کا نتیجہ ۱۹۴۵ء میں جرمنی ہتھیار ڈالنے کی شکل میں ہوا۔ جرمنی کے شہر ویران ہو چکے تھے، برلن راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ فوجی افسران تتر بتر ہو گئے تھے۔ ایشتاغ کی عمارت اوندھے منہ گر چکی تھی۔ جاپان کے لئے کوئی سہارا بھی اب باقی نہ تھا۔ خود جاپان کی حالت اب نازک ہو چکی تھی۔ اس کے جزیروں کے کھوپڑے اڑ چکے تھے۔ ٹوکیو لندن سے زیادہ بموں کی بوچھار سے گھائل ہو چکا تھا۔ فولادی پیداوار میں ۷۵ فیصدی کمی آ گئی تھی۔ ہوائی جہازوں کے بننے کی رفتار ۶۰ فی صدی گھٹ چکی تھی۔ المونیم، لوہا، کوئلہ دن بدن جاپان سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ امریکی ہوائی حملوں سے پل، کارخانے، ریلیں، بندرگاہ اور ہوائی اڈے مجروح ہو چکے تھے۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ

لے ہوائی حملوں نے جاپانیوں کی آبادی کی چھٹی بے رحمی کے ساتھ شروع کر دی تھی۔ برطانیہ کی مشہور بحری قوت نے جاپانی جزیروں کو تارپیڈو کر دیا تھا۔ سرحدوں پہ چیانگ کائی شیک کی فسطائی اور ماؤزے تنگ کی کمیونسٹ افواج نے مار دھاڑ مچا رکھی تھی۔

اب جاپان کو صرف سوائے صلح کرنے کے کوئی دوسرا چارہ نہیں رہ گیا تھا۔

جاپان نے ۳ جون ۱۹۴۵ء کو اپنے سابقہ وزیر اعظم ہیروٹا کو روسی سفیر جیکب ملک سے مل کر اتحادیوں سے صلح کرانے کی کوشش کرنے کو کہا لیکن روسی منصوبے تو خود جاپان کو تباہ و برباد کرنے کے لئے تلے ہوئے تھے اس لئے بظاہر کوشش کرنے کا وعدہ کر لیا گیا۔

۱۲ جولائی ۱۹۴۵ء کو پوسٹڈم کانفرنس سے پہلے پرنس کونوے کو کامریڈ اسٹالن سے ملنے کے لئے منچوریا بھیجا گیا جہاں سے اسے سوویت ہوائی جہاز کے ذریعے ماسکو اڑان کرنا تھی لیکن اسے یہ کہہ کر روسی افسروں نے سفر کرنے سے روک دیا کہ اسٹالن اور مولوٹوف پوسٹڈم کانفرنس کی تیاری میں مشغول ہونے کے باعث ملاقات نہیں کر سکیں گے۔ اسی طرح کافی سعی وجہد کی گئی کہ جاپان کی جانب سے کوئی ملک اتحادیوں سے باعزت صلح کرا دے۔ پوسٹڈم کانفرنس کے اعلان کو غنیمت جانتے ہوئے جاپانی وزیر اعظم سوزوکی نے فوراً ہی قوم کو ریڈیو پر مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اس اعلان پر غور کرنے کی مہلت چاہیئے اور مغربی طاقتوں کو چاہیئے کہ وہ انتظار کریں۔ جاپان کے نپن ٹائمز کے سابق ایڈیٹر نے انکشاف کیا اور جس کی کہیں سے تردید نہیں ہوئی کہ

وزیر اعظم سوزوکی نے "موکوست سو" کا جو لفظ استعمال کیا اسے بجائے "انتظار کیا جائے" ترجمہ کرنے کے "نظر انداز کیا جائے" ترجمہ کر دیا گیا بس پھر کیا تھا ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم کا استعمال جائز قرار دے دیا گیا اور جاپان کی فوجی طاقت کی کمر توڑ کر رکھ دی گئی۔ وہاں کی شہنشاہیت کو زندہ درگور کر دیا گیا۔ جاپانی فوج کے ہتھیار چینی کمیونسٹوں کے ہاتھ میں آ گئے اور چین کمیونزم کی گود میں ایک ننھے بچے کی طرح ہمک کر آ گیا۔

کہا جاتا ہے کہ ترجمہ کی دانستہ غلطی میں سوویت روس کا ہاتھ تھا چونکہ جاپان کی مکمل تباہی کمیونزم کو پھیلا وا دے سکتی تھی بظاہر ہوا بھی یہی روس کے اثرات ایشیا پر چھا گئے اور پورے چین پر روس کا اثر و اقتدار ہی نہیں بڑھا بلکہ چین میں کمیونسٹ حکومت بن گئی۔ منچوریا، کوریا اور انڈوچائنا کے حصوں پر کمیونزم کے جھنڈے لہرانے لگے اور ایشیا میں جگہ جگہ مغربی طاقتوں کے اقتدار کے دیئے بجھنے چلے گئے۔

لیکن اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہوگا کہ مغربی طاقتوں نے اپنی طاقت کے مظاہرے کے لئے ایشیا کی سرزمین کو چن لیا تھا اور انھوں نے ترجمہ کی اس دانستہ غلطی پر جان بوجھ کر کوئی دھیان نہیں دیا۔

اور یہ کارنامہ ان حالیہ جاسوسی ماہرین اور خفیہ سروس والوں کا سب سے عظیم کارنامہ بن گیا جنھوں نے وزیر اعظم سوزوکی کی ریڈیو تقریر کا فوری ترجمہ کر کے ٹوکیو سے پوسٹڈم طاقتوں کے سربراہوں کو پہنچا دیا جس میں "موکوست سو" کا ترجمہ دانستہ غلط کر دیا گیا تھا اور یہ غلطی جان بوجھ کر کی گئی۔



آرنہم کی تکرار

مصنف: کرنل اوبے بیتھو

ترجمہ: دیوان تارا چند



یہ ایک ایسے شخص کی داستان ہے جس کی وجہ سے یورپ میں دوسری عالم گیر جنگ چھ ماہ مزید طول پکڑ گئی۔ اگر وہ شخص جنگ کی اسٹیج پر ظاہر نہ ہوتا تو برطانوی حکومت جنگ ختم کر کے ۹۰،۰۰۰،۰۰۰ پاؤنڈ کے سرمائے کو بچا کر ترقیاتی اقدام پر صرف کر سکتی تھی۔ اگر امریکی فرانسیسی یا دوسری اتحادی افواج کے چھ ماہ کے نقصانات کا اندازہ لگایا جائے تو وہ رقوم کسی پہاڑ کی چوٹی کو چھوئیں۔ جن سے جنگ کی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں سے پیدا شدہ حالات پر قابو پا کر لاکھوں بلکہ کروڑوں اُجڑے ہوئے انسانوں کو دوبارہ بسانے کا کام کر سکتی تھیں۔ بہر حال پروردگار کو جو منظور تھا وہی ہو کر رہا۔ اُس وقت مغربی اتحادی فوجوں نے جرمن پر قبضہ کر لیا تھا جب کہ روسی افواج مشرقی جرمنی کو تہ و بالا کر چکی تھیں اگر جنگ چھ ماہ طول نہ پکڑتی تو آج یورپ کے سیاسی حالات کچھ اور ہی ہوتے۔ (ادارہ)

جونہی اتحادی افواج نے جرمنی کے گرد اپنے بازو تنگ کرنا شروع کئے مجھے S.H.A.F.E. شیف جو سپریم ہیڈکوارٹرز الائڈ فورسز ان یورپ" کا مخفف تھا۔ ولنیزی خفیہ محکمے کا انچارج بنا دیا گیا تاکہ نازیوں کے چنگل سے آزاد شدہ علاقوں میں حفاظتی انتظامات مضبوط کر سکوں۔ جنگی حالات کے پیشِ نظر ان علاقوں میں سول کنٹرول نفی کے برابر تھا۔ چاروں طرف موت کے سائے چھائے ہوئے تھے۔ جن لوگوں نے نازی فوجوں کے ساتھ تعاون کیا تھا وہ اپنی جانیں بچا کر ہوا میں تحلیل ہو چکے تھے۔ پسپا ہونے کے بعد نازیوں نے اپنے پیچھے اپنے تنخواہ یافتہ جاسوس چھوڑ دیئے تاکہ موقع پا کر اتحادی فوجوں کی جنگی مشینری میں رخنہ انداز ہو سکیں۔ وہ جاسوس کون تھے۔ اُن کا کیا کام تھا۔ وہ کہاں رہتے تھے؟ ان سب باتوں کا پتہ لگانا میرا اور میرے آزمودہ کار ساتھیوں کا کام تھا۔

جن لوگوں پر دشمن کے جاسوس ہونے کا ذرّہ بھر بھی شبہ ہوتا انھیں فوراً پکڑ کر خار دار جنگلوں میں بند کر دیا جاتا پھر باری باری اُن سے پوچھ تاچھ کر کے پتہ لگایا جاتا کہ اُن میں بھیڑیئے کون تھے اور بھیڑیں کون۔ لیکن ایسے لوگوں میں تمیز کرنا کنوئیں میں گری ہوئی سوئی ڈھونڈنے کے مصداق تھا لیکن بھاری شب و روز کی محنت ضرور پھل لاتی تھی۔

جب ایندھوون نازیوں سے آزاد ہو گیا میں نے اس شہر کے نزدیک ہی حفاظتی کیمپ بنوایا جہاں مشتبہ لوگوں کو بند کر دیا گیا تاکہ اُن سے پوچھ تاچھ کرنے کے بعد معلوم کیا جا سکے کہ آزاد کرائے گئے علاقوں میں کون کون سے افراد اتحادی فوجوں کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔

ایک روز میں اس کیمپ کے صدر دروازے کے قریب کھڑا تھا کہ مجھے شور و غل سُنائی دیا۔ میں فوراً اُس طرف چل دیا۔ وہاں جا کر میں نے حیران کن منظر دیکھا۔ دروازے کے سنتری کے پاس ایک ایسے دیو ہیکل شخص کو کھڑے پایا جس کا قد چھ فٹ سے قدرے زیادہ ہوگا۔ چوڑی چھاتی لمبے لمبے بازو اور بھیانک چہرہ اُس کی ہیئت کو دہشت ناک بنائے ہوئے تھے۔

وہ خاکی قمیض اور نیکر پہنے ہوئے تھا۔ اُس کی کمر کے گرد کارتوسوں سے بھرپور پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ اُس پیٹی میں اُس نے لمبے اور تیز پھلوں والے دو چاقو بھی اڑس رکھے تھے اِس کے علاوہ اُس کے پاس ایک ریوالور بھی نظر آرہا تھا اور دوسرے ہاتھ میں اسٹین گن پکڑی ہوئی تھی۔

غرض یہ کہ وہ دیوہیکل انسان چلتا پھرتا آتشیں اسلحہ کا ایک ناتسخیر قلعہ معلوم ہوتا تھا۔

اُس نے اپنی دونوں بغلوں میں ایک ایک دوشیزہ تھام رکھی تھی جب میں اُس کے قریب پہنچ گیا تو اُسے سنتری سے مخاطب ہوتے سُنا وہ کہہ رہا تھا۔

"ارے سنتری یہ دونوں لڑکیاں وطن پرست ولندیزی ہیں۔ اپنے کرنل کو کہہ دینا کہ کنگ کانگ نے انکی رہائی کی ضمانت دی ہے۔ اِن کو فوراً رہا کر دیا جائے۔ ارے مردود میری بات تیری سمجھ میں آئی یا نہیں۔"

گذشتہ کئی دنوں سے میں اس کنگ کانگ کا نام متواتر سُن رہا تھا۔ جو زمین دوز وطن پرست ولندیزوں کا لیڈر مانا جاتا تھا۔ ایک کہاوت کے مطابق اُس نے اپنی کارگذاریوں کی وجہ سے جرمن فوجوں کے لئے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ وہ اور اُس کے ساتھی اُن پر قہر بن کر ٹوٹے تھے۔ جرمنوں کو جتنا نقصان کنگ کانگ نے پہنچایا تھا شاید برطانوی فضائیہ فوج نہ پہنچا سکی ہوگی اسی سبب سے وہ یورپ کے سب ملکوں میں محبت اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ حفاظتی کیمپوں میں جا کر خود سری سے جس شخص کو چاہے آزاد کرا دے۔ میں نے اُس کی دیدہ دلیری کو یکسر پسند نہیں کیا لہٰذا اپنے مشتعل جذبات پر قابو پا کر میں نے بلند آواز میں کہا۔



میرے سامنے ایک ولندیزی شخص کو پیش کیا جس پر نازی جاسوس ہونے کا شک تھا۔

"اے۔ اِدھر میرے پاس آؤ۔"

اُس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ لڑکیوں کو چھوڑ کر اُس نے اپنے مضبوط کندھوں کو جنبش دی پھر اپنے سینے پر دائیں ہاتھ کی انگلی رکھ کر مجھ سے مخاطب ہو کر وہ بولا۔

"کیا تم مجھے بلا رہے تھے؟"

"ہاں میں تمھیں ہی بلا رہا تھا۔ ذرا میرے نزدیک آؤ۔"

پہلے تو اُس نے میرے نزدیک آنے میں کوتاہی دکھائی پھر تین قدم چل کر وہ قریب آکر رک گیا۔ اُس کے منہ سے کوئی لفظ نکلنے سے پہلے ہی میں نے اُس کی قمیض پر لگے ہوئے تین سنہری تمغوں کو اُنگلی سے چھو کر پوچھا۔

"تم کس فوج کے کپتان ہو؟"

اُس نے رُک رُک کر سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ یہ تمغے مجھے ڈچ اینڈ ٹیر فورسز نے عطا کئے ہیں۔ یعنی زمین دوز ولندیزی وطن پرست گوریلوں کے سردار نے۔

"اچھا یہ بات ہے" میں نے مذاقاً پوچھا "اور تم کون ہو؟"



لیم شمیم
کنگ کانگ

"بس" اُس نے حیران ہو کر پوچھا گویا اُس کا نام پوچھنا بھی ایک عجیب سوال تھا۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنے پرستاروں کی طرف تاکا پھر دوسرے لمحے غرا کر بولا۔

"میں کون ہوں" کرنا تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔ سُنو میں ولندیزی وطن پرست گوریلوں کے صدر مقام قلعہ دلوک میں رہائش رکھتا ہوں" اُس نے بھرپور سانس لیا جس سے اُس کی قمیص کے بٹن خود بخود کھل گئے "ہوں..... میں کِنگ کانگ ہوں، جس کا نام سُن کر جرمن فوجوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاتی ہیں"

"میں نے تو صرف ایک کِنگ کانگ کا نام سُنا تھا جو ایک بن مانس تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد اُس کی کھال میں بھُس بھر دیا گیا تھا۔ کیا تم وہ کنگ کانگ ہو؟" میں نے دوبارہ مذاق کے لہجے میں پوچھا۔

"پھوں" اُس کے پرستاروں نے ناک بھوں چڑھا کر آواز نکالی۔ جسے سُن کر اُس نے پیلے پیلے دانت نکالے۔ اب وہ واقعی بن مانس معلوم ہونے لگا۔ میرا ہاتھ ایک دم ریوالور کے دستے پر جا پڑا تاکہ اگر وہ جوش میں آکر مجھ پر حملہ کر بیٹھے تو میں اپنی خاطر خواہ حفاظت کر لوں کیوں کہ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے اپنے لمبے اور سخت گیر ہاتھوں میں لے کر سُرمہ بنا سکتا ہے لیکن مجھے پکڑنے کی بجائے وہ اپنی جگہ پر کھڑا غراتا رہا۔

موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے کہا۔

"ارے کنگ کانگ جب تم ولندیزی فوج میں کپتان کے عہدے پر سرفراز نہیں ہو۔ تو تمہیں ان تمغوں کو پہننے کا کوئی حق نہیں۔ یہ کہہ کر میں نے ہاتھ کی ایک ہی جنبش سے اُس کے سینے سے تمغے اتار دیئے۔ تمغے اُترنے کے بعد بجائے اِس بات کے کہ وہ اپنی ناگہانی ہتک اور آبرو ریزی کا مجھ سے بدلہ لینے کی غرض سے مجھ پر حملہ کرتا۔ وہ تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں اُس کے سامنے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی خوفناک عقاب کے مدمقابل کوئی ننھی منی چڑیا چوں چوں کر رہی ہو۔ میرے سُلوک

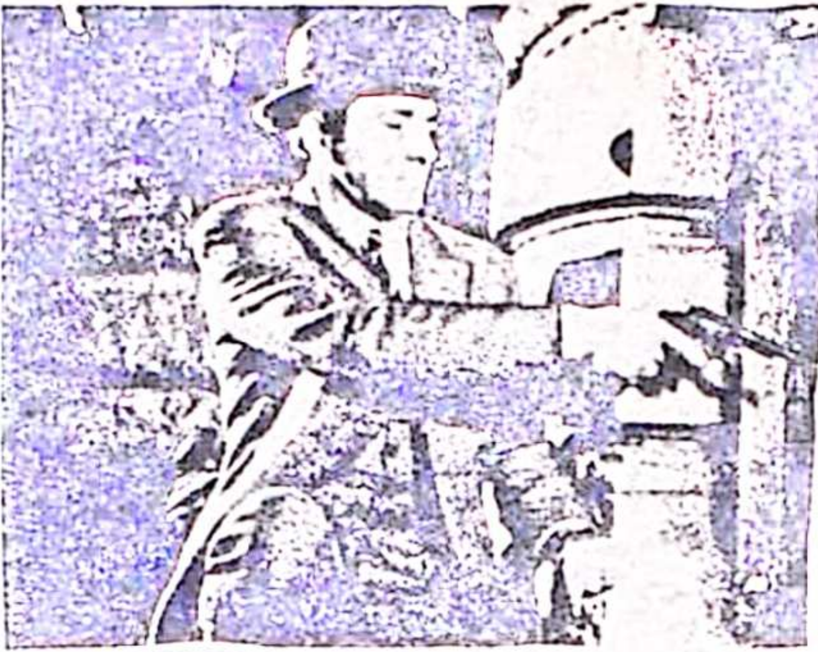
سے اُس کے اوسان خطا ہوگئے اور اُس کی ہیئت ہی بدل گئی۔ گویا وہ ایسے طالب علم کی مانند اُستاد کے سامنے کھڑا تھا جس نے اسکول کا کام نہ کیا ہو۔

چاروں طرف سکوت کا عالم طاری ہوگیا۔

کنگ کانگ منہ میں کچھ گنگناکر بولا۔

"میں اس واقعہ کی رپورٹ قلعہ وولوک کے حکام کے پاس ضرور کروں گا کہ تم عوام کے سامنے میرے ساتھ کس طرح پیش آئے تھے۔" کہتے ہوئے وہ کیمپ سے یوں چل پڑا جس طرح ایک کمزور کتا کسی بالا قد اور مضبوط کتے کو غراتے دیکھ کر اپنی دُم کو سکیڑ کر پچھلی دو ٹانگوں میں چھپاتے ہوئے اپنی راہ لے

اُس کے جانے کے بعد میں پہروں تذبذب میں پڑا رہا کہ میں نے جلد بازی میں آکر اُس کے احساسات کو کیوں مجروح کر دیا۔ اگر اُس نے اپنے سینے پر تمغے لگا رکھے تھے تو میری بلا سے اُس کا ایسا کرنے سے میرا کیا نقصان ہو رہا تھا۔ پھر یک بارگی ایک عجیب سے خیال نے میرے دماغ میں انگڑائی لی۔ کہ اس قدر جسیم اور سخت جان ہونے کے باوجود اُس نے میرے نفرت آمیز سلوک کو کیوں کر قبول کیا۔ سختیاں اور صعوبتیں جھیلنے کے باوجود وہ میرے سامنے چٹان کیوں نہ بن گیا۔ بلکہ بھیگی بلی کی مانند اس نے اپنے پرستاروں کے روبرو اپنا مضحکہ کیوں اُڑانے کا موقع دیا۔ پھر میرے سامنے سے اس طرح چلا گیا گویا کسی طالب علم نے غلط سوال سلیٹ سے مٹادیا ہو جس شخص کا ماضی قربانیوں سے تابناک ہو اُس کا اپنی بے عزتی کا بدلہ لئے بغیر میدان سے بھاگ جانا کچھ معنے رکھتا ہے۔



کنگ کانگ کے ڈر کی وجہ سے میں ہمیشہ ریوالور اپنے پاس رکھتا تھا

ان حالات کے ہوتے ہوئے میری چھٹی حس نے مجھے آگاہ کیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

شیف کے صدر مقام پر پہنچ کر میں نے اپنے نائب ولیم پیٹرسن کو فوراً طلب کیا۔ اُس کی ذہانت قابلِ ستائش تھی۔ اُس کا دماغ چلتا پھرتا انسائکلوپیڈیا تھا۔ اُسے اُن تمام جاسوسوں جو اتحادیوں کی جانب سے جرمن فوجوں پر شب خون مارتے تھے کے کارنامے الف سے یے تک یاد تھے۔ اُس جیسا ذہین شاید ہی اور کوئی آدمی ہوگا۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوا میں نے پوچھا۔

"ولیم! جس گوریلے کا نام کنگ کانگ ہے اُس کی بابت تمہارا ذہن کیا کہتا ہے؟"

ولیم نے اپنے دونوں ہاتھ میری میز کے کنارے پر ٹیک دیئے چند لمحے کے لئے اُس نے آنکھیں موند لیں گویا وہ یادداشت کے دریچوں سے جھانک کر کسی منظر کو دیکھ رہا ہو۔ کچھ دیر کے بعد وہ آنکھیں کھول کر بولا۔



میں نے لنڈا منز کے بارے میں اپنے نائب ولیم پیرسن سے مشورہ لیا

"اس کا اصلی نام کوسچین لنڈا منز ہے۔ اُس کی پیدائش روٹرڈم میں ہوئی اُس کا باپ موٹروں کی مرمت کیا کرتا تھا۔ ماہر پہلوانی اور مکے بازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے اُس نے مختلف بدمعاشوں کا خون بھی کیا تھا۔ سُنا جاتا ہے کہ بہت سی دوشیزائیں اُس کے گرد یوں گھومتی ہیں۔ جیسے شمع کے گرد پروانے منڈلاتے ہیں. کیا آپ لنڈا منز کے بارے میں کچھ اور سُننا چاہتے ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"وہ چار بھائیوں میں سب سے بڑا بھائی ہے سب کے سب گوریلے ہیں جو پکڑے گئے۔ اتحادی سپاہیوں کو جرمنوں کے چنگل سے بھاگنے میں مدد دیتے ہیں۔"

"کیا اِن بھائیوں میں سے کسی بھائی کی موجودہ جنگ میں موت واقع ہوئی؟"

یہاں پہنچ کر ولیم کی یاد داشت کمزور پڑ گئی وہ ایک الماری کی طرف گیا وہاں پڑی ہوئی فائلوں میں سے نیلے رنگ کی فائل کھول کر بولا۔

"اُن میں سے کسی بھائی کی موت نہیں ہوئی لیکن ایک بار سب سے چھوٹے بھائی کو جرمن جاسوسوں نے حراست میں لے لیا تھا۔ اس کے ہمراہ کیبرے کی ایک رقاصہ جس کا نام وِردلکا تھا گرفتار کر لی گئی تھی۔ دونوں مل کر جرمن فوجوں پر شبخون مارتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد حیران کن حالات میں دونوں کو نازیوں نے رہا کر دیا۔"

"دونوں کا کیا ہوا؟ میں نے تمھاری پوری بات نہیں سُنی" در اصل اُس وقت کنگ کانگ کے بزدلانہ الفاظ رہ کر میرے کانوں میں گونج رہے تھے "میں اس سلوک کی رپورٹ قاصہ ولوک کے پاس کروں گا۔"

"جرمنوں نے انھیں رہا کر دیا۔"

کیا کہا۔ جرمنوں نے انھیں رہا کر دیا۔ اِس کی کوئی خاص وجہ ہونا چاہیے ولیم! جرمن تو کسی گوریلے کو بلا وجہ چھوڑنے والے نہیں۔ بلکہ جب کبھی کوئی گوریلا اُن کے قابو پڑ گیا۔ وہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یہ لوگ وہاں سے کیسے رہائی پا گئے؟"

"لیکن جناب فائل میں یہی درج ہے کہ دونوں کو رہا کر دیا گیا۔ آگے چل کر اس فائل میں لکھا ہے کہ چند روز بعد شب خون مارتے ہوئے لنڈا منز بھی پکڑا گیا۔ اُس وقت اس کے دائیں پھیپھڑے میں گولی لگی ہوئی تھی جونہی اُس کے ساتھیوں کو اُس کی گرفتاری کا علم ہوا انھوں نے جان پر کھیل کر اُسے قید خانے سے چھڑا لیا۔"

"کیا اس شب خون میں بہت سی جانیں تلف ہوئی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں قید خانے کا سنتری موت کے گھاٹ اُتار گیا اور گیارہ اشخاص سخت زخمی ہوئے اگرچہ لنڈا منز

اپنے بھائی اور رقاصہ کے ہمراہ بچ نکلا۔ آیا بعد میں ایک رپورٹ سے پتہ چلا ہے کہ اس جدوجہد میں چالیس گوریلے شہید ہوئے ہے۔

"گویا اس حملے کا پتہ جرمنوں کو پیشتر ہی معلوم تھا" میں نے یہ الفاظ بڑی دھیمی آواز میں منہ سے نکالے۔

ولیم نے حیرت سے میری طرف تاکا وہ فوراً تاڑ گیا کہ میرے خیالات کی روانی کس سمت ہے۔

"لنڈامنز کی فائل مجھے دے دو شاید آنے والے وقت میں میں اس فائل میں مزید صفحے جمع کر سکوں۔ کل صبح میں بروسلز روانہ ہو رہا ہوں" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے ولیم سے کہا۔

بروسلز پہنچ کر مجھے لنڈامنز کے مداحوں کو ڈھونڈنے میں ذرا بھی کوفت نہ ہوئی۔ ہالینڈ میں ہی نہیں۔ بیلجیم میں بھی اُس کے عقیدت مندوں کی کمی نہ تھی بلکہ لوگ اسے دوست کے نام سے پکارنا فخر سمجھتے تھے اُن لوگوں کے بتائے ہوئے واقعات سے میں ایک موٹی کتاب تصنیف کر سکتا تھا۔ لیکن اِن واقعات میں مجھے کہیں بھی روشنی کی جھلک نظر نہ آئی۔ مجھے اُن لوگوں کی تلاش نہ تھی جنھوں نے کنگ کانگ کے ساتھ فرصت کے لمحات گذارے تھے بلکہ میں اُن اشخاص سے ملنا چاہتا تھا جنھوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر اُس کے ہمراہ جرمن ٹھکانوں پر شب خون مارنے میں خاطر خواہ حصہ لیا ہو۔ آخر کار میری محنت پھل لائی میں نے ایسے آدمی کو ڈھونڈ ہی لیا جس کی مجھے تلاش تھی۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے سے میں نے بھانپ لیا کہ اِس شخص نے واقعی کنگ کانگ کے ساتھ کام کیا ہوگا۔

"کیا تم اُن خوش قسمتوں میں سے ایک ہو جو کنگ کانگ کے ہمراہ جرمنوں کی قید سے بھاگ نکلے تھے؟"

"نہیں میں اُس پارٹی میں نہ تھا۔ میں ایک ماہ بعد اُس قید خانے سے بھاگا" یہ کہہ کر اُس نے میلی ٹوپی اُتار کر اپنے سر کے زخم دکھائے جو ابھی تک پوری طرح مندمل نہیں ہوئے تھے۔

"تم بڑے خوش قسمت نکلے" میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اُس رات چاروں طرف اندھیرے کی سیاہ چادر بچھی ہوئی تھی سرد ہوائیں جسم کو چیر رہی تھیں ہم چار گوریلے دیوار پھاند کر بھاگ نکلے۔ اگر ہم گرفتار ہو جاتے تو آج میں آپ کے سامنے باتیں کرتا نہ ہوتا۔

"لیکن تمہیں یہ واقعہ کیوں کر پیش آیا؟"

"ہم ایک پُل کو اُڑانے کے لئے ڈائنامیٹ لگا رہے تھے کہ غلطی سے بجلی کی تار میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اُسے ڈھونڈنے کے لئے میں نے ٹارچ کی روشنی کی معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے اس کام کی خبر جرمنوں کو پیشتر ہی پہنچ چکی تھی ہمیں پکڑنے کے لئے انھوں نے اپنے سپاہی پُل کے قریب تعینات کر رکھے تھے۔ روشنی دیکھتے ہی سپاہیوں نے بندوق کی گولیاں داغ دیں ایک گولی میرے بالوں میں سے ہو کر آگے نکل گئی درد کے مارے لوہے کے شہتیر سے میرے ہاتھ چھوٹ گئے میں دھم سے دریا کی ریت میں جا گرا۔ پھر وہاں سے بھاگ کر دریا کے پانی میں غوطہ مار کر دوسرے کنارے جا نکلا مگر وہاں موت بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی جوں ہی میں پانی سے باہر نکلا دشمن نے اپنے پنجے میں جکڑ لیا۔ یہاں یہ بات بتا دینا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارا قائد کنگ کانگ دشمن کی گولیوں سے صاف نکل آیا۔ گویا اُس کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے لئے دشمن کے اسلحہ خانے میں ابھی کوئی گولی نہ تھی"

بیلجیمی وطن پرست کی باتیں سُن کر میں حیرانگی کے سمندر میں ڈوب گیا۔ میرے ذہن میں کئی قسم کے خیالات اُبھرنے لگے جب کنگ کانگ دو بار نازیوں کے پھندوں میں پھنس گیا تو وہاں سے کسی طرح بچ آیا۔ دیا گوریلے کس طرح موت کا نوالہ بنے اس کے علاوہ اُس نے نازی فوجوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ پھر بھی اُس کے پرستار شمع کے پروانوں کی مانند اُس کے گرد منڈلاتے رہتے جسم کی مضبوطی اور ڈیل ڈول کی وجہ سے اُس کے ساتھی اُس کے سامنے کھلونے معلوم ہوتے لیکن جب میں نے اُس کے سینے پر لگے ہوئے تمغوں کو ایک لمحے میں اُتار کر پرے پھینک دیا اُس وقت اُس کی جرأت اور بہادری کہاں چلی گئی مجھ جیسے عام قد کے آدمی کے ہاتھوں مفت میں ہزیمت اُٹھائی۔

یہ خیال میرے دماغ میں تیش زنی کر رہا تھا۔

میں نے بیلجیمی کو طرح دیتے ہوئے آخری سوال پوچھا۔

"اس سوال میں کتنی صداقت ہے کہ کنگ کانگ نوجوان عورتوں کی صحبت بہت پسند کرتا ہے؟"

میرا سوال سُن کر وہ مسکرا دیا پھر اپنی بائیں کنپٹی پر کھجلی کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کا اندازہ بالکل بجا ہے ہالینڈ اور بیلجیم کی دوشیزائیں اُس کے نام پر مرمٹنے کے لئے تیار رہتی ہیں.... اُنھوں نے گوریلوں کے امدادی فنڈ میں لاکھوں روپئیے کے ہیرے جواہرات اور زیورات کنگ کانگ کے حوالے کئے ہیں اسکے علاوہ اُسکے ساتھ شب گزارنے کا فخر بھی حاصل کرتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر لائیفن کی پہاڑی کی دوسری جانب ایک قلعہ ہے وہاں ایک امیر زادی رہتی ہے جس نے کنگ کانگ کو بے انتہا دولت دی ہے تاکہ وہ اُس دولت کو دشمنوں کے خلاف استعمال کرے۔"

"اُس امیر زادی کا نام کیا ہے؟"

تھوڑی دیر تک اُس نے اپنے حافظے پر زور دیا لیکن پھر معذرت کے ساتھ بولا۔

"مجھے اُس کا نام یاد نہیں۔"

جب انٹرویو ختم ہوا میں ایک دم اُس امیر زادی کی رہائش کی جانب اپنی کار کا رُخ کیا تاکہ اُس سے مل کر میں کنگ کانگ کے بارے میں مزید حالات معلوم کروں۔ خوش قسمتی سے امیر زادی اپنی قیام گاہ میں ہی تھی جب میں نے اُسے اپنا شناختی کارڈ دکھایا تو اُس نے مجھے خوش آمدید کہا۔ اُس کے ساتھ بات چیت کے دوران پتہ چلا کہ واقعی اُس نے وطن پرست تخریب کاروں کی مدد کے لئے کنگ کانگ کو بھاری رقوم دی تھیں لیکن بعد میں پتہ چلا کہ کنگ کانگ نے وہ رقوم خورد برد کر دیں۔

جب میں نے اُسے اِس الزام پر روشنی ڈالنے کے لئے کہا تو وہ ہنس کر بولی۔

"کرنل صاحب رہنے دیجئے اِن سوالات کو۔ آخر کار اُس نے مادرِ وطن کے لئے کیا کیا سختیاں نہیں جھیلیں۔ لیکن ایک بات میں آپ سے نہیں چھپا سکتی۔ ایک دن میں بازار میں سے گزر رہی تھی کہ میں نے ایک نوجوان لڑکی کو جوہری کی دکان پر کھڑے دیکھا اُس کے ہاتھ میں جواہرات کا وہ ہار تھا جو میں نے کنگ کانگ کو بطور چندہ دیا تھا جب میں نے اُس لڑکی سے پوچھا کہ اُس نے وہ ہار کہاں سے حاصل کیا تو وقت ضائع کئے بغیر اُس نے کہا کنگ کانگ سے۔"

"کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ اُس نوجوان لڑکی کا کیا نام ہے؟" میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"اس کا نام میا زلیت ہے۔ ذرا ٹھہریئے اُس

کے ساتھ ایک دوسری لڑکی بھی تھی اُس کا نام۔۔۔۔۔
ہاں یاد آیا اُس کا نام مارگیبر تھا دیلون تھا۔"

خوش قسمتی سے امیرزادی نے میرے چہرے کی طرف نہیں دیکھا ورنہ وہ فوراً بھانپ جاتی کہ اُن لڑکیوں کا نام سُن کر میرے چہرے پر کیا رد و بدل ہوا۔ ان لڑکیوں کے نام میری فائل میں موجود تھے کیوں کہ وہ مشتبہ چال چلن کی مالک تھیں۔ اُن کا نام سُن کر میں نے امیرزادی سے جانے کی اجازت مانگی اور ایک دم میں بروسیلز واپس آگیا وہاں سے میں نے اینٹرپول کے اینٹلی جنس ہیڈ کوارٹرز کو ٹیلی فون کیا تاکہ اپنے نائب ولیم سے رابطہ پیدا کرکے پوچھوں کہ کیا اُس کے پاس میازیست اور مارگیرتھا دیلان کے پتے ہیں اُس نے چند منٹوں میں اُن کے پتے بتا دیئے۔ اِس کے بعد میں ڈچ اینٹلی جنس کے چند افسروں کے ہمراہ میازیست کے مکان پر پہنچا اُس کا فلیٹ خالی تھا۔

پرندہ پنجرے سے اُڑ چکا تھا۔

بجلی کی تیزی کے ساتھ ہم مارگیرتھا کے گھر گئے اُس کے مکان کا صدر دروازہ اندر سے بند تھا ہم نے بہتیرا کھٹ کھٹایا مگر اندر سے کوئی جواب نہ ملا ایک پڑوسی نے ہمیں بتایا کہ مارگیرتھا مکان کے اندر ہی ہے کیوں کہ اس نے صرف پندرہ منٹ پہلے اُسے پلنگ پر بیٹھے دیکھا تھا۔ اگرچہ اُس کے گھر میں داخل ہونے کے لئے ہمارے پاس کوئی وارنٹ نہ تھا پھر بھی دیدہ دلیری سے ہم دروازہ توڑ کر مکان میں داخل ہوئے مارگیرتھا پلنگ پر دراز تھی اُس کی نیم وا آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اُس نے زہر کھا لیا ہے۔ نبض دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ابھی اُس میں زندگی کے آثار تھے ہم اسے اپنی کار میں لٹا کر نزدیکی ملٹری ہسپتال میں لے گئے مگر اُس نے راستے میں ہی دم توڑ دیا۔

اِن دونوں لڑکیوں کو میری آمد کا کس طرح علم ہوگیا میں یہ عقدہ آج تک حل نہ کر سکا۔

بروسیلز میں چند یوم رہ کر میں نے لنڈا منز کے بارے میں مزید شہادتیں اکٹھی کیں ایک شخص نے مجھے بتایا کہ جب اُس کا بھائی نازیوں کی حراست میں لے لیا گیا تو وہاں اُسے ایک وطن پرست گوریلے نے بتایا کہ کنگ کانگ کے سر پر بھاری قرضہ ہے کیوں کہ اس قید میں ایک ایسا گوریلا اور بھی تھا جو اس قرضے کے راز کو بخوبی جانتا تھا چوں کہ وہ گوریلا کنگ کانگ کے مداحوں میں سے تھا اس لئے اُس نے راز کو پردے میں رہنے دیا لیکن اب لنڈا منز کی چند حرکتیں اُسے پسند نہ آئیں لہٰذا اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے اس نے راز اُگل دیا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ کیبرے کی رقاصہ وِردنکا کافی عرصے تک اُس کی داشتہ رہی۔ جب کنگ کانگ اُس کا چھوٹا بھائی اور وِردنکا نازیوں کے پھندوں میں پھنس گئے تو بغیر کسی ایذا رسانی کے وہاں سے وہ کسی طرح بھاگ آئے اور آزاد ہونے کے بعد اُس نے اپنے تمام سابقہ قرضے چُکا دیئے۔ اِس کے برعکس اب وہ گوریلوں کو لیکر بے خوفی سے اُن پر شب خون مارتا اُن کے تیل کے ذخیروں کو نذرِ آتش کرتا اُس کے بیسیوں نڈر اور بے باک ساتھی موت کی گود میں چلے جاتے لیکن کنگ کانگ کا بال بیکا نہ ہوتا۔ اُس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ وہ خداداد طاقت کا مالک ہے تبھی تو وہ ہر موقع سے صاف نکل جاتا تھا۔

اِن حالات کے پیشِ نظر کسی شخص نے اُس کے کردار کو شک و شبہ کی نظر سے نہ دیکھا کہ اُس کے قدم کس سمت اُٹھ رہے ہیں۔ بلکہ ہر حملہ کے بعد اُس کا زندہ لوٹنا اُس کے پرستاروں کی تعداد میں اضافہ کرتا تھا۔

جو جوانی کے نشے میں اندھے ہو کر نازیوں کی گولیوں کا شکار بنتے اور کنگ کانگ ہیرو کا لبادہ اوڑھے نظر آتا۔

میں نے اِس مسئلے پر خوب غور و فکر کیا پھر اِس نتیجے پر پہنچا کہ لِنڈا منز غدار ہے اتحادی فوجوں کا اس بات میں فائدہ ہے کہ اُسے جلد از جلد گرفتار کر لیا جائے تاکہ وہ انھیں مزید نقصان نہ پہنچا سکے۔ میں نے قلعہ وِلُوک میں تعینات ڈچ اینٹلی جنس ہیڈکوارٹرز کو پیغام ارسال کیا کہ میں کسی خاص مسئلے پر کنگ کانگ کی صلاح لینا چاہتا ہوں اس لئے میری اور اُس کی ملاقات کا انتظام کیا جائے۔ جب وہاں سے مسئلے کی نوعیت پوچھی گئی تو میں نے ٹال مٹول کیا۔ کیوں کہ میں بخوبی جانتا تھا کہ کنگ کانگ کے بہی خواہ اور پرستار ہر جگہ موجود ہیں اگر اُسے میرے اصلی ارادوں کا پتہ چل گیا تو کام بگڑ جائے گا۔ اس لئے میں نے صرف اتنا کہا کہ وہ مجھے بروسیلز کے مشہور و معروف ہوٹل پیلیس میں اگلے دن گیارہ بجے ملے۔ اس ہوٹل میں شیف کے بیشتر حکام قیام پذیر تھے۔

اگلے روز میں پونے گیارہ بجے ہوٹل کے مخصوص کمرے میں پہنچ گیا جہاں ہماری ملاقات ہونا تھی میں کُرسی پر بیٹھا اُس کا انتظار کرنے لگا۔ میرا دایاں ہاتھ کوٹ کی بیرونی جیب میں پڑے ہوئے ریوالور پر تھا کہ کہیں کنگ کانگ طیش میں آکر کچھ کر نہ بیٹھے اُس کے جسم اور میرے وجود میں زمین آسمان کا فرق تھا اُس کے سامنے میں چڑیا کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔

گیارہ بج گئے لیکن کنگ کانگ نہ آیا۔ گھڑی میں منٹوں کی سوئیاں کھسک رہی تھیں سوا گیارہ .... ساڑھے گیارہ ..... آخر کار بارہ بج گئے۔ کنگ کانگ کا کچھ پتہ نہ تھا کہ اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور لنڈ ریزی فوج کے دو نوجوان کپتان اندر داخل ہوئے سیلوٹ دے کر ایک کپتان یوں گویا ہوا:

”جناب غالباً آپ لنڈا منز کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”ہاں میں ایک گھنٹے سے اُس کا منتظر ہوں۔“

”ہمیں بہت افسوس ہے کہ جناب کو بے فائدہ انتظار کرنا پڑا آج وہ یہاں نہیں آسکتا کیوں کہ اُسے کچھ خاص احکام ملے ہیں۔“

”خاص احکام ملے ہیں کس شخص نے اُسے احکام دیئے ہیں؟“ میں غصّے میں تلملا اُٹھا۔

میرا غصہ دیکھ کر کپتان چند قدم آگے بڑھ کر بولا ”آج صبح وہ خاص کام کرنے کے لئے روانہ ہو چکا ہے اس لئے آپ کو مفت میں انتظار کرنا پڑا۔“

میرے غصّے کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اگر آج ہماری ملاقات ہو جاتی میں اُسے ایک قدم بھی بڑھانے نہ دیتا۔ اُس کی غدّارانہ کارروائیوں کو طشت از بام کر دیتا۔ آج وہ مجھ سے ہی نہیں بچ نکلا بلکہ اُس نے اپنے دوستوں عزیزوں اور دیگر حب الوطنوں کے لئے موت کے نئے سامان پیدا کر دیئے تھے۔

تین روز کے بعد کیا ہوا یہ دُنیا پر روز روشن کی مانند عیاں ہے۔ ۱۷ ستمبر کی صبح کو برٹش فرسٹ ائیر بورن ڈویژن کے دس ہزار سپاہی آرنہم میں چھاتوں کے ذریعے اُتارے گئے۔ ۲۰ ہزار امریکی اور تین ہزار پولش سپاہیوں نے گریو اور نجمے گن کے علاقوں میں ہوائی جہازوں سے چھلانگیں لگائیں۔ ان سپاہیوں کا کام مایسلنال اور دریائے وال کے رقبوں میں جرمن صفوں میں ہیجان پیدا کر کے اُن کی اہم چوکیوں پر قبضہ کرنا تھا۔ اس حملے کا خفیہ (کوڈ) نام ”آپریشن مارکیٹ گارڈن“

تھا۔ اِس عملے کو اس قدر پردہ راز میں رکھا گیا کہ ہوائی جہازوں کے پائلٹوں اور چھلانگ لگانے والوں کو اپنی منزل کا پتہ اُس وقت چلا جب وہ محوِ پرواز تھے یہ پیغام اُن کو وائرلیس کے ذریعے دیئے گئے۔ سولہ ستمبر کی شام تک خفیہ اطلاع کے مطابق ان علاقوں میں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے سوا کسی جگہ بھی جرمن فوجیں بھاری تعداد میں موجود نہ تھیں لیکن یوں ہی رات کے اندھیرے چاروں طرف بسیرا کرنے لگے۔ جرمن پنیتر زڈویژن کے سپاہی ان علاقوں میں ٹڈی دل کی مانند چھاگئے۔ آنے والے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے کی غرض سے اپنے اپنے اسلحوں میں آتشیں مادہ بھرلیا۔ جوں جوں بہادر چھاتہ بردار زمین پر اُترتے گئے۔ جرمنوں کی گولیوں کی خوراک بن کر ملکِ عدم روانہ ہوتے گئے۔ ۳۳ ہزار جوان مردوں میں سے صرف دو ہزار چار سو سپاہی بچ نکلے۔

جب جنرل مونٹگمری کو اِس ناگہانی تباہی کا علم ہوا تو وہ سر تھام کر رہ گیا کیوں کہ اُس نے آج تک اتنی بڑی شکست کا کبھی خیال تک نہ کیا تھا۔ اُس کے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق یورپ میں جنگ صرف چند روز تھی اُس کے بعد دنیا میں امن اور شانتی کا دور دورہ تھا۔

تباہی کا حال سُنتے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

اس حادثے کی جب پوری روئداد میرے کانوں میں پہنچی تو مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو اس ذلت آمیز شکست کے پیچھے لنڈا منز کا ضرور ہاتھ ہے اسی اثنا میں میرے سامنے ایک ولندیزی نوجوان کو پیش کیا گیا جس پر نازی جاسوس ہونے کا شک تھا۔ اُس کا نام ورنر تھا۔ جب میں نے اُس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے تاکا تو وہ اُن کی تاب نہ لاکر کہنے لگا۔

”آپ مجھے کوئی سزا نہ دیں کیوں کہ میں بڑے کام کا آدمی ہوں۔“

”ہوں! تم کام کے آدمی ہو! اچھا یہ بتاؤ تم ہمارا کیا کام کر سکتے ہو؟“

”مجھے اُن سب جاسوسوں کے نام معلوم ہیں جو آپ کی جانب سے جرمن فوجوں کے درمیان جاسوسی کرتے ہیں۔“

”مثلاً؟“

”پال لاؤوین۔ ڈیمپ ریجنہ۔ چارلیس گلونڈی اور مریتا گاوین......“

میں بیلجیم اور ہالینڈ میں اپنے خاص جاسوسوں کے نام سُن کر حیران و ششدر رہ گیا۔ میرا حلق سوکھنے لگا پھر اپنے آپ پر قابو پا کر میں نے اُس سے پوچھا۔

”تمھیں اِن افراد کے نام کس شخص سے معلوم ہوئے؟“

”جرمن اینٹلی جنس کے کرنل کیس ویٹر سے۔“

لیکن کرنل کیس ویٹر کو اِن ناموں سے کیوں کر واقفیت ہوئی۔

یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ کیا اس کا جواب لینے کی خاطر آپ میرے ساتھ سودا کرنا گوارا کریں گے۔

میں اُس کی بات سُن کر تذبذب میں پڑ گیا کہ اُسے کیا جواب دوں کہ میری چھٹی حِس نے مجھے آگاہ کیا کہ یہ وقت سودے بازی کا نہیں بلکہ سخت گیر سُلوک کا ہے۔ میں نے ریوالور کو اُس کی طرف کر کے کہا۔

”اپنی بکواس بند کرو۔ میں تمہارے جیسے بزدل کے ساتھ کسی قسم کا سودا نہیں کروں گا۔“

میری دھمکی کام کر گئی ریوالور کو دیکھتے ہی وہ گھبرا کر بولا۔

"ذرا رکئے میں ابھی بتاتا ہوں۔ اُس کا نام کرسچین لنڈامنز ہے۔ جسے عوام کنگ کانگ کے نام سے پکارتے ہیں۔"

لنڈامنز کے خلاف تحقیقات کی آخری کڑی مجھے مل گئی۔ "کیا کنگ کانگ نے آرنہم میں اُترنے والے اتحادی چھاتہ برداروں کی خبر جرمنوں کو پیشتر مہیّا کی تھی؟"

ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اُس نے جواب دیا۔

"جی ہاں اس نے ۱۵ ستمبر کو ہی کرنل کیسویٹر کو بتا دیا تھا کہ برطانوی اور امریکی سپاہی آرنہم کے مختلف علاقوں میں چھلانگ لگائیں گے۔..... اب آپ مجھے ریوالور کا نشانہ نہ بنائیں۔"

میں اُس کی سادگی اور بزدلی پر ہنس پڑا۔ ریوالور کو جیب میں رکھ کر میں نے اُسے کہا۔

"میرے ساتھ چلو"

جاسوسیات کے فن میں سالوں کام کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسان کو جذباتی ہونا بہت خطرناک ہے۔ لیکن اس بار میں غصّے کے مارے کانپنے لگا۔ میں نے متعلقہ حکام کو پیشتر آگاہ کر دیا تھا کہ گذشتہ واقعات کے پیش نظر کنگ کانگ کو کوئی فوجی کام سونپنا آگ کے ساتھ کھیلنا ہے لیکن میری پیش بندی کی پرواہ کئے بغیر انھوں نے اُسے دوبارہ آرنہم کے مورچے پر روانہ کر دیا۔ جس کا نتیجہ ہزاروں اتحادی جانبازوں کی موت نکلا۔

اب میرے سامنے صرف یہی سوال تھا کہ لنڈامنز کو کیوں کر حراست میں لے کر کیفر کردار کو پہنچایا جائے۔ میں ایک دم ڈچ انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹرز کی طرف روانہ ہو گیا وہاں جا کر میں نے دیکھا کہ کچھ افیسر آرام کرسیوں پر بیٹھے جام نوش کر رہے ہیں۔

میرے واقف کار افیسر نے مجھے اضطراب میں دیکھ کر پوچھا۔

"ارے پنٹو۔ آج تم گھبرائے ہوئے کیوں نظر آ رہے ہو۔ تم تو سفید چادر کی مانند معلوم ہوتے ہو۔"

اُس کا سوال سُن کر میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے میز پر مکّہ مارتے ہوئے کہا بکواس بند کرو۔ میں نے تمھیں پہلے بھی کئی بار بتلایا تھا کہ مجھے اُس بدمعاش کنگ کانگ پر دشمن کا جاسوس ہونے کا پورا شک ہے۔ لیکن آپ لوگوں نے میری بات پر کچھ دھیان نہ دیا بلکہ اسے دوبارہ اہم کام پر روانہ کر دیا جس کی وجہ سے ہزاروں اتحادی فوجی موت کا نوالہ بن گئے۔"

میری بات سُن کر سب افسروں کے منہ کھُلے کے کھُلے رہ گئے۔

"سنو تم میں سے دو آفیسر فوراً قلعہ وڈوک جاؤ اور کنگ کانگ کو حراست میں لے کر میرے سامنے پیش کرو۔

"لیکن اُسے گرفتار کرنا اتنا آسان نہیں جتنا تم خیال کرتے ہو۔ اُسے حراست میں لینے سے مقامی نوجوانوں کے جذبات مشتعل ہو جانے کا خطرہ ہے کیوں کہ وہ اسے کسی ہیرو کی طرح پوجتے ہیں۔" میرے واقف کار افیسر نے کہا۔

"وہاں جا کر اُسے بتاؤ کہ اُس کی بہادری کے صلے میں اُسے اتحادی فوجوں کی جانب سے اعزاز بخشنے

جائیں گے۔ لیکن یہاں لانے سے پہلے اُسے غیر مسلح کر لینا نہایت ضروری ہے۔ پھر اُسے غیر فوجی لباس پہنا کر میرے پاس لے آؤ اتنے میں حثیت کے حکام کو ٹیلی فون کر کے ملٹری پولیس کے دس ہٹے کٹے سپاہیوں کو بلواتا ہوں۔ جو مسلح ہو کر کمرے میں پردے کے پیچھے کھڑے ہوں گے جونہی وہ ناہنجار کمرے میں داخل ہو گا اُس پر قابو پا کر اُسے حراست میں لے لیں گے۔"

جیسا میرا خیال تھا ویسا ہی ہوا۔ کنگ کانگ کو یوں ہی معلوم ہوا کہ اُس کی "سرفروشانہ" خدمات کے بدلے اُسے اعزازات سے نوازا جائے گا۔ وہ خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا۔ وقت ضائع کئے بغیر اُس نے اپنے آپ کو ایک دم غیر مسلح کر کے سویلین لباس پہن لیا۔ وہ جوں ہی اُس کمرے میں داخل ہوا جہاں اُس کی "عزت افزائی" کے سامان مہیا کئے گئے تھے۔ پردے کے پیچھے چھپے ہوئے سپاہیوں نے عقاب کی مانند جھپٹا مارا اور اُسے زمین پر گرا کر مضبوط رسّوں سے اُس کی مشکیں کس لیں۔ جب اُسے رائل ائیر فورس کے جہاز پر سوار کرایا گیا اُس کی ٹانگیں بھی بندھی ہوئی تھیں۔ کیوں کہ خطرہ تھا کہیں وہ جہاز ہی سے کود کر جاں بحق نہ ہو جائے۔

انگلینڈ پہنچتے ہی کنگ کانگ کو لندن سے باہر کسی گاؤں کے فارم ہاؤس میں قید کر دیا گیا۔ اُس فارم ہاؤس کے چاروں طرف کڑا فوجی پہرہ لگا دیا گیا دو ہفتے تک وہ برطانوی فوجی خفیہ سروس کے تجربہ کار اور منجھے ہوئے حکام کی پوچھ تاچھ کا مرکز بنا رہا۔ جب پوچھ تاچھ پایۂ تکمیل تک پہنچ گئیں تو اُسے واپس ہالینڈ لے جا کر بریڈا جیل خانے میں بند کر دیا گیا اُس کا دیا ہوا بیان ۴۲ فل سکیپ کاغذات پر مشتمل تھا۔

اُس کے بیان کے مطالعے سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی غداری کی داستان ۱۹۴۳ء سے شروع ہوئی جب گوریلا لیڈر کی حیثیت سے اُس کی شہرت ہالینڈ کے عام و خاص کی زبان پر تھی۔ شہرت کے نشے میں مست ہو کر وہ اپنی ہمّت سے زیادہ خرچیلا ہو کر قرضے کے بوجھ کے نیچے دب گیا کیوں کہ ان گنت عورتوں کے ساتھ اُس کا معاشقہ تھا۔ اُن کی ضروریات پوری کرنے کی وجہ سے اُس کا بال بال قرضے میں پھنس گیا اب اُس کا دھیان امیر عورتوں کی طرف ہوا جن سے وہ اپنے گوریلوں کے لئے اسلحہ خریدنے کے لئے چندہ مانگتا۔ جنھوں نے اُس کی دلیری شجاعت اور سرفروشی سے متاثر ہو کر اپنے قیمتی زیورات اور جواہرات ہنسی خوشی ... اُس کے حوالے کر دئیے۔ اسلحہ جات خریدنے کی بجائے اُس نے تمام چندہ کیبرے کی رقاصاؤں اور بدچلن عورتوں کی نذر کر دیا۔ اگر کسی عورت نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے اِن جواہرات کو کہاں سے حاصل کیا تو وہ اُس کی چٹکی بھر کے کہتا "ظالم نازیوں کا خزانہ لوٹ کر لایا ہوں"

فروری ۱۹۴۴ء میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے حالات نے ایک عجیب سی کروٹ لی۔ جرمن خفیہ سروس کے ایجنٹوں نے ایک ایسے مکان پر چھاپہ مارا جو جانبازوں اور ولندیزی وطن پرست گوریلوں کی کمین گاہ تھا۔ اس چھاپے میں کئی جانبازوں کے علاوہ کنگ کانگ کا چھوٹا بھائی کیبرے کی رقاصہ وردنگا بھی اُن کے ہاتھ پڑی۔ رقاصہ وردنگا پر کنگ کانگ صدق دل سے فدا تھا۔ جب کبھی وہ نازی ٹھکانوں پر



جب مجھے معلوم ہوا کہ کنگ کانگ کو خاص احکام ملے ہیں تو میں غصے سے تلملا اٹھا

شب خون مار کے لوٹتا تو وہ شب گذاری کے لئے اُس کا مہمان بنتا اور اس دل جوئی کے بدلے وہ اُسے قیمتی تحفوں سے لاد دیتا۔

عام طور پر دیکھا گیا کہ اگر کسی شخص کا کوئی عزیز کسی ناگہانی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو وہ شخص اُس عزیز کو مصیبت سے آزاد کرانے کے لئے بے تاب ہو کر سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ جب کنگ کانگ کو اپنے بھائی اور داشتہ کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا تو انھیں موت کے مُنہ سے نکالنے کے لئے اسے شاطرانہ چال چلنے کا خیال سوجھا۔ وہ ایسے دو ولندیزی گوریلوں کو جانتا تھا جو نازیوں کی خفیہ سروس کے سرکردہ رُکن تھے۔ اُس نے اُن کے ساتھ رابطہ پیدا کر کے فیصلہ کیا کہ اگر نازی وردنگا اور اُس کے بھائی کو بغیر کوئی گزند پہنچائے آزاد کر دیں تو وہ آئندہ کے لئے اتحادی صفوں میں جرمن جاسوس کا پارٹ ادا کرے گا۔

اُن کی رہائی ولندیزی باشندوں کو بہت مہنگی پڑی کیوں کہ کنگ کانگ کی غدارانہ کارروائیوں کی وجہ سے روٹرڈم کے ۲۵ ہزار نوجوان گوریلے ایک ہی رات میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

اب لنڈا منز باقاعدگی سے نازیوں کا تنخواہ دار بن گیا۔ جس کے بدلے وہ شب خون مارنے سے پیشتر تمام پروگرام اپنے نازی آقاؤں کے گوش گذار کر دیتا۔ جونہی اُس کے نڈر اور بہادر گوریلے اپنے شکار پر جھپٹتے شکار اُن کو پیس کر رکھ دیتا۔ یہی حال آرنہم کے علاقہ میں ہزاروں پیراشوٹ سے اُترنے والے برطانوی امریکی اور کناڈی سپاہیوں کا ہوا کیوں کہ کنگ کانگ نے

اِس مہم کی تمام اسکیم کرنل کیس ویرٹر کو بتادی تھی۔ اِس غداری کا اُسے کیا معاوضہ ملا۔ اِس پر تاریخ خاموش ہے۔

۱۹۴۴ء کے کرسمس کے تہوار کے روز میں ایک دم سخت بیمار ہوگیا اِس لئے مجھے تین ماہ تک لندن میں ٹھہرنا پڑا۔ اِنھیں دنوں لندن سے شائع ہونے والے اخباروں نے خبر شائع کی کہ کوئی ولندیزی افسر غداری کے الزام میں ٹاور آوف لندن میں مقید ہے اِس خبر نے چاروں طرف سنسنی پھیلادی۔ میں نے بستر علالت سے برطانیہ کے چیف سینز سے درخواست کی کہ ایسی خبریں شائع کرنے والے روزناموں پر سخت پابندی لگادی جائے ورنہ یورپ کے اتحادی ملکوں میں شک وشبہ پھیلنے کا خطرہ پیدا ہوجائے گا۔ چوں کہ میری بات معقول تھی اُس پر عمل کر کے اخباروں پر پابندی لگادی گئی۔

۱۹۴۵ء کے آخری مہینوں میں یورپ میں جنگ کے بادل چھٹ گئے اور مطلع صاف ہوگیا۔ ہالینڈ کی حکومت نے سکیو ٹے نجن کے جیل خانے میں اُن سب غداروں کو اکٹھا کر دیا۔۔۔۔ جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر نازیوں کے ساتھ تال میل کر کے ہزاروں بلکہ لاکھوں وطن پرستوں کو موت کی وادی میں دھکیلنے کا باعث بنے تھے۔ اِن غداروں میں کرسچین لنڈا منز عرف کنگ کانگ بھی تھا۔

کئی مہینوں کی قید کی تکلیفوں اور صعوبتوں کی وجہ سے کنگ کانگ کی صحت اِس قدر گر چکی تھی کہ وہ پہچانا بھی نہیں جاتا تھا۔ اُس کی کھال جسم پر یوں لٹک رہی تھی گویا کسی شخص نے ڈھیلا چغہ پہن رکھا ہو۔ جیل کے ڈاکٹروں کے اُس کی ٹانگ کے زخم میں آرام نہ آنے کی وجہ سے اندازہ لگایا کہ اُسے ٹی بی دق کا مرض لاحق ہوگیا ہے اور اُس پر فالج نے ہلکا حملہ کیا ہے اِس لئے اُسے قید خانے سے نکال کر جیل کے ہسپتال میں بند کر دیا تاکہ اُسے خاص ادویات دے کر جلد از جلد تندرست کیا جاسکے اور اُس کئے گئے گناہوں کی پاداش میں مقدمہ چلا کر اُسے خاطر خواہ سزا دی جاسکے۔

ولندیزی جیل خانوں کے ہسپتالوں میں قیدی مریضوں کی دیکھ بھال کے لئے نرسیں نہیں رکھی جاتی تھیں مگر جنگ کی وجہ سے اب صورت حال بالکل بدل چکی تھی اگرچہ قیدیں کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے کنگ کانگ کی صحت ابتر ہو چکی تھی اس لئے اب وہ اس قابل نہیں تھا کہ وہ کسی طرح نوجوان نرسوں کو مرعوب کر کے اپنے دام میں پھانستا اُسے تو خود اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے جب وہ غسل خانے کی طرف آتا جاتا تو بوڑھے سانڈ کی مانند چلتا معلوم ہوتا جس میں مکھیاں اُڑانے کی بھی سکت نہیں ہوتی۔ لیکن قارئین یہ بات جان کر حیران ہوں گے کہ اس ابتر حالت میں بھی ایک نوجوان نرس نے اُس کو اپنا دل دے دیا۔ یہ معاشقہ شاید اُن بھلے دنوں کی یاد ہوگا جب کنگ کانگ اپنے علاقے کا بے تاج بادشاہ گردانا جاتا تھا اور کسی عام آدمی کو اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر زمین پر یوں پٹک دیتا تھا جیسے دھوبی میلے اور غلیظ کپڑوں کو پتھر پر پٹکتا ہے۔ وہ ایک جھٹکے میں اتنی شراب پی لیتا تھا جتنی پانچ بے خور شراب پیتے ہیں۔

کنگ کانگ ہسپتال کے جیل کے کمرے میں اکیلا ہی بند تھا حالاں کہ وہاں چھ قیدیوں کے ٹھہرنے کی جگہ تھی اُس کے کمرے کے دروازہ پر ہر وقت بھاری قفل پڑا رہتا۔ کمرے میں دھوپ اور روشنی کی آمدورفت

کے لئے فقط ایک کھڑکی تھی جس میں ایک ایک انچ کی دُوری پر موٹی موٹی لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں یہ کمرہ عمارت کی پانچویں منزل پر تھا۔ اِس لئے اُس کمرے سے فرار ہونا کارِ دارد والا معاملہ تھا۔ پھر اُس شخص کے لئے جسے فالج اور تپ دق نے دبا رکھا ہو۔ لیکن اُس لاغر انسان نے جو کسی وقت جنگل کے شیر کی حیثیت رکھتا تھا اُس بند کمرے سے نکل کر جیل کے حکام کو حیرت کے سمندر میں ڈال دیا۔

تحقیقات کرنے پر پتہ چلا کہ اُس نرس نے لنڈامنز کو لوہا کاٹنے والی اسٹیل کی ایک ننھی سی آری دیا کی جو تین انچ موٹے لوہے کو بڑی آسانی سے کاٹ سکتی تھی۔ کِسی نے کھڑکی کی سلاخوں کو اس خوبی سے کاٹا کر دیکھنے والا سلاخوں میں کوئی نقص نہ نکال سکتا تھا۔ لیکن ہاتھ کے ایک ہی دھکے سے سب سلاخیں گر سکتی تھیں۔ سب سے حیران کُن بات یہ ہے۔ کہ مضبوط سلاخوں کو کب کاٹا ہوگا۔ یہ کام نرس اور اُس کے دوسرے ساتھی کے علاوہ جو لنڈامنز کے کمرے میں آتا جاتا تھا دوسرے شخص کا نہ تھا کیوں کہ کنگ کانگ تو مٹی کے تودے کی مانند تھا۔ اُس سے تو غسل خانے تک آنا جانا مشکل تھا وہ کس طرح سلاخیں توڑ سکتا تھا۔

نرس کے دوسرے ساتھی جس کا نام سنگنگ ریٹ یعنی گانے والا چوہا تھا نے کہیں سے فائر بریگیڈ کی ہوز پائپ لاکر لنڈامنز کے اوپر والے کمرے سے کھڑکی کے پاس سے گزرتی ہوئی لٹکا دی۔ رات کے وقت جب وہ ہوز پائپ کو پکڑ کر زمین کی طرف کھسک رہا تھا تو غیر معمولی صدائیں پیدا ہوئیں جنھیں سُن کر جیل کے کارندے اُس طرف دوڑے۔ ابھی لنڈامنز بھاگنے والا ہی تھا۔ کہ جیل کے کارندوں نے آکر اُسے فوراً رسیوں میں جکڑ لیا۔

ایک بار پھر وہ کال کوٹھری کا مکین بن گیا۔

اگرچہ جیل کے حکام کو پتہ چل گیا تھا کہ اس فراری میں نرس اور اُس کے ساتھی کا ہاتھ تھا لیکن کسی مصلحت کے تحت حکّام نے اُنھیں وہاں سے تبدیل کر کے دوسرے جیل میں بھیج دیا۔

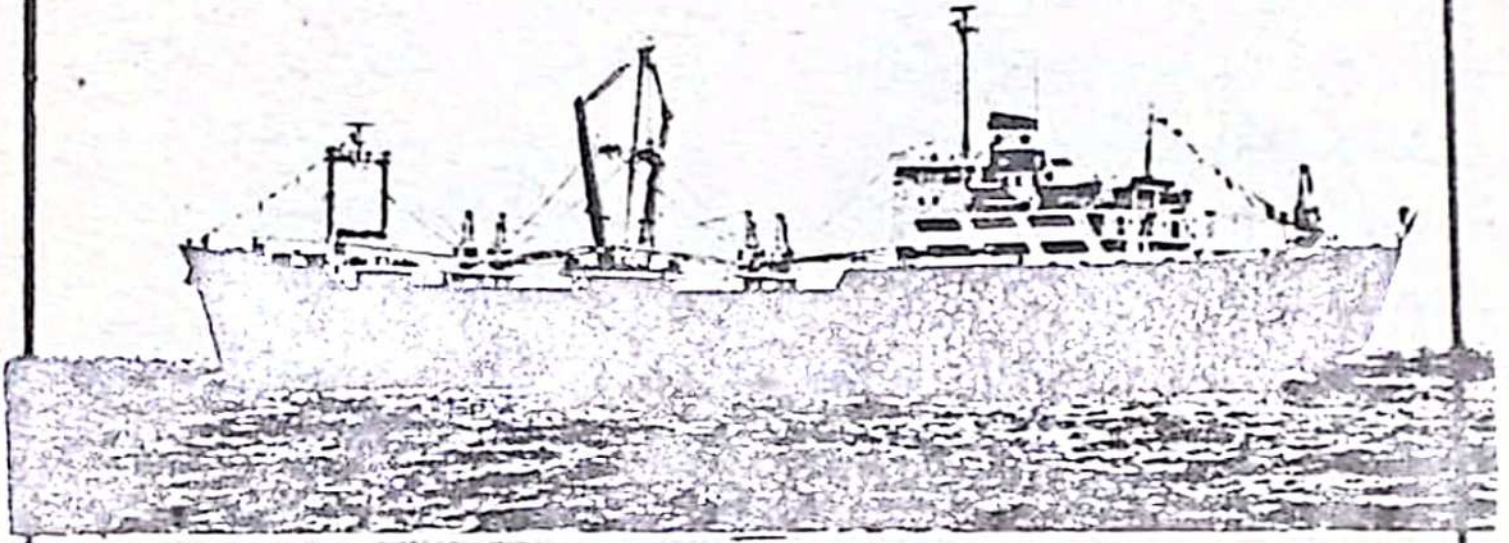
کِنگ کانگ پر غداری کے سلسلے میں مقدمہ چلانے کی اسٹیج مکمل ہو چکی تھی۔ دو روز کے بعد جب اُسے عدالت کے سامنے پیش کرنے کے لئے اُس کی کوٹھری کا دروازہ کھولا گیا۔ تو وہ اپنے پیدا کرنے والے کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اگرچہ حکام کے ہاتھ بہت لمبے اور مضبوط تھے لیکن کِنگ کانگ اُن ہاتھوں کو چکر دے کر جیل کی کوٹھری سے دوسرے جہاں کو فرار ہو گیا تھا اور چارپائی پر پڑی ہوئی اُس کی لاش دُنیا کی بے ثباتی کا منظر پیش کر رہی تھی۔

لاش کے پوسٹ مارٹم کے بعد معلوم ہوا کہ اُس نے بھاری تعداد میں نیند آور گولیاں استعمال کی تھیں۔ اُسے نیند آور گولیاں کہاں سے دستیاب ہوئیں اس بارے میں کوئی چشم دید گواہی نہ مِل سکی لیکن حکام کا شک نرس پر تھا۔ جس کی پاداش میں اُسے دس سال کی سخت سزا ملی۔

یہ داستان اُس غدّار کی ہے جس نے اپنے ذاتی مفاد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہزاروں اتحادی سپاہیوں کو موت کی نیند سُلا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے دوسری عالمگیر جنگ نے یورپ میں چھ ماہ طول پکڑا۔ اگر کنگ کانگ دوہرے چہرے کا جاسوس نہ ہوتا تو یورپ کی موجودہ تاریخ آج کچھ اور ہی ہوتی۔

*

اختر آرپوری



بحری بھیڑیا

۱۹۱۷ء کی بات ہے برطانوی تجارتی "ویرونا" اُون اور کھالیں لے کر جزائر سنڈے کے قریب سے سان فرانسسکو کی سمت چلا جا رہا تھا۔ جہاز کے "وائرلیس روم" اپنے کانوں پر سے آلات لاسلکی نکال کر ذرا دم لینے کے لئے ابھی آرام کرسی پر دراز ہوا ہی تھا کہ فضا میں ہوائی جہاز کی گھر گھر اور جہاز کے قریب دھماکے کی آواز ایک ساتھ سنائی دی۔ باہر جھانک کر دیکھا تو دھماکے کے ساتھ عرشہ (ڈیک) پر گرا ہوا خریطہ کیپٹن سانڈرس کو لے جا کر دیتے ہوئے ایک قلی کو دیکھا۔

"خبردار! وائرلیس کو ہاتھ مت لگانا، فوراً انجن بند کر دو۔ اور ہمارے حکم کی تعمیل کرو۔ ورنہ بم باری کرنی پڑے گی۔"

بس یہی مضمون تھا خریطے میں۔ غالباً حکم کی اہمیت ذہن نشین کرانے کے لئے ہوائی جہاز پھر ہمارے جہاز کے قریب آیا اور ایک بم جہاز کے بالکل قریب گرایا گیا!

ویرونا کے قریب ایک جنگی جہاز توپوں کا رخ ہماری سمت کئے ہوئے کھڑا تھا۔ کیپٹن سانڈرس نے مجھ سے کہا۔

"جاؤ! سب خفیہ دستاویزات کسی طرح جلا ڈالو لیکن لاسلکی آلات کو ہاتھ مت لگانا۔"

میں کپتان کے کمرہ کے تمام اہم کاغذات سمیٹ

مزاجن کی بھٹی کی طرف بھاگا اور کاغذات کو دہکتی ہوئی بھٹی میں جھونکنے میں مصروف تھا کہ جرمن بحری میرے پاس آیا اور مہذب انداز سے کاغذات طلب کیا۔ مگر اہم کاغذات نہ پاکر قدرے برافروختہ ہوا۔ میں اس بحری افسر کے ساتھ ڈیک پر آیا دیکھا تو جرمن فوجیوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ ان لوگوں نے بہت جلد پورا جہاز اپنے قبضہ میں لے لیا۔!

چائے پینے کے بعد ہم کو بالمقابل کھڑے ہوئے جرمن جہاز پر جانے کا حکم ملا۔ یہ جرمن جہاز بظاہر سیاہ رنگ کا تھا اور نقل و حمل کا زبردست تجارتی جہاز معلوم ہوتا تھا۔ لیکن سیڑھی چڑھ کر اندر جانے کے بعد پتہ چلا کہ ایک جنگی جہاز کو جن آلات کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب اس جہاز میں موجود ہیں جس حصہ میں ہم کو لے جایا گیا وہاں دو توپیں اور تارپیڈو کی دو مشین ایک فولادی چادر کی آڑ میں چھپی ہوئی تھیں۔ ہماری تلاشی لینے کے بعد جہاز کی سب سے نچلی منزل میں ہمیں ایک تنگ راستہ سے لے جایا گیا۔ یہاں پہلے ہی سے ایک سو قیدی موجود تھے۔ گزشتہ تین ماہ میں بحر ہند سے گزرنے والے جو برطانوی، فرانسیسی اور پرتگالی جہاز اس جنگی جہاز کی جھڑپ میں آئے تو ان کو غارت کرنے کے بعد ان کے ملاحوں کو قید کر لیا گیا تھا، وہی لوگ تھے جو انتہائی گرمی اور حبس کی وجہ سے تقریباً نیم برہنہ حالت میں رہتے تھے۔

اس کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس جہاز کی کارگزاری ہماری سمجھ میں آنے لگی۔ اب تک اتحادیوں کے بحری بیڑے کو دلف (WOLF) کی۔ یعنی اس جرمن بحری بھیڑیے کی سن گن بھی معلوم نہیں ہوئی تھی۔

دشمن کے جہازوں پر چھاپے مارنا ہی اس کا کام نہ تھا بلکہ سمندر میں سرنگیں بچھانے کی اہم خدمت بھی اس کو تفویض تھی۔ چنانچہ اب تک کیپ ٹاؤن، کولمبو اور بمبئی کی بندرگاہوں کے قریب اس نے سرنگیں بچھادی تھیں۔ اس کے باوجود اس لدے ہوئے سامان میں نصف سے زائد گولہ بارود کی قسم کا سامان تھا۔ اندر آنے کے بعد کیپٹن سانڈرس کی ملاقات کیپٹن میڈوز سے ہوئی۔ کیپٹن "ٹورٹیلا" نامی برطانوی جہاز کا کپتان تھا۔ "ٹورٹیلا" ایک پٹرول بردار جہاز تھا، اور آج سے تین ماہ قبل "وُلف" کی غارتگری کا سب سے پہلا شکار ہوا تھا۔ "میڈوز" نے کہا اتحادیوں کے بحری بیڑے سے بچ بچا کر جرمن واپس پہنچنے پر ہی شاید ہمیں اس قید سے نجات نصیب ہو۔ میڈوز کا یہ اندازہ بالکل صحیح نکلا۔!

دوسرے دن صبح کے وقت۔!

قیدیوں کو ناشتہ میں ڈبل روٹی اور کافی ملی اور عرشہ پر آزادی سے گشت کرنے کی اجازت بھی ملی ڈیک پر سے ہمارا جہاز "دیردنا" صاف دکھائی دیتا تھا، اس پر بارہ سوٹن کوئلہ اور ایندھن سے متعلق دوسری چیزیں بھی تھیں۔ "وُلف" کے خلاصی، ان چیزوں کو اپنے جہاز پر منتقل کرنے میں ہمہ تن مصروف تھے۔

وُلف (WOLF) پر چھ، سات انچ کی توپیں نہایت ہوشیاری سے خفیہ طور پر نصب تھیں۔ جو عرشہ والوں کو آسانی سے نظر آسکتی تھیں۔ ہر توپ کے قریب ایک ایک سنتری تعینات تھا۔ "وُلف" پر چار سو جرمن ملاح تھے۔ سب کے سب جوان، تن دمند،

ہوشیار اور چاق و چوبند تھے۔ شام کے وقت سب قیدیوں کو ایک ایک پیالی "کوکو" دی گئی۔ اور دو گھنٹے تک بینڈ بجتا رہا۔ طوفانی ہواؤں کی وجہ سے "ویبر دنا" کا سامان منتقل کرنے میں کافی دیر لگی۔ "وُلف" والے بہت دنوں سے تازہ گوشت کو ترس گئے تھے۔ "ویبر دنا" کی چالیس بھیڑیں ان کے لئے نہایت لذیذ مال غنیمت تھا۔ "ویبر دنا" کو توپوں کے گولوں سے غرقاب کر دیا گیا۔ اس اثنا میں اور ایک شکار ہاتھ آیا "ونسو" نامی ایک امریکن جہاز جس پر تین سو آسی ٹن کوئلہ دیگر ضروری اشیا تھیں قبضہ کر لیا۔ اور تمام سامانوں کو اپنے جہاز پر لاد کر "ونسو" کو غرقاب کر دیا۔

اتحادیوں کے بحریے کو اپنی لوٹ مار سے بے خبر رکھنے کے لئے خالی ڈھانچوں کا غرق ضروری تھا قیدیوں کو عرشہ پر آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت تھی، ہم سب جہاز کے عقبی حصہ میں جمع ہو جاتے تھے اس طرح ایک ہی سمت پر ہمارے جمع ہونے کا مقصد یہ تھا کہ ہم میں سے دو شخص سمندر میں کود کر فرار ہونا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شب میں حاضری کے وقت ان کے نام پکارے جانے پر دوسروں نے حاضر جناب کہا۔ چند روز بعد یہ راز فاش ہوگیا۔ اور قیدیوں کے نگراں "آسویلڈ" نے گالیوں کے بوچھار کے بعد کہا۔

"اب تک ہم نے تمہارے ساتھ مہمانوں کا سا برتاؤ کیا مگر تم نے اپنے آپ کو اس اعزاز کے قابل ثابت نہ کیا، لہٰذا اب تمہیں بالکل قیدیوں کی طرح رکھا جائے گا"!

جون کے آخر میں "وُلف" بحرۂ تاسمن میں داخل ہوا۔ اس سمندر میں سرنگیں بچھائے جانے کی بھنبھناہٹ کسی طرح ہمارے کانوں تک پہنچ چکی تھی، چنانچہ ایک دن ہم کو کمرے میں بند کر کے سب لوگ سرنگ بچھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ دروازوں میں سے بازو کی کوٹھری میں رکھے ہوئے سیاہ استوانے ہمیں نظر آ رہے تھے۔ ہماری کوٹھری کی چھت پر سے جہاز کے آخر حصہ تک سرنگ بچھانے کے آلات نصب کر دیئے گئے۔ اور رات میں دس بجے کے بعد کام شروع ہو گیا۔ جرثقیل سے سرنگیں اوپر اٹھا کر سمندر میں دھکیلی جا رہی تھیں۔ ایک آدھ سرنگ کی میخ سے خدانخواستہ دھکا لگ جانے سے ہماری اور "وُلف" کی کیا گت بنے گی۔ اس کے تصور ہی سے ہمارے اوسان خطا ہو رہے تھے، صبح تین بجے یہ کام ختم ہوا، اور ہماری جان میں جان آئی۔ اس موقع پر قیدیوں کو کمرے سے باہر نکلنے کی سخت ممانعت تھی سب روشنی بجھا دی گئی تھی۔ مگر درازوں میں سے یہ کارگزاری صاف دکھائی دیتی تھی۔ بحری سفر کے تجربوں، ستاروں اور ساحلوں کی علامتوں کی مدد سے ہم سے بہتوں کو آسانی سے اس کا اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ سرنگیں کہاں بچھائی جا رہی ہیں۔ سب کے سب تھک کر جلد ہی سو گئے۔ مگر "ویبر دنا" کا سیکنڈ آفیسر "ریٹز" برابر ان سرنگوں کا نوٹ لیتا رہا۔ اور اس کی اس ہوشیاری اور دانشمندی نے اتحادیوں کو بہت فائدہ پہنچایا۔ کیونکہ جرمنی پہنچنے سے قبل ہی "وُلف" پر سے قیدی فرار ہو گئے اور انگلستان پہنچے ان میں "ریٹز" بھی تھا "ریٹز" کی بہم پہنچائی

ہوئی معلومات کی بنا پر اتحادیوں کے جہاز بحرالکاہل میں "ڈولف" کی بچھائی ہوئی سرنگوں سے بآسانی بچکر نکل جاتے تھے۔!

اختتام جنگ پر "ریٹز" کو اس کارگزاری کے صلے میں خاص اعزاز دیئے گئے۔ اس کے بعد دو تین ہفتوں تک "کک اسٹریٹ" اور "نیو ساوتھ ویلز" کے ساحل پر اس طرح سرنگیں بچھانے کا کام ہوتا رہا، ان ایام میں ہم کو سخت نگرانی میں بے چون وچرا کوٹھری میں دن ورات گزارنی پڑتی ہے۔ کافی اور توس کے ناشتے اور ایک ہی قسم کی غذا سے ہم سب تنگ آگئے تھے۔ کمرے میں ایک ہی چراغ کی نیلگوں مدھم روشنی میں کوئی قیدی ادھر سے اُدھر جاتا تو اس پر بھوت کا شبہ ہونے لگتا تھا، یہ سب ناقابل بیان مصیبتیں ہم محض اس خوف سے برداشت کر رہے تھے۔ کہ ذرا بھی گڑبڑ ہوئی اور ہماری جان پر آبنی۔ اسی حالت میں کوئی نیا شکار ڈولف کو مل جاتا تو ہم کو بھی قدرے مسرت ہو جاتی تھی، گو قیدیوں میں اضافہ کی وجہ سے جگہ کی تنگی ضرور ہوتی تھی مگر نئے قیدیوں سے بحث وتمحیص میں خاص سرور حاصل ہوتا تھا۔ اور مستزاد یہ کہ پکڑے ہوئے جہاز کی غرقابی کا منظر نہایت دلفریب معلوم ہوتا تھا۔!

ڈولف نے سان فرانسسکو سے آنے والے جہاز "بلیوگا" پر حملہ کیا تو ہم میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی "بلیوگا" پر نیزن کے ہزاروں ڈبے تھے۔ اس مال غنیمت سے ڈولف کے ہوائی جہاز کے خوب مزے ہوئے۔ اس کی کارکردگی میں اور اضافہ ہوا دشمن کے جنگی وتجارتی جہازوں کا سراغ لگانے والے اولف کے واسطے محفوظ جگہ ڈھونڈنے میں نیز گرفتار شدہ جہازوں پر سے مال غنیمت اتارتے وقت چوکیداری کرنے کے کام ہوائی جہاز بہت مفید خدمات انجام دیتا تھا، اس ہوائی جہاز کی وجہ سے ڈولف کو تجارتی جہاز کے بھیس میں لوٹ مار کرنے میں بہت مدد ملی۔ ڈیک پر اس طیارہ کو جوں کا توں رکھنے کو کوئی جگہ نہ تھی، اگر ڈیک پر رکھا جاتا تو بہت جلد ڈولف کا بھانڈا پھوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ ضرورت کے وقت اس سے کام لینے کے بعد اس کے کل پرزے علیحدہ کر کے جہاز کے تہہ خانے میں رکھ دیئے جاتے تھے "بلیوگا" کی بیزن ملنے کے بعد یہ طیارہ دن بھر ہوا میں معلق رکھا جاتا تھا، اور رات میں ڈیک پر۔!

یہ بات پہلے واضح کر دی گئی ہے کہ اپنی لوٹ مار کی علامات سطح بحر پر باقی نہ رکھنا ڈولف کے لئے کس حد تک ضروری تھا۔ مگر "بلیوگا" کی غرقابی میں ڈولف کے کپتان نرزر کو ایک نئی مشکل پیش آئی کیونکہ بلیوگا پورا لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ کسی طرح غرق نہ ہو رہا تھا بالآخر نرزر نے اس کو آگ لگوادی۔ رات کی تاریکی میں "بلیوگا" کے جلنے کا نظارہ بڑا دلکش تھا۔ حد نظر تک روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بحری جانوروں کی ہیبت قابل دید تھی۔!

"بلیوگا" کے شکار کے دو دن بعد ایک چمنی نظر آئی۔ فوراً قیدیوں کو تہہ خانوں میں بھیج دیا گیا یہ دریائے کولمبیا میں سے سڈنی جانے والا امریکن جہاز تھا، چشم زدن میں میوہ مٹھائی گوشت اور دیگر اشیا سے بھری ہوئی کشتیاں ڈولف کی سمت آنے لگیں۔ اب کپتان نرزر کو نئی فکر دامن گیر ہوئی ڈولف کا کوئلہ ختم ہو چلا تھا۔ اس کی نبضیں سست

ہو رہی تھیں کسی غیر جانبدار بندرگاہ میں جہاز لیجاکر کوئلہ حاصل کرنا گویا باقی ماندہ ایک سو سرنگوں کو ضائع کرکے اپنی آزادی کو خطرہ میں ڈالنا تھا۔ اس لحاظ سے کسی کوئلے کے جہاز کو لوٹنا ضروری تھا۔ جولائی کے آخر میں نرزر نے سڈنی کے لاسلکی تار کو اچک لیا۔ جس میں کوئلہ دکیر ایندھن اور مال تجارت لے کر جانے والے "ماٹونگا" نامی جہاز کی روانگی کی اطلاع تھی۔ ۱۶ر اگست کو "ماٹونگا" پر ڈیرا پڑا۔ "ماٹونگا" کے قیدیوں میں میرا ایک دوست بھی تھا اس نے کہا۔

"معاف کرنا، مجھے تمہاری خستہ حالی کی وجہ سے پہچاننے میں ذرا تکلیف ہوئی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ان دو مہینوں میں میری صحت کس قدر خراب ہوگئی تھی۔

اسی اثنا میں کپتان میڈز نے ایک نئی کار گزاری دکھائی۔ خالی شیشیوں میں وُلف اور اس کے قیدیوں کی حالت کی چٹھیاں بند کرکے پھینکی گئی ان میں سے ایک شیشی گرم مصالحوں کے جزائر میں پہنچی اور اس طرح وُلف پہلی مرتبہ برطانی تجربہ کے علم میں آیا۔

"ماٹونگا" پر سے مال غنیمت اتارنے کے لئے کافی مدت درکار تھی۔ اور یہ سب خفیہ طور پر انجام دینا ضروری تھا۔ اس لئے کیپٹن نرزر نے عام بحری راستہ چھوڑ کر دونوں جہازوں کو بعض غیر آباد جزیروں کی آڑ میں لے جاکر لنگر انداز کیا۔ اس حمل ونقل کو پندرہ دن گزر گئے۔ گرمی اور حبس شدت کا تھا مگر اطراف کا نظارہ نہایت دل کش تھا۔ دن تو کسی طرح گزر جاتا کیونکہ عرشے پر چلنے پھرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ مگر رات کے وقت بند کمروں میں بلا کی گرمی ہوتی تھی۔ مقید کپتانوں نے رات کو عرشہ پر بیٹھنے کی اجازت کے لئے بہت کچھ تکرار کی۔ مگر کیپٹن نرزر وُلف کا راز فاش ہو جانے کے اندیشہ سے کسی طرح اس مطالبہ کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ سینۂ بحر پر عمریں گزارنے والے کچھ ایسے سخت جان ہوتے ہیں کہ ایسی جان لیوا تکالیف میں بھی وہ زندہ رہتے ہیں۔

اب کپتان نرزر نے جاوا کے سمندر سے سنگاپور کی طرف رخ بدلا۔ کیونکہ باقی ماندہ سرنگیں سمندر میں پھیلانا ضروری تھا۔ سنگاپور اگرچہ برطانیہ کا زبردست بحری مرکز ہے اس سمت کو جانا گویا جان بوجھ کر موت کو دعوت دینا ہے۔ مگر نرزر نے مطلق پروا نہ کی اب ہر سلطنت کے جنگی و تجارتی اور سیاحوں کے جہازوں کی شاہراہ پر وُلف گامزن تھا۔ افشائے راز کے خوف سے نگرانی اور احتیاط کو المضاعف کر دیا گیا تھا۔ بار بار رخ بدل کر چلنے کا طریقہ ترک کر دیا گیا نزدیک سے گزرنے والے جہازوں کو نارویجین، ڈچ سویڈن، امریکن۔ اور برطانوی پرچم لہرا کر دوستانہ سلامی دی جاتی تھی۔ اگر کوئی جہاز نام دریافت کرتا تو کپتان نرزر ہوشیاری سے ٹال دیتا تھا، ایک چاندنی رات میں وُلف پر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں توپ اور تارپیڈو کے پہریدار حکم کے انتظار میں تیار کھڑے تھے۔ مگر وُلف کی خوش قسمتی سے ایک نگرانی کرنیوالا جنگی جہاز قریب سے چپ چاپ گزر گیا۔

جب سرنگیں جاوا اور ملایا کے سمندروں میں بچھا دی گئیں۔ تو وُلف کے جرمن ملاحوں نے جشن منایا گویا وہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہوگئے۔ اب قیدیوں پر سے نگرانی کم ہوگئی۔ ڈیک پر چلنے پھرنے کی زیادہ آزادی ملی۔ ہم نے قیاس کیا کہ اب کسی ڈچ

کو آبادی میں پہنچانے جاکر ذرا دم لیا جائے گا اور دشمنوں کے چوکی پہروں سے بچ بچاکر معین مدت تک سمندر میں گھوم کر جرمنی کو واپس جانے کا خیال خام شاید ترک کر دیا جائے گا۔ مگر پانچ دن کے بعد جاوا کا سمندر پار کر کے خطرہ سے باہر ہوتے ہی جب بحر ہند میں راست مغربی سمت کو جہاز کا رخ کرنے کا کپتان نرزر نے حکم دیا۔ تو جرمن ملاحوں کے شگفتہ چہروں پر بھی مایوسی پھیل گئی۔ ستمبر کے آخر میں طیاروں کے پرزوں کو عرشہ پر فٹ کرتے وقت کپتان نے صاف طور پر سنا دیا۔

"ہم جرمنی پہونچ کر ہی دم لیں گے"۔

کولمبو سے عدن کی راہ پر چلتے وقت شام کو وُلف پر توپیں چلنے لگیں۔ اور ہمارے کوٹھری کے قریب ہی جوابی دھماکے کی آواز آئی۔ وُلف کی سب توپیں داغی جارہی تھیں۔ ان کے دھماکوں سے جہاز ڈگمگا رہا تھا۔ میں نے قریب کی سیڑھی پر چڑھ کر دیکھا تو ایک میل کے فاصلے پر ایک زبردست جہاز نظر آیا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ "ہتیاچی مارو" نامی جاپانی جہاز ہے، جو گولہ باری سے خطرناک حد تک زخمی ہو گیا تھا، جان بچانے والی کشتیاں چھوڑی جارہی تھیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ "ہتیاچی مارو" نے وُلف کی اطاعت قبول کر لینے کے اشارات ظاہر کرنے کے باوجود لاسلکی آلات سے اپنی گرفتاری کی اطلاع نشر کرنے کی کوشش کی تھی۔ وولف کے طیارے نے لاسلکی موجوں میں تلاطم پیدا کرنے کی غرض سے مزید دو تین بم جاپانی جہاز پر برسائے۔ وُلف کی کشتیوں نے فوراً "ہتیاچی مارو" کے پسماندوں کی گرفتاری کا عمل نہایت سرعت سے شروع کر دیا۔

"ہتیاچی مارو" چینی، ہندوستانی، پرتگالی اور برطانوی سیاحوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان سب کو گرفتار کر کے اس حصہ میں بند کر دیا گیا جہاں پہلے سرنگیں رکھی ہوئی تھیں چند ساعت کیلئے دونوں جہازوں کو روک کر "ہتیاچی مارو" کے فوت شدہ ملاحوں کو فوجی سلامی دی گئی۔ "ہتیاچی مارو" کے ملاحوں نے پے در پے کئی غلطیاں کی تھیں۔ جس کے باعث ان کی یہ دُرگت بنی۔ اول تو یہ کہ وہ بہت تیز رفتار جہاز تھا ٹھہرنے کا اشارہ پاتے ہی وہ نہایت آسانی سے رخ بدل کر فرار ہو سکتا تھا، دوسرے یہ کہ اطاعت و انقیاد کا اشارہ دے کر اپنی توپیں داغنی شروع کیں، تیسرے لاسلکی کے ذریعہ خطرے کی خبریں پھیلانے لگا۔ شاید ان ہی غلطیوں کے کفارہ کے خیال سے، وُلف پر پہنچنے کے بعد جاپانی کپتان نے خودکشی کر لی۔

کپتان نرزر نے دونوں جہازوں کو جزائر مالدیپ کے بازو ایک تنگ آبنائے میں لے جاکر لنگر انداز کیا۔ یہ آبنائے نہایت ہی تنگ تھی معلوم ہوتا ہے کہ کپتان نرزر کی بحری معلومات حیرت انگیز طور پر وسیع تھیں۔ ورنہ کوئی دوسرا چھوٹا سا جہاز اس خطرناک اور پتھریلی آبنائے کا رخ ہرگز ہرگز نہ کرتا۔ "ہتیاچی مارو" پر ریشم، چائے، ربڑ، تانبے، کیکڑے اور مچھلیوں سے بھرے ہوئے ہزاروں ڈبے تھے۔ اور دیگر اقسام کا مال بھی لدا ہوا تھا، لہذا "ہتیاچی مارو" کو اس مال غنیمت سمیت جرمنی لے جانے کے خیال سے اس کی مرمت شروع ہوئی۔ اور اس کے لئے ایندھن فراہم کرنے کی فکر نرزر کو دامن گیر ہوئی۔

ایک ماہ تک کوئلے کے جہازوں کا انتظار کر کے سب مال غنیمت ولف پر منتقل کرنے کے بعد "ہتیاچی مارو" کو غرقاب کر کے ولف آگے بڑھا چونکہ ولف والوں نے "ہتیاچی مارو" والوں سے لباس خرید لیا تھا۔ اس لئے ہم سب خارش میں مبتلا ہو گئے اور ہم اس خریدی ہوئی مصیبت سے تنگ آ گئے تھے، ایک اور اس سے زیادہ خطرناک مصیبت نازل ہوتی نظر آ رہی تھی، "ہتیاچی مارو" کے مسافروں میں سے دو تین ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوئے۔ اور ہم نے سمجھا کہ اب ہم سب کو یکے بعد دیگرے اس مرض میں مبتلا ہو کر سفر آخرت اختیار کرنا پڑے گا۔ لیکن دوسرے دن ان دونوں مریضوں کے پلنگ خالی تھے شاید رات کے وقت ان کو جیتے جی سمندر میں پھنکوا دیا گیا تھا۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا۔

"ہتیاچی مارو" کے مسافروں کی وجہ سے قیدیوں کی تعداد میں چار سو کا اضافہ ہو گیا تھا۔ متعدد مرسام میں مبتلا تھے، جلد کا رنگ نیلا اور پیلا پڑ گیا تھا۔ جگہ جگہ سے بھوس اڑنے لگی۔ بہتوں کے معدے خراب ہو گئے۔ تازہ غذا اور تھوڑا سا لیموں ملجاتا تھا، تو ایک ایک صحتیاب ہو سکتا تھا، لیکن جب جرمن ملاحوں کو خود تازہ غذا نہ ملتی تھی، تو قیدیوں کو بھلا کون دیتا۔

اتفاقاً ایک دن۔!

انبار خانے میں آگ لگ گئی۔ قیدیوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ہمارا قیاس تھا کہ ہم سب کو کسی قریب کے ساحل پر اتار دیا جائے گا۔ لیکن ولف کے ملاحوں نے جان توڑ محنت کر کے آگ پر قابو پا لیا۔ اور پھر ہم مدت معینہ تک مصائب و آلام جھیلنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ دوسرے دن صبح ایک جہاز نظر آیا۔ اور لطف یہ کہ اس وقت ولف کو جس چیز کی ضرورت تھی یعنی کوئلہ اس پر سات ہزار ٹن لدا ہوا تھا، یہ اسپین کا "ای اگسٹ مینڈی" نامی نہایت مضبوط جہاز تھا، نر زر نے سلطنت اسپین کی غیر جانبداری کا خیال کئے بغیر اس کو نہ صرف لوٹا بلکہ ایک چٹانی جزیرے کی آڑ میں لے جا کر اس کا رنگ بھی تبدیل کرا دیا۔ پہلے اس پر گہرا سرخ رنگ چڑھا ہوا تھا، اب سب علامتیں مٹا کر بھورا رنگ چڑھا کر اس پر عورتوں، بچوں اور بیمار قیدیوں کو سوار کر دیا گیا تھا، اور "لفٹیننٹ مروز" کی نگرانی میں ولف سے قدرے فاصلہ پر چلایا جانے لگا۔ کیونکہ دونوں جہازوں کو ایک ساتھ لے جانے سے شبہات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اب ولف کو اس قدر کوئلہ ملجانے کے باعث ہمیں جرمنی پہنچنے یا اتحادیوں کے جزیرے کے ہاتھوں ولف کی غرقابی سے قبل اپنی رہائی کی امید باقی نہ رہی۔

۳۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو ولف کو جرمن سے باہر نکلے ہوئے پورا ایک سال ہوا۔ "جان ایچ کیربی" نامی ایک امریکن جہاز کو گرفتار کر کے ولف نے سالگرہ منائی اس جہاز سے دو سو ستر فورڈ موٹر اور اٹھارہ قیدی اولف پر لائے گئے۔ اور اس کو غرق کر کے آگے بڑھے اس وقت ولف افریقہ کے انتہائی جنوب سے مڑ کر بحر اوقیانوس میں داخل ہو گیا تھا۔

۲۰ دسمبر کو برازیل سے تقریباً پانچسو میل کے فاصلہ پر مقررہ پروگرام کے مطابق "ای اگسٹ مینڈی" ولف کے قریب آیا۔ کوئلہ چونکہ ختم ہونے کے قریب تھا، اس لئے طوفان اور کھلے سمندر کا خیال کئے بغیر

نرزر نے دونوں جہازوں کو لنگر ڈالنے کا حکم دیا۔ طوفان کی شدت کے سبب پہلے دو ایک ہی طوفانی جھونکوں سے دونوں جہاز آپس میں ٹکرانے لگے۔ دونوں کی چولیں ڈھیلی ہوگئیں۔ کوئلہ بھرنے والے حمال قدم قدم پر گرتے تھے۔ کئی حمال ان صدموں کی تاب نہ لاکر مر گئے۔!

رات بھر میں پانچ سو ٹن کوئلہ وُلف پر بار کرکے دونوں جہاز چلنے لگے۔ کوئلہ منتقل کرنے کیلئے کسی محفوظ مقام کی تلاش میں دونوں جہاز شمال کی سمت پندرہ دن تک چلتے رہے۔ طوفان کا زور کسی طرح کم ہونے میں نہ آتا تھا۔!

بالآخر ۱۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو پھر کھلے سمندر میں دونوں جہاز لنگر انداز ہوئے۔ اور اب ایک مرتبہ ضرورت کے موافق کوئلہ منتقل کرنے کی ٹھہری دونوں کو آپس میں ٹکرانے سے بچانے کی انتہا کوششیں اور تدبیریں کام میں لائی گئیں، مگر سب بے کار ثابت ہوئیں۔ غرض کوئلہ لادلیا گیا، مگر آپس کے تصادم سے وُلف کی کیل کیل ڈھیلی ہوگئی تھی، فی گھنٹہ چالیس ٹن پانی جہاز میں داخل ہو رہا تھا۔ اور ہم سب متعجب تھے کہ اس کے باوجود جہاز رواں دواں ہے۔ اور بڑی تیزی سے مسافت طے کر رہا ہے۔ کوئلہ چونکہ بافراط حاصل ہوگیا تھا۔ اس لئے کپتان نرزر نے اس کا کوئی خیال نہ کیا۔ اب دونوں جہازوں نے دشمنوں کی ناکہ بندی کو اپنے طور پر علحدہ علحدہ توڑ کر وطن پہنچنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس لئے درمیان کا فاصلہ ذرا زیادہ رکھا گیا۔

وُلف (WOLF) "بحر اوقیانوس" کے شمالی حصے میں داخل تو ہوا مگر اب دھچکوں اور صدموں سے اس کی رفتار بہت سست ہوگئی تھی، دشمن کے حملوں کا خطرہ بھی قوی ہوتا جارہا تھا، چونکہ وُلف کو جرمنی سے نکلے ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا تھا اور جرمن بحریے کو وُلف کی تباہی کا یقین ہوگیا تھا، اس لئے خود جرمن آبدوزوں کے ہاتھوں غرقابی کا اندیشہ تھا۔ نیز جنوری ۱۹۱۸ء کے زبردست طوفان کا مقابلہ کرنا کچھ آسان کام نہ تھا، چنانچہ ۲۷ جنوری ۱۹۱۸ء جب رات گئے تک پانی کھینچتے کھینچتے سب قلی تھک گئے تو دواخانہ کے نوکروں کو اس کام پر لگایا گیا۔ برف کی طرح سرد پانی میں وہ بے چارے رات بھر کام کرتے رہے وُلف نے اس روز طوفان اور بادتند کا جس سخت جانی سے مقابلہ کیا وہ ہم سب کے لئے حیرت انگیز تھا۔ دوسرے دن طوفان کم ہوا۔ پانچ روز تک رینگ رینگ کر چلتے ہوئے وُلف آئرلینڈ کے عرض بلد پر پہنچا۔ بحر اوقیانوس میں داخل ہوتے وقت قیدیوں کی تعداد چار سو تھی، سرد ہواؤں کے اثر سے قیدیوں کی صحت روبہ ترقی تھی۔ خارش میں خاصا افاقہ ہوگیا تھا، اب قیدی بھی جہاز کے دیگر ملاحوں کی طرح خوش گپیاں کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اکثر قیدیوں کے لباس چیتھڑے ہوگئے تھے۔ مگر انجن کی طرف سے آنے والی گرم ہوا سے وہ گرمی حاصل کر لیتے تھے۔ مانونگاہ سے حاصل کیا ہوا شکستہ پیانو قیدیوں کو دیا گیا تھا اس پیانو پر بے سری اور بھدی آوازوں میں کئی گھنٹوں تک گانے والے ہم بیماروں کو دیکھ کر ہماری مسرت کے اسباب معلوم کرنا یقیناً دشوار تھا، وُلف ڈگمگاتا ہوا چل رہا تھا۔ دشمن کی ناکہ بندی بچھائی ہوئی سرنگوں

اور آبدوزوں کا خیال کئے بغیر کپتان جہاز کو برابر بڑھا رہا تھا، ہم سب اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ مگر نرزر کے چہرہ پر فکر و تردد کا کوئی اثر نہ تھا۔

۱۵ فروری ۱۹۱۸ء کی شب کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہمارا جہاز ناروے کے جنوبی ساحل کے مقابل پہنچ گیا ہے تو تعجب اور حیرت سے ہم ایک دوسرے کی طرف بہت دیر تک دیکھتے رہے۔ طوفان اور کہر اور پالے کی وجہ سے وُلف سب کی نظروں سے بچ کر یہاں تک آپہنچا۔ اب صرف ۲۴ گھنٹوں کی مسافت کے بعد بحرۂ بالٹک میں داخل ہو کر بخیریت تمام ولف اپنے گھر پہنچ سکتا ہے۔ ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ۱۷ فروری کی صبح کو ایک جرمن کروزر نے وُلف کو دور ہی سے روکا۔ اشارات وغیرہ سے اسے ہر چند سمجھایا گیا مگر کروزر کو کسی طرح یقین نہ آیا کہ وُلف صحیح سلامت موجود ہے۔ خود کپتان ایک کشتی میں سوار ہو کر کروزر کے قریب گیا۔ تو کروزر نے مان لیا۔ بندرگاہ کیل میں داخل ہونے سے پہلے چند روز یہیں ٹھہرنے کا حکم ہوا۔ اپنے مال غنیمت "ای اگست مینڈی" کو ساتھ لے کر بندرگاہ میں داخل ہونے کے خیال سے کپتان نرزر نے یہ حکم دیا تھا۔ لیکن مینڈی کہرے کے سبب ناروے کے قریب ایک چٹان سے ٹکرا گیا، لفٹیننٹ روزا، دوسرے جہازیوں کو حکومت سویڈن نے اپنے قبضہ میں لے کر ان کے وطن پہنچا دیا۔ ان ہی قیدیوں میں کپتان رئیر بھی تھا۔ جس نے انگلینڈ پہنچ کر وُلف کی بچھائی ہوئی سرنگوں کی تفصیل سے برطانوی بحریہ کو واقف کیا۔ اب وُلف کی ترمیم کر کے اس پر نیا رنگ چڑھا دیا گیا۔ خلاصیوں کو نیا لباس دیا گیا۔ سب کے سب خوشی سے جھوم اٹھے ان کی ٹوپیوں پر (S.M.S.W ولف) کے حروف چمک رہے تھے۔ وُلف کے طیارے کو بھی رنگ وغیرہ سے آراستہ کر کے عرشہ پر نمایاں کیا گیا تھا۔!

خیر مقدم کے لئے جرمن جہاز اور آبدوزوں کا بندرگاہ کیل میں زبردست اجتماع ہوا۔ ان سب سے سلامی لیتا ہوا ۲۴ فروری ۱۸ء کو بروز جمعہ کو وُلف گودی میں داخل ہوا۔ خلاصیوں کو آئرن کراس کے تمغے دیئے گئے کپتان نرزر کو خود قیصر جرمن نے خاطر و مدارات کی کیونکہ دنیا بھر کے میل کی مسافت طے کر کے وُلف کو اپنے وطن واپس لایا تھا۔ اس نے چودہ جہاز اور ... ۱۲۵ ٹن مال واسباب غارت کیا تھا۔ وُلف کے ذریعہ بچھائی ہوئی سرنگوں سے جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔!

جرمن خلاصیوں اور کپتان کا دل کھول کر استقبال کیا گیا۔ مگر اس جشن مسرت میں ہم قیدیوں کے حصہ میں کچھ بھی نہ آیا۔ جنگ ختم ہوئی اور صلح کے بعد ہم کو اپنے اپنے وطن پہنچا دیا گیا۔ چنانچہ میں اپنے وطن آپہنچا مگر اس سیاہ اور زبردست وُلف (بھیڑیے) نے میرے دل میں جو نقوش قائم کئے ان کا مجھے اسوقت علم ہوا جب انعقاد صلح کے بعد وُلف حکومت فرانس کے قبضہ میں گیا اور فرانس نے اس کا نام بدل کر "انٹی ہنس" رکھا۔! اور اس جدید نام سے وہ بحر اسٹریلیا آیا۔ لیکن اس کو ایک مرتبہ بھی دیکھنے کی خواہش میرے دل میں پیدا نہ ہوئی۔ اب بھی بندرگاہ کیل میں لنگی ہوئی وُلف کی شاندار تصویر کی یاد میرے دل و دماغ پر ایک خاص اثر پیدا کرتی ہے۔! ●●

دُوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی۔ جاپان، اتحادیوں کے خلاف صف آرا تھا۔ اس نے بحرالکاہل کے جزائر گوئم اور مریانا کے امریکی بحری اڈے پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ جزیرے جاپان کے مشرق میں تقریباً ایک ہزار میل دُور واقع ہیں۔ امریکیوں کیلئے یہ بحری اڈہ زبردست اہمیت رکھتا تھا؛ چنانچہ امریکہ نے جزائر مریانا اور گوئم کو جاپانیوں سے واپس لینے کی بھرپور کوشش کی۔ امریکہ اپنا "ٹاسک فورس ۵۸" نامی بحری بیڑہ ان جزائر سے ایک سو میل کے فاصلے پر لے آیا۔ وہاں سے امریکی بمبار طیارے اڑتے اور جاپانیوں پر بمباری کرتے تھے۔

---

۱۳ جون ۱۹۴۴ء کا ذکر ہے

پندر اسانیال



۱۳ جون ۱۹۴۴ء کا ذکر ہے۔ بحری بیڑے کے عرشے سے بمبار طیاروں کا ایک اسکواڈرن فضا میں بلند ہوا۔ ان کا رُخ گوئم کی طرف تھا۔ امریکی ہواباز انسائن ڈونلڈ برانڈٹ کا بمبار طیارہ بھی اسی اسکواڈرن میں شامل تھا۔ وہ اس وقت ۱۳ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی، ۹ بج کر ۱۳ منٹ ہو چکے تھے ۔۔۔۔ ۱۳ کے ہندسے نے اُس کے ذہن کو جھٹکا سا دیا۔ طیارے کا نمبر ۱۳، جون کی تاریخ ۱۳، بلندی ۱۳ ہزار فٹ اور وہ اپنے تیرھویں مشن پر جا رہا تھا۔ اس حیرت انگیز مماثلت پر اُس نے محسوس کیا جیسے ۱۳ کا عدد اس کے اعصاب پر چھا رہا ہے اور اس کا ذہن ماؤف ہو گیا ہے، مگر دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا اور اپنے وہم پر خود ہی ہنس دیا۔

طیاروں نے جزیرے کے مغربی ساحل پر واقع تیان کے اڈے کو بمباری کا نشانہ بنایا۔ برانڈٹ نے بھی غوطہ لگایا اور بم گرا کر جلد اُوپر اٹھ آیا۔ نیچے طیارہ شکن توپیں پوری شدت سے گولے اُگل رہی تھیں۔ اس نے جزیرے کا ایک چکر لگایا، اچانک طیارہ شکن توپوں کی ایک بوچھاڑ نے اس کے طیارے کا اگلا حصہ چھلنی کر دیا۔ طیارہ لڑکھڑایا اور دھوئیں کے کثیف بادل چھوڑتا ہوا ہچکولے کھانے لگا۔ برانڈٹ نے طیارے کو سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن بے سُود؛ چنانچہ اس نے



آکسیجن کی نلکی ناک سے علیحدہ کی، پیغام رسانی کا آلہ بھی ایک طرف ہٹایا اور دروازہ کھول کر چھلانگ لگانے کے لئے تیار ہو گیا۔

برانڈٹ جزیرے کے جس حصے کے اوپر پرواز کر رہا تھا اس کی چوڑائی چھ میل کے لگ بھگ تھی۔ سیدھا نیچے گرنے کا مطلب یہ تھا کہ جاپانی اُسے فوراً گرفتار کر لیتے۔ اس نے جاپانیوں کی بربریت اور قیدیوں کے وحشیانہ سلوک کی داستانیں سن رکھی تھیں۔ اُن کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے تصور سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ——— اس نے چھلانگ لگانے سے پہلے جہاز کو سمندر کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی۔ اچانک جہاز ایک خوفناک دھماکے سے پھٹ گیا۔ اس نے سمندر کی طرف رخ کر کے چھلانگ لگا دی، مگر قسمت کی خوبی دیکھئے کہ پیراشوٹ کی ایک رسی جہاز میں پھنس گئی اور وہ تباہ شدہ ڈھانچے کے ساتھ ہی لٹکتا ہوا سمندر میں جا گرا۔ اس کشمکش میں اس کی دائیں طرف کی نچلی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔

سمندر کی تیز ہوا اُسے دھکیلتے ہوئے خلیج اگانا میں لے گئی۔ یہ جگہ ساحل سے صرف ۵۰۰ گز دور اور براہ راست جاپانی توپوں کی زد میں تھی۔ برانڈٹ نے جیب سے چاقو نکالا اور کمر سے بندھی ہوئی پیراشوٹ کی رسی کاٹ دی۔ پیراشوٹ جلد ہی موجوں کی زد میں آ کر ڈوب گیا۔ ربڑ کی حفاظتی ٹیوب بھی اس کے ساتھ سمندر کی تہہ میں چلی گئی۔

اچانک برانڈٹ کو احساس ہوا کہ اس کا بایاں ہاتھ بری طرح زخمی ہے اور اس سے خون بہہ رہا ہے۔ ٹوٹی ہوئی پسلیوں سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ اس نے گردوپیش پر نگاہ ڈالی۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ بمبار طیارے اس کے اوپر سے گرجتے غراتے گزر رہے تھے۔ دل میں ہلکی سی اُمید پیدا ہوئی کہ شاید کوئی طیارہ اسے دیکھ لے اور بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے لیکن دوسرے ہی لمحے خیال آیا کہ وہ تو اپنے طیارے کے تباہ ہونے کی اطلاع بھی کسی کو نہ دے سکا تھا اور حملہ آور طیارے چند لمحے اور بمباری کرنے کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ اسکے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔

نو بج کر ۵۰ منٹ پر امریکی آبدوز "شین گرے" کو ریڈیو پیغام موصول ہوا کہ ایک امریکی ہوا باز سمندر میں گر گیا ہے، اُسے بچانے کی کوشش کی جائے۔ "شین گرے" اس وقت جزیرے کے مغرب میں تھی، آبدوز کے کپتان سام لومیز کو خفیہ الفاظ میں اس مقام کی نشان دہی کی گئی جہاں برانڈٹ تیر رہا تھا۔ آبدوز مذکورہ مقام پر پہنچی، تو جاپان کی ساحلی توپیں برانڈٹ کے ارد گرد گولہ باری کر رہی تھیں۔ گیارہ بج کر ۳ منٹ پر کپتان لومیز نے بمبار طیاروں کو پیغام بھیجا کہ وہ آبدوز کو اِئرکور دیں



تاکہ آبدوز برانڈٹ کے قریب پہنچ کر اُسے بچانے کی کوشش کرے۔ جواب ملا: توپوں کی گولہ باری میں یہ ممکن نہیں ـــــ چنانچہ آب دوز سمندر کے اندر ہی گھومتی رہی۔

سمندر میں گرنے کے دو گھنٹے بعد تک جاپانیوں کو پتہ نہ چل سکا تھا کہ برانڈٹ کہاں ہے، اس لئے وہ گولوں سے محفوظ رہا۔ لیکن بارہ بجے کے قریب اس کی زندگی میں انتہائی خوف ناک باب کا اضافہ ہوا۔

شمال مغرب کی طرف جانے والے جاپان کے تین جنگی جہازوں پر امریکی طیارے بمباری کر رہے تھے۔ ایک بمبار اپنے غول کے پیچھے رہ گیا اور بہت نیچے آ کر اُس نے برانڈٹ کے قریب ایک حفاظتی ٹیوب پھینک دی جو کشتی کے تختے کی مانند چوڑی تھی۔ برانڈٹ اُسے پکڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ اُس کے اوپر بیٹھ گیا اور بچاؤ کی تدبیریں سوچنے لگا ـــــ اسی اثنا میں بمبار طیاروں کا ایک غول آیا اور اُس کے اوپر اُڑنے لگا تاکہ آبدوز اُسے اُٹھا کر لے جا سکے۔ لیکن اس سے پہلے کہ آبدوز برانڈٹ کے قریب پہنچتی، جاپانیوں نے گولہ باری شروع کر دی۔ گولے اس کے دائیں بائیں گر رہے تھے۔ اس نے ٹیوب کے نیچے چھپنے کی کوشش کی۔ اُدھر طیارے توپوں پر جھپٹے، مگر توپیں گولے اگلتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد ۱۲ ملی میٹر کی توپیں بھی کام کرنے لگیں۔ طیارے چلے گئے اور برانڈٹ غیر محفوظ رہ گیا۔

جس جگہ وہ تیر رہا تھا، وہاں ایک تو پانی کم گہرا تھا، دوسرے ساحلی چٹانیں بھی آب دوز کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔ اس قدر قریب پہنچ کر اگر وہ سمندر سے ذرا بھی سر اُٹھاتی، تو جاپانی توپیں اس کا کچومر نکال دیتیں۔ اُدھر ہوا باز کو بچانا بھی ضروری تھا۔ یہ فیصلہ کرنا آسان نہ تھا کہ انسانی جان زیادہ قیمتی ہے یا آبدوز ـــــ لیکن کپتان لومیز نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر قیمت پر برانڈٹ کی جان بچائے گا۔

برانڈٹ ٹیوب کے اوپر لیٹا تیر رہا تھا۔ تکان سے جسم نڈھال ہو چکا تھا۔ ہاتھ کے تازہ زخم پر سمندر کا نمکین پانی پڑتا، تو نوکیلے نشتر چبھتے ہوئے محسوس ہوتے ـــــ ٹوٹی ہوئی پسلیوں سے درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ ہوا کے چلنے سے موجیں آپس میں ٹکرائیں اور ٹیوب زور زور سے ڈولنے لگی۔ ساحل سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کے دبیز بادلوں اور دھند نے سورج کو چھپا دیا تھا۔ رات قریب آ رہی تھی۔ برانڈٹ سوچ رہا تھا اگر شام سے پہلے بچاؤ کی کوئی صورت نہ بنی، تو رات کے وقت طیارے اُسے تلاش نہیں کر سکیں گے۔

بارہ بج کر سترہ منٹ پر سٹینگرے کے کپتان نے آبدوز کا رُخ خلیج اگانا کی طرف موڑ دیا ـــــ وہ سوچ رہا تھا پتہ نہیں ہوا باز زندہ بھی ہوگا یا نہیں؟ آبدوز ساحل کے قریب پہنچی، تو چار سو گز کے فاصلے پر دو گولے پھٹے۔ آبدوز غوطے میں چلی گئی اور دوبارہ سر نکالا، تو دو سو گز دور پھر گولے پھٹے ـــــ اُسے پھر غوطہ لگانا پڑا۔ جاپانیوں کی ساحلی توپیں آبدوز کو تباہ کرنا چاہتی تھیں، اسلئے مسلسل گولہ باری کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد آبدوز ایک بار پھر سطح سمندر پر ابھری اور برانڈٹ کو تلاش کرنے لگی۔ اس بار سکون تھا۔ اچانک گولہ باری شروع ہوگئی۔ برانڈٹ کو ٹیوب کے نیچے چھپنا پڑا۔ آبدوز غوطہ لگا گئی۔ برانڈٹ ٹیوب کے اوپر بیٹھ گیا۔ ٹیوب کا تختہ بے رحم موجوں کے درمیان دھند اور کہر میں ڈول رہا تھا۔

آبدوز کے کپتان لومیز نے ہوا باز کو بچانے کے لئے پیری اسکوپ ریسکیو پروسیجر آزمانے کا فیصلہ کیا ـــــ ڈوبتے ہوئے لوگوں کو بچانے کا یہ نیا طریقہ بحریہ نے اس سے پہلے نہ آزمایا تھا۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ پیری اسکوپ کے ذریعے ڈوبتے ہوئے انسان کے قریب پہنچ کر ایک رسہ پھینکا جاتا ہے۔ اگر وہ رسہ پکڑنے میں کامیاب ہو جائے، تو آبدوز اُسے گھسیٹتے ہوئے دور لے جاتی

ہے اور پھر سطح سمندر پر اُبھر کر اسے بچا لیا جاتا ہے۔ آبدوز میں بیٹھا ہوا انسان اس آلے کا ایک سرا سمندر سے باہر نکال کر سطح سمندر پر تیرنے والی چیز کا محل وقوع معلوم کر سکتا ہے اور اس کی مدد سے سمندر کے اندر ہی اندر مطلوبہ چیز کے قریب پہنچا جا سکتا ہے۔

چنانچہ پیری اسکوپ لگائی گئی۔ اُس وقت برانڈت جس مقام پر تھا، کم گہرے پانی اور بارودی سُرنگوں کی وجہ سے وہاں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ تاہم آبدوز نے پیری اسکوپ کی مدد سے اُس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ برانڈت کو دُور سے پتہ چل گیا کہ سمندر کے اندر ہی اندر آبدوز چلی آ رہی ہے۔ وہ پہلے ہی گھبرایا ہوا تھا، اب تختے کے ایک طرف لٹک گیا۔ آبدوز نے اس کے عقب میں آکر رسّہ اس طرح پھینکا کہ تختہ اس میں پھنس جائے مگر نشانہ خطا گیا۔ لہریں برانڈت کو اچھالتے ہوئے دُور لے گئیں۔ پیری اسکوپ غائب ہو گئی تھی۔ برانڈت نے سوچا شاید انھوں نے میرے بچاؤ کی کوشش چھوڑ دی ہے۔ اس کے دل میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ کمزوری اور نقاہت کے سبب اس پر غنودگی چھانے لگی، لیکن توپوں کی آواز نے اُسے بیدار کر دیا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد آبدوز نے دوبارہ قریب آنے کی کوشش کی، لیکن گولہ باری کے پیشِ نظر اُسے آدھ گھنٹے تک انتظار کرنا پڑا۔ جب توپیں ذرا خاموش ہوئیں تو آبدوز تیزی سے برانڈت کی طرف بڑھی۔ اُسے جہاں سے گزرنا تھا، برانڈت وہاں سے ذرا فاصلے پر تھا۔ اُس نے آبدوز کو آتے دیکھا، تو آگے بڑھنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا ـــــ کپتان تومیز جھنجھلا اُٹھا تھا، ہو گئی۔ اچھا، ایک کوشش اور۔

آبدوز مسلسل تین گھنٹے سے جاپانی توپچیوں کو پریشان کر رہی تھی۔ اس وقت سوا تین بج چکے تھے۔ چار بجے ہوائی حملہ ختم کر کے بمبار طیاروں کو چلے جانا تھا۔ طیاروں کی مدد کے بغیر آبدوز کے لیے برانڈت کو بچانے کی کوشش جاری رکھنا مشکل تھا۔ اگر مزید پون گھنٹے تک یہی صورتِ حال رہتی، تو برانڈت کا بچنا ناممکن تھا۔ وہ سمندر میں ڈوب جاتا یا جاپانی اُسے گرفتار کر لیتے۔

آبدوز نے تیسری اور آخری کوشش کا آغاز کر دیا۔ برانڈت اب دیوانوں کی طرح زور زور سے چلا رہا تھا۔ موٹا چکنا رسّہ تیزی سے گھسٹتا ہوا اُس کی طرف آنے لگا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ رسّہ فاصلے سے گزرے گا اور یہ تہیہ کر لیا کہ اس بار رسّے کو پکڑنے کی پوری کوشش کروں گا۔ جب رسّا قریب پہنچا تو اُس نے پوری قوت سے رسّے کی طرف چھلانگ لگائی اور اُسے اپنے ہاتھ پر لپیٹ لیا اور اس کے ساتھ ساتھ گھسٹنے لگا۔ آبدوز کی رفتار بہت تیز تھی۔ برانڈت مضمحل جسم کے ساتھ گھسٹتا آ رہا تھا۔ اُس کے زخموں میں دوزخ کی سی جلن تھی۔ ۷۵ منٹ تک آبدوز گہرے سمندر کی طرف بھاگتی رہی۔ سوا چار بجے کے قریب وہ ایک جگہ رُکی۔ برانڈت بالکل نڈھال ہو چکا تھا۔

پانچ منٹ بعد آبدوز پانی کی سطح پر اُبھر آئی۔ برانڈت کو دو آدمیوں نے آبدوز پر پہنچایا۔ اُس نے کپتان تومیز سے ہاتھ ملایا۔ دونوں کی زبانیں گنگ تھیں۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ گئے۔



پوتے نے کہا: "دادا جان چلئے آپ کو نمائش دکھا لاؤں۔" دادا نے جواب دیا: "ارے بیٹا، اب بڑھاپے میں کیا تماشے دیکھوں گا۔ یہ تم بچوں کے لیے ہیں۔" "لیکن دادا جان، اس میں ایک نہایت خوبصورت لڑکی بالکل ننگی کپڑے پہن کر ایک سفید بُراق گھوڑے پر کرتب دکھاتی ہے۔" "تو چلو میں نے کافی عرصے سے سفید گھوڑا نہیں دیکھا۔" دادا نے کہا۔


۷ ہزار سے مقابلہ
نام کتاب: ONE FOR SEVENTY THOUSAND
مصنف: کامنش رینالڈز
ترجمہ: ضیاء شاہد

دوسری جنگِ عظیم کے بعد جنگ پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن جو شہرت کاسنٹن رینالڈز کی تصنیف ONE FOR SEVENTY THOUSAND کو حاصل ہوئی وہ بہت کم کتابوں کو ملی۔ اس کتاب کے پس منظر میں بحرالکاہل کے وہ جزیرے ہیں جن پر جاپان نے قبضہ کر لیا تھا۔

پوری کتاب اتنی دلچسپ اور واقعات سے اتنی بھرپور ہے کہ اس کی تلخیص بظاہر ناممکن نظر آرہی تھی، لیکن جناب ضیاء شاہد نے بہرحال اس کی تلخیص کر دی جو بہت ہی کامیاب ہے۔

مجھے پوری امید ہے کہ قارئینِ محراب اس کو بے حد پسند کریں گے۔

مدیر ——————

اُس روز ہم صبح سے بمباری کر رہے تھے۔ ہمارے گروپ میں دس طیارے تھے جن میں سے پانچ ہر وقت ساحلی علاقوں پر بمباری کرنے کے لئے موجود رہتے تھے۔ جب کسی طیارے کے پاس بموں کا ذخیرہ ختم ہونے لگتا، تو وہ چھاؤنی کی طرف پرواز کر جاتا۔ سہ پہر کے وقت ہم نے ساحل کے قریب کھڑے ہوئے ایک چھوٹے سے بحری جہاز پر خوب بمباری کی۔ میں نے تین مرتبہ اس کے گرد چکر لگائے اور آخر تیل کی ٹنکی تلاش کر لی۔ اب صرف اس ٹنکی کے عین اوپر بم گرانے کی ضرورت تھی۔ چمنی میں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ جہاز میں صرف ایک طیارہ شکن توپ دکھائی دے رہی تھی، تاہم اس کا رخ ساحل کی طرف تھا۔ اس طرح کھلے سمندر کی طرف سے ہمیں ٹنکی تک پہنچنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ چمنی کے اندر بم گراتے ہی ہم اوپر کی طرف پرواز کرنے لگے اور جلد ہی فضا میں کافی بلندی تک پہنچ گئے۔ ایک ہلکا سا دھماکہ سنائی دیا۔ نیچے دیکھا تو جہاز کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ سمندر میں کچھ دور تک تیل کے شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ ہم ایک چکر کاٹ کر دوبارہ تباہ شدہ جہاز کے قریب پہنچ گئے۔ ڈوبنے والوں کی چیخیں آسمان تک پہنچ رہی تھیں۔ پانی کی سطح پر تیل جل رہا تھا۔ مطمئن ہو کر ہم چھاؤنی کی طرف پرواز کرنے لگے۔ ابھی ہمیں ساحل سے روانہ ہوئے صرف دس منٹ ہوئے تھے کہ دشمن کے تین طیارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ یہ لڑاکا طیارے پوری طرح مسلح تھے۔ ہم نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی، لیکن ہمارے بموں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا اور دشمن سے بچنے کے لئے اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ انھوں نے اتنی بمباری کی کہ ہمارے طیارے کی دُمچی میں آگ لگ گئی۔ اس وقت ہم کل نو آدمی طیارے میں تھے جن میں سے دو تو فوراً چل بسے۔ ایک کا بازو زخمی ہو گیا اور وہ کھڑکی کے ملبے کے نیچے دبا ہوا مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ ایک ہوا باز کی حیثیت سے میں نے بے شمار خطرات کا مقابلہ کیا ہے، لیکن جو صورتِ حال اس روز درپیش تھی اس سے نجات ناممکن تھی۔ دُمچی ٹوٹ چکی تھی، بارود کا ذخیرہ خالی ہو چکا تھا۔ نو میں سے صرف چھ آدمی زندہ تھے۔ تینوں لڑاکا طیارے ہمارے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ ہمارا طیارہ ویسے بھی بہت چھوٹا تھا۔ اچانک ایک بم تیل کی ٹنکی پر آگرا اور

آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ میں نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو آواز دی کہ وہ طیارے سے کود جانے کے لئے تیار ہو جائیں لیکن اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی سنبھلتا، انجن ایک دھماکے سے پھٹ گیا اور میری بائیں ٹانگ انجن میں بُری طرح جکڑی گئی۔ آخری منظر جو میری آنکھوں نے دیکھا، وہ طیارے کا تیزی سے نیچے کی طرف گرنا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں، اور موت کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ جب طیارہ سمندر میں پانی سے ٹکرایا، تو میں نے کیا محسوس کیا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ جب میرے اوسان بحال ہوئے، تو میں پانی میں ڈوب رہا تھا۔ میں نے ہاتھ پاؤں مارے اور جلد ہی سطح آب پر اُبھر آیا۔ مجھ سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر ہمارا طیارہ ڈوب رہا تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ڈوب چکا تھا، کیونکہ اس کا صرف ایک بازو دکھائی دے رہا تھا۔ سمندر میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ کسی ہوا باز کے لئے اس کے طیارے کا تباہ ہونا کتنا دل خراش ہوتا ہے، اس کا اندازہ شاید آپ لوگ نہ کرسکیں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں، ضبط کرنے کی کافی کوشش کی، لیکن آنسوؤں کے دو قطرے آنکھوں سے چھلک پڑے اور پھر میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اچانک آسمان پر دشمن کے وہی لڑاکا طیارے دکھائی دئے جنھوں نے ہمیں مار گرایا تھا۔ وہ اس جگہ بم برسانے کے لئے آئے تھے جہاں ہمارا طیارہ ڈوبا تھا تاکہ ہم میں سے کوئی زندہ نہ بچ نکلے۔ ایک بم مجھ سے کوئی چار پانچ فٹ کے فاصلے پر گرا۔ میں نے جلدی سے غوطہ لگایا اور جتنی دیر تک سانس روک سکتا تھا، سطح کے نیچے ٹھہرا رہا۔ جب میں دوبارہ اوپر آیا، تو طیارے واپس جا چکے۔ میں اپنی بڑھتی ہوئی نفرت کو نہ روک سکا اور چیخ چیخ کر انھیں گالیاں دینے لگا۔ میں اچھا تیراک نہیں ہوں، تاہم جوں توں ہاتھ پیر مارتا رہا۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا، شاید چودھویں کا تھا۔ دُور دُور تک سمندر

پھیلا ہوا تھا اور چاند کی کرنیں اس کی موجوں سے اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ موسم خاصا حسین تھا اور اگر میری ٹانگ میں اتنا شدید درد نہ ہوتا، تو شاید میں اس سے لطف اندوز بھی ہوتا۔ ٹانگ میں درد ہونے کی وجہ سے مجھے صرف ایک ٹانگ سے تیرنا پڑ رہا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے منہ سے خون نکل رہا ہے۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا، تو ایک دانت اپنی جگہ سے اکھڑ چکا تھا۔ صرف اس کا ایک کونہ مسوڑے سے اٹکا ہوا تھا۔ میں نے اسے نکالنے کی کوشش کی لیکن درد سے میری چیخیں نکل گئیں۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ میں تھکن سے چور ہو چکا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ پانی پر چت لیٹ جاؤں اور اپنے جسم کو پانی میں ڈوب جانے دوں۔ بلا سے جان جاتی ہے تو جائے جسم کو آرام مل جائے گا۔ میں انھی خیالات میں گم تھا کہ کوئی چیز مجھ سے آکر ٹکرائی۔ میں نے ذرا غور سے دیکھا یہ ایک لائف بیلٹ تھی۔ اس وقت میں اس جگہ سے جہاں طیارہ ڈوبا تھا، کم و بیش ایک میل دور نکل چکا تھا۔ ایسے میں لائف بیلٹ کا مل جانا قدرت کی طرف سے ایک معجزے کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ شاید قدرت نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کھلے سمندر میں کس مپرسی کی حالت میں ڈوب جاؤں۔ میں نے اسے کمر کے گرد باندھ لیا اور تھوڑی دیر کے لئے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر آرام کرنے لگا۔ اسی حالت میں میری آنکھوں کے سامنے ماں، باپ اور بھائی بہنوں کے چہرے لہرانے لگے، وہ میری ہمت بڑھا رہے تھے، وہ مجھے موت سے نبرد آزما ہونے کی ترغیب دے رہے تھے۔ میرے منہ سے بے اختیار دعائیہ فقرات نکلنے لگے۔ میں رو رو کر دعائیں مانگ رہا تھا۔ میں خدا کے حضور میں جھکا ہوا انتہائی اخلاص سے گڑگڑا کر زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ چکا تھا، اس لئے سمندر تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ کسی سمت کا تعین کئے بغیر میں تیر تا رہا۔ میرا سارا جسم پانی میں تھا، پھر بھی میرے ماتھے پر پسینے کے قطرات

تیرنے لگے۔ وقت گزرتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ میری جسمانی حالت بھی کمزور پڑتی چلی گئی، یہاں تک کہ میں نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اب میں لہروں کے رحم و کرم پر نامعلوم سمت میں جا رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی، گیارہ بج رہے تھے۔ طیارے کو تباہ ہوئے پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں اونگھنے لگا۔ بار بار میرا سر ایک طرف کو ڈھلک جاتا اور منہ میں سمندر کا نمکین پانی بھر جاتا۔ ایک گھنٹے تک میں نیند سے لڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ سوا بارہ بجے چاند بادلوں سے نکلا اور ایک بار پھر دور دور تک اس کی دودھیا روشنی پھیل گئی۔ چمکتی ہوئی کرنوں نے سطح سمندر کو منور کر دیا تھا۔

میں نے چاروں طرف غور سے دیکھا اور اچانک میری نظریں ایک سیاہ دھبے پر جا کر رک گئیں۔ میں نے اپنی بچی کھچی طاقت کو جمع کیا، اور اس دھبے کی طرف بڑھنے لگا۔ ٹانگ کے درد نے مجھے بے حال کر رکھا تھا، پھر بھی ایک ٹانگ اور دونوں ہاتھوں سے میں پانی کو چیرتا ہوا اس سمت میں بڑھتا چلا گیا۔ کبھی کبھار جب میں بائیں ٹانگ پر ذرا سا دباؤ ڈالتا، تو منہ سے ایک چیخ نکلتی۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو یہ دو سو فٹ لمبی اور کوئی پچاس فٹ چوڑی ایک عمودی چٹان تھی جس پر چڑھنا کسی صورت میں ممکن نہ تھا۔ سطح سمندر سے اس کی اونچائی بیس فٹ کے قریب تھی، اس کے قریب جاتے ہوئے مجھے ڈر لگ رہا تھا، کیونکہ میں نے بحری جہاز کے سپاہیوں سے سن رکھا تھا کہ اس قسم کی چٹانوں کے گرد شارک مچھلیاں جمع رہتی ہیں اور جو بھی کوئی مصیبت کا مارا قریب سے گزرتا ہے، وہ اسے لقمہ تر سمجھ کر نگل جاتی ہیں ـــــ کچھ دیر میں اسی سوچ میں رہا کیونکہ چاروں طرف سمندر پھیلا ہوا تھا۔ بچنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے، صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ میں کسی طرح اس چٹان پر چڑھنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ آخر مجھے ایک تدبیر سوجھی۔ میں نے کمر سے لائف بیلٹ اتاری اور جیب سے چاقو نکال کر اسے لمبے رُخ کاٹ دیا۔ مجھے پانی کی سطح پر رہنے کے لیے پوری قوت سے ہاتھ پاؤں مارنے پڑ رہے تھے، اس لیے میں نے جلدی سے ان ٹکڑوں کو ملا کر ایک رسی تیار کی، اور اس رسی کے آخری سرے پر ایک گرہ دے کر میں نے اسے چٹان کی طرف پھینکا۔ قسمت اچھی تھی جو پہلی بار یہ رسی چٹان کے کسی کنگرے میں پھنس گئی اور مجھے اس کے سہارے اوپر چڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اوپر جا کر میں نے رسی کھینچ لی اور چاروں شانے چت زمین پر گر پڑا۔ تھوڑی دیر بعد میں گہری نیند سو رہا تھا۔

جب میں بیدار ہوا، اس وقت دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے اپنے تمام جسم پر ہاتھ پھیرا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے شدت سے بھوک محسوس ہو رہی تھی، پیاس بھی لگی ہوئی تھی۔ میں اس چٹان کا معائنہ کرنے لگا۔ اچانک میرے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ مجھ سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر ایک جاپانی سپاہی منہ کے بل پڑا تھا۔ وہ بالکل ساکت تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آرام کی نیند سو رہا ہے۔ میں خوف زدہ ہو گیا۔ اس کے پاس بندوق بھی تھی اور میرے پاس ایک چھوٹے سے چاقو کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دبے پاؤں چلتا ہوا میں اس کے قریب گیا اور اس پر جھک گیا۔ بدبو کے بھبکے میری ناک میں گھسنے لگے۔ میں نے اس کے جسم کو سیدھا کر دیا۔ اُف میرے خدا! وہ مر چکا تھا۔ اس کا سارا جسم نیلا ہو رہا تھا۔ اسے مرے ہوئے تین چار دن سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے، کیونکہ اس کا جسم ابھی گلنا شروع نہیں ہوا تھا۔ اس کی صورت بُری طرح مسخ ہو چکی تھی۔ میں حیران رہ گیا۔ آخر وہ اس چٹان پر کیسے پہنچ گیا۔ میں نے اس کے جسم کو خوب اچھی طرح دیکھا، لیکن کوئی زخم نظر نہ آیا۔ میں نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا، تو مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ میرے دائیں ہاتھ کی پشت بُری طرح زخمی ہو چکی ہے۔ شاید اس میں لوہے کے ذرات گھس گئے تھے۔

جاپانی سپاہی کی جیب سے نکالی ہوئی چیزیں میں نے اپنے سامنے رکھ لیں۔ ایک ماچس تھی اور ایک بندوق تھی جس کے ساتھ

تھیں۔ اب میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ میرے پاس صرف ایک چاقو اور چند ڈالر تھے۔ میری قمیص تار تار ہو چکی تھی۔ ایکبار تو جی میں آئی کہ جاپانی کے کپڑے اتار لوں، لیکن دل نے گوارا نہ کیا کہ دشمن کا فوجی لباس پہنا جائے۔ دفعتاً فضا میں چند جاپانی لڑاکا طیارے دکھائی دیئے، وہ بہت نیچے پرواز کر رہے تھے۔ میں جھٹ زمین پر لیٹ گیا تاکہ کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لیں۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے، تو میں اٹھا اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ جنوب کی سمت کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلے پر زمین دکھائی دے رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ نیو برٹن کے جزیرے تھے۔ انھیں دیکھ کر میرے دل میں زندہ رہنے کی اُمنگ پیدا ہوئی۔ میں نے بندوق کندھے سے لٹکائی اور اللہ کا نام لے کر پانی میں کود پڑا۔ جزیرے کی سمت تیرتے ہوئے میں بہت خوش تھا اور اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھا کہ جزیرے میں ستّر ہزار جاپانی میرے استقبال کے لئے موجود ہیں۔

جب میں ساحل پر پہنچا، دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ ساحل کی ریت ختم ہوتے ہی ناریل کے درختوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ میرے لئے چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ زخمی ٹانگ مجھے بُری طرح پریشان کر رہی تھی۔

اب سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور اس کی رُوح پرور دھوپ میرے لئے بیحد اطمینان کا باعث تھی۔ میں نے بندوق کا سہارا لے کر چلنے کی کوشش کی، لیکن وہ بہت وزنی تھی اور مجھ میں اسے اٹھانے کی سکت نہیں تھی۔ آخر مجھے زمین پر پڑی ہوئی درخت کی ایک سوکھی ہوئی شاخ مل گئی۔ میں نے اسے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا اور جسم کا سارا بوجھ اس پر ڈال کر آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ مجھے شدت سے پیاس لگ رہی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر جلد ہی مجھے پانی نہ ملا، تو میرا دم نکل جائے گا۔ سمندر کا نمکین پانی پیتے پیتے میرا منہ کڑوا ہو چکا تھا۔ درختوں کے نیچے گنجان جھاڑیاں تھیں جن میں سے گزرنا بیحد تکلیف دہ تھا۔ بعض مقامات پر تو زیرِ درختی اس قدر گنجان تھی کہ مجھے چاقو سے شاخیں کاٹ کر اپنا راستہ بنانا پڑا۔ ایک جگہ دو تین ناریل زمین پر پڑے ہوئے ملے۔ میں نے چاقو سے انھیں کھولا، لیکن وہ اندر سے بالکل خشک تھے۔ سبز ناریل درختوں پر بہت اونچے لٹک رہے تھے اور ان تک میرا پہنچنا ناممکن تھا۔ تقریباً ایک میل کی مسافت طے کرنے کے بعد میں ایک ندی کے کنارے پہنچا جہاں میں نے جی بھر کر ٹھنڈا اور میٹھا پانی پیا۔

کنارے پر بیٹھ کر میں نے اپنی بندوق صاف کی، کیوں کہ سمندر کے نمکین پانی سے اس کے ناکارہ ہو جانے کا خدشہ تھا۔ میرے جسم پر جہاں جہاں خراشیں آئی تھیں وہاں سمندر کے نمکین پانی نے جلن پیدا کر دی تھی۔ میں نے ندی میں اتر کر دونوں ہاتھوں سے جسم کو خوب ملا۔ غسل کے بعد میں باہر نکلا، تو جسم بہت ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ اب مجھے شدت کی بھوک لگ رہی تھی۔ درختوں کے نیچے جو جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں، ان میں گولر کی طرح سرخ اور گلابی پھل لگے ہوئے تھے۔ میں نے ایک پھل توڑا اور اسے ناک تک لے گیا۔ اس میں سے بدبُو آ رہی تھی۔ میں نے اُسے کھانے کی کوشش کی، لیکن وہ سخت کڑوا نکلا۔ ناریل کے درختوں سے سبز کھوپے لٹک رہے تھے، لیکن ان تک پہنچنا میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ عام حالات میں شاید کسی درخت پر چڑھنے کی کوشش کرتا، مگر اس وقت میری ٹانگ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ چھڑی کا سہارا لے کر میں آہستہ آہستہ کنارے کے ساتھ ساتھ مشرق کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ ایک جگہ ناریل کے درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ عین اسی وقت فضا میں گڑگڑاہٹ سنائی دی اور دشمن کے چند لڑاکا طیارے دکھائی دیتے۔ میں پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا اور بندوق کا رُخ آسمان کی طرف کر دیا۔ خوش قسمتی سے کسی نے مجھے

نہیں دیکھا۔ آگے بڑھنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا میں زمین پر گھٹنوں کے بل چلتا ہوا جھنڈ میں جا گھسا۔ یہاں سے سمندر نظر آرہا تھا۔ یہ جگہ ویسے بھی ذرا اونچی تھی، اس لئے دُور دُور تک نظر جا سکتی تھی۔ عارضی قیام کے لئے مجھے یہ جگہ پسند آگئی۔ میں نے چند شاخوں کی مدد سے تھوڑی سی جگہ صاف کی اور خشک گھاس اکٹھی کر کے ایک بستر تیار کر لیا۔ آسمان پر پھر گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، تو گھنگھور گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ دیکھتے ہی مینہ برسنے لگا۔ اب مجھے جھونپڑی بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں نے زمین پر پڑی ہوئی لکڑیاں اکٹھی کیں اور ایک درخت کی نچلی شاخوں میں پھنسا دیا۔ خشک پتے اور گھاس اکٹھی کر کے ان شاخوں پر ڈال دی۔ تین اطراف جھاڑیاں تھیں، صرف ایک طرف کھلی تھی۔ اس طرح یہ چھوٹی سی جھونپڑی بن گئی جو چھ فٹ چوڑی اور دس فٹ لمبی تھی۔ چھت بہت نیچی تھی اور اس میں انسان کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اندر جانے کے لئے گھٹنوں کے بل چلنا پڑتا تھا۔ میرے سارے کپڑے گیلے ہو چکے تھے۔ لیکن انھیں اتار کر خشک کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ اس صورت میں یہ کپڑے اوپر سے نظر آ سکتے تھے۔ شام ہو چلی تھی۔ بارش تھم گئی تھی۔ بھوک سے میری آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ لڑکھڑاتے قدموں سے میں خوراک کی تلاش میں نکلا۔ ایک جگہ مجھے ایک کھوپا دکھائی دیا۔ میں نے اُسے اٹھا لیا۔ یہ قدرے سبز دکھائی دیتا تھا۔ بندوق کا کندا مار مار کر میں نے اسے کھولا۔ باسی ہونے کی وجہ سے پانی بدبودار تھا، تاہم گری ابھی تک نرم تھی۔ میں نے خوشی خوشی اُسے منہ میں ڈالا۔ لیکن ٹوٹے ہوئے دانت کی وجہ سے اسے چبانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس بڑھتی ہوئی بھوک کو کیسے مٹاؤں۔ سورج غروب ہو چلا تھا اور چاروں طرف شام کا جھٹپٹا پھیل رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں میرے لئے اپنی جھونپڑی تلاش کرنا مشکل تھا، اس لئے میں جلد ہی واپس آگیا اور گھاس کے بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ گھنے درختوں میں نمی کی وجہ سے مچھر بہت زیادہ تھے۔ وہ بار بار مجھ پر ہلّہ بول دیتے میں گالیاں دیتے ہوئے انھیں ہٹانے کی کوشش کرتا، لیکن میری ایک نہ چلتی۔ میرے پاس کوئی کپڑا تک نہیں تھا جسے میں اوڑھ سکتا۔ میں نے خشک گھاس میں چھپنے کی کوشش کی، لیکن مچھر وہاں بھی پہنچ گئے۔ غصّے اور بیچارگی سے میں جھنجھلا گیا اور بستر سے اٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ آخر مجھے ایک تدبیر سوجھی۔ میں نے بستر کے قریب چند لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی اور پھر چند سبز جھاڑیوں سے ڈھانپ دیا۔ اس طرح آگ کے پھیلنے کا خدشہ نہ رہا اور میرا مقصد بھی حل ہو گیا۔ دھوئیں سے مچھر قدرے کم ہو گئے تھے۔

دن جتنا گرم تھا، رات اتنی ہی سرد تھی، تاہم میں مزے کی نیند سویا۔ صبح آنکھ کھلی، تو طبیعت ہشاش بشاش تھی۔ بھوک رہ رہ کر مجھے ستا رہی تھی۔ اس وقت تک میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ جزیرے پر جاپانی سپاہیوں کا کوئی اڈا ہے۔ باہر گھومنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ جزیرے کے مقامی باشندوں کو تلاش کرنا بھی کچھ فائدے مند نہیں تھا، کیونکہ میری اطلاع کے مطابق جنوری ۱۹۴۲ء میں جاپان نے نیو برٹن پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت مقامی باشندے پوری طرح ان کے محکوم و تابع تھے۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ مجھے پناہ دیں گے، بے سود تھا۔ دھوپ تیز ہوتی چلی گئی۔ میں نے جھونپڑی سے باہر نکل کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دُور دُور تک کوئی متنفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گرتا پڑتا میں ساحل کی طرف چل دیا۔ میری ٹانگ بُری طرح زخمی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ زخم

بڑھتا چلا جائے۔ میرے پاس صرف ایک دوا تھی اور وہ تھا سمندر کا پانی۔ مجھے معلوم تھا کہ نمکین پانی زخم کو مندمل کر دیتا ہے، اور اس میں پیپ نہیں پڑنے دیتا۔ ساحل پر دراز ہو کر زخمی ٹانگ پانی میں رکھ دی۔ کھاری پانی میرے زخم میں سرایت کرنے لگا یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زخموں پر نمک چھڑکا جا رہا تھا۔ میں نے قمیض کا دامن دانتوں میں دبا لیا اور مستقل مزاجی سے تکلیف برداشت کرتا رہا۔ واپسی پر مجھے چند گھونگھے مل گئے۔ میں نے ان سے جھولی بھر لی۔ جھونپڑی میں پہنچ کر انھیں آگ پر بھونا اور پھر چاقو سے ان کا خول اتار کر کھا گیا۔ میرے پاس نمک نہیں تھا، ورنہ وہ شاید اتنے بدذائقہ نہ لگتے۔ میں کئی دنوں سے بھوکا تھا، اس لئے جونہی میرا معدہ پُر ہوا مجھے قے آ گئی۔ اس وقت سے میں نے یہ اپنا معمول بنا لیا۔ صبح سویرے اٹھتا اور ساحل پر جا کر ٹانگ کو پانی میں رکھ دیتا۔ واپسی پر گھونگھے لا کر بھونتا اور انھیں چٹ کر جاتا۔ کبھی کبھار کسی ناریل کی نچلی شاخ سے کوئی کھوپا مل جاتا تو وارے نیارے ہو جاتے۔ شام کو دوبارہ ساحل پر جاتا اور گھونگھوں سے جھولی بھر لاتا۔ میرے پاس صرف چند دیا سلائیاں باقی تھیں، اس لئے اب میں دن رات آگ جلائے رکھتا تھا۔ دھوئیں سے بچنے کے لئے میں نے آگ کو مٹی سے ڈھانپ دیا۔ جب ضرورت محسوس ہوتی مٹی ہٹا کر چند پھونکیں مارتا اور آگ نئے سرے سے جلنے لگتی۔

ایک ہفتہ اسی طرح گذر گیا۔ میری ٹانگ کا زخم بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ دانت کا درد بھی قدرے کم تھا اور اب تو میں کھوپے کی گری چبا سکتا تھا۔ صرف ہاتھ کا زخم روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ لوہے کے چند ذرّات اندر گھس گئے تھے اور اب ہتھیلی کی پُشت سوج کر کُپّا ہو رہی تھی۔ میرے پاس کوئی نوک دار چیز نہیں تھی جس سے میں ان ذرّات کو باہر نکال سکتا۔ دن میں دو مرتبہ میں اسے نمکین پانی میں ڈبو دیتا، لیکن اس سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ سوجن روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر مجھے ایک تدبیر سوجھی۔ میں اسے آگ پر گرم کرنے لگا۔ درد کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے، لیکن میں دانت دبا کر ہاتھ کو گرم کرتا رہتا۔ سوجن اور بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہتھیلی کی پشت پھٹ جائے گی۔ گرم کرنے سے ایک فائدہ ہوا۔ لوہے کے ذرّات اوپر آتے چلے گئے، یہاں تک کہ وہ جلد میں سے نظر آنے لگے۔ دو تین روز سے میں سخت تکلیف میں مبتلا تھا اور جھونپڑی سے باہر نہیں نکلا تھا۔ بھوک سے دم نکلا جا رہا تھا۔ ہاتھ کو ذرا ہلاتا، تو درد سے بے حال ہو جاتا۔ آخر میں نے آپریشن کرنے کی ٹھان لی۔ میرے پاس صرف ایک چھوٹا سا چاقو تھا۔ میں نے اسے بندوق کے کندے پر خوب رگڑا اور رگڑتا پڑتا ایک خالی کھوپے میں سمندر کا نمکین پانی بھر لایا اور قمیض کے دامن سے ایک پٹی پھاڑ لی۔ اب سامان تیار تھا۔ میں نے جی کڑا کر کے ہاتھ کی پشت پر چیرا دیا اور لوہے کے تینوں ٹکڑے باہر نکال دیے۔ درد کی شدت سے میں پاگل ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا زور زور سے چیخوں۔ ہونٹوں کو مضبوطی سے آپس میں ملا کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور سخت تکلیف کی وجہ سے اچھلنے لگا۔ آخر میں بے حال ہو کر زمین پر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ آپریشن کئے ہوئے تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں نے کپڑے کی دھجّی کو سمندر کے نمکین پانی میں ڈبو دیا اور کس کر زخم پر باندھ دیا۔

تیسرے روز میری طبیعت سنبھل گئی۔ ہاتھ کا درد جاتا رہا تھا۔ میں بندوق لے کر باہر نکلا اور ندی کے کنارے جا کھڑا ہوا ایک جنگلی بطخ کے اڑنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے فائر کرنا چاہا۔ لیکن یہ سوچ کر رک گیا کہ کہیں کوئی فائر کی آواز نہ سن لے۔ ندی کے ساتھ ساتھ میں مغرب کی سمت چل نکلا۔ تھوڑی دور چل کر ایک راستہ دکھائی دیا جس پر بکری کے پہیوں کے نشانات تھے۔ کہیں کہیں انسانی قدموں کے نشانات بھی نظر آئے۔ اس راستے

پر چلنے والے ننگے پاؤں تھے، اس لئے مجھے یہ اندازہ کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی کہ یہاں سے نیو برٹش کے مقامی باشندے گزرے تھے۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میری نگرانی کر رہا ہے۔ میں نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ ایک جھاڑی کی اوٹ میں دو مقامی باشندے چھپے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے چمکدار خنجر تھے۔ بھاگنا بے سود تھا۔ میں آہستہ آہستہ ان کے قریب چلا گیا اور ان سے بات کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ انگریزی زبان سے نا واقف تھے۔ میں نے اشاروں سے انھیں سمجھایا کہ مجھے کھانے کے لئے کچھ چاہئے۔ ان میں سے ایک فوراً بندروں کی طرح ناریل کے ایک درخت پر چڑھ گیا اور تین چار سبز کھوپے اتار لایا۔ تیز خنجر کی مدد سے اس نے بڑی پھرتی سے انھیں کھولا اور مجھے پکڑا دئے۔ میں نے ایک ایک کر کے ان کا دودھ پی لیا۔ اس عرصے میں وہ غور سے میری طرف دیکھتے رہے۔ میں نے انھیں بتلایا کہ میں امریکی ہوں اور میرا جہاز سمندر میں گر کر تباہ ہو گیا ہے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ شاید وہ میرا مفہوم سمجھ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے انتظار کرنے کا اشارہ کیا اور پلک جھپکتے میں گھنی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ اگر اس نے جا کر جاپانیوں کو بتا دیا، تو میرا حشر کیا ہو گا۔ میں انہی خیالات میں گم تھا کہ پہلا شخص واپس آ گیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کہ وہ کوئی لمبا فاصلہ طے کر کے یہاں پہنچا ہے۔

"سردار نے اجازت دے دی ہے، چلئے۔" اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔

کندھے سے بندوق لٹکائے میں ان کے ہمراہ چل دیا جلد ہی ہم گاؤں میں پہنچ گئے۔ گھاس پھوس اور بانس کی بنی ہوئی جھونپڑیوں پر مشتمل یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ایک طرف جانوروں کا باڑہ تھا، جس میں گاؤں بھر کے مویشی بندھے ہوئے تھے ـــــ جھونپڑیوں کے باہر پستہ قد سیاہ فام عورتیں کام کاج میں مصروف تھیں۔ ان کے بچے ڈھول اور کیچڑ میں کھیل رہے تھے۔ ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ کر عورتیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور تعجب سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ مجھے نسبتاً کشادہ کوٹھڑی میں لے جایا گیا جہاں بستی کا سردار جسے وہ کپائی کہتے تھے، کھال کے فرش پر بیٹھا جاپانی سگریٹ پی رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مقامی زبان میں مجھے خوش آمدید کہا۔ میرے لئے ایک بستر تیار کر دیا گیا۔ گرم دودھ کا پیالہ پی کر میں چین کی نیند سو گیا۔ صبح اٹھا تو سردار جھونپڑی میں موجود تھا اور میری بندوق کا معائنہ کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے بندوق رکھ دی اور میرے لئے کھانا لانے کا حکم دیا۔ تانبے کی ایک کھلی تشتری میں بھنی ہوئیں بطخیں دیکھ کر میری بھوک چمک اٹھی۔ میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا اور دوبارہ میٹھی نیند سو گیا۔ شام کے چھ بجے میری آنکھ کھلی تو وہ پستہ قد نوجوان جو مجھے گاؤں تک لے کر آیا تھا، اندر داخل ہوا۔ اتفاق سے اس وقت جھونپڑی میں اور کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ وہ میرے قریب آ گیا اور رازداری سے بولا:

"سردار ـــــ جاپانی ـــــ آپ ـــــ جائیں۔"

وہ بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کر رہا تھا، تاہم مجھے اس کا مفہوم سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی جب میں نے سردار کو جاپانی سگریٹ پیتے دیکھا تھا۔ میں تو اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ اس کے جاپانیوں سے تعلقات ہیں۔ میں نے اپنی بندوق اٹھالی اور بھاگنے کے لئے تیار ہو گیا۔ نوجوان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"کپیتا ـــــ میں ـــــ لامی ـــــ دوست"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا، وہ میری مدد کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سرگوشی سے اس کا ہاتھ دبایا اور ہم دبے پاؤں

جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔

شام کا جھٹپٹا چاروں طرف پھیل رہا تھا بستی کی عورتیں جھونپڑوں کے سامنے کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ لوگوں کی نظروں سے بچتے بچاتے ہم بستی سے باہر نکل گئے۔ لالی میری رہنمائی کر رہا تھا۔ ہم راستے کے بجائے گھنے درختوں اور جھاڑیوں میں سے ہو کر چل رہے تھے تاکہ لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہ سکیں میری ٹانگ کا زخم ابھی پوری طرح نہیں بھرا تھا۔ اس لئے ہماری رفتار خاصی سُست تھی۔ میری سُست رفتاری سے تنگ آکر لالی نے مجھے کندھوں پر اٹھا لیا اور تیزی سے بھاگنے لگا۔ بستی سے ایک میل کے فاصلے پر ہم رُک گئے۔ آسمان پر بادل گھِر آئے تھے اور بارش ہونے کا قوی امکان تھا۔ لالی نے اپنے تیز چاقو سے ایک درخت کی چند شاخیں کاٹیں اور منٹوں میں ایک جھونپڑی کی تیاری کر دی۔ اندر گھس کر ہم زمین پر لیٹ گئے۔ اچانک باہر کچھ شور سنائی دیا۔ لالی نے باہر نکل کر دیکھا، بیشمار شعلیں ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ جلدی سے اندر آیا اور اشارے سے مجھے بستر میں دُبک جانے کی نصیحت کی۔ ہم دم سادھے اسی طرح لیٹے رہے۔ بستی کے لوگ ہمیں جنگل میں تلاش کر رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ ان کی نظر ہماری جھونپڑی پر نہ پڑے۔ ہاتھ کے زخم کی وجہ سے مجھ میں بندوق اٹھانے کی طاقت نہیں تھی، ورنہ میں ان میں سے کسی کو قریب نہ پھٹکنے دیتا۔ جھونپڑی کے باہر قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ میں نے بندوق کو زمین پر لٹا کر اس کا رُخ دروازے کی طرف کر دیا۔ اگلے ہی لمحے جھونپڑی کی چھت نیچے آگری۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا، تو ہمارے چاروں طرف پچیس تیس آدمی ہاتھوں میں نیزے تانے کھڑے تھے۔ بندوق چلانا بیکار تھا جتنی دیر میں میں اُن کا ایک آدمی مارتا، وہ مجھے آسانی سے ختم کر سکتے تھے۔ میں نے بندوق ہاتھ سے رکھ دی اور خاموشی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ سردار نے لپک کر اسے اٹھا لیا۔ ہم نیزوں کی نگرانی میں بستی کی طرف چل دیے۔ مجھے اپنی کمر سے نیزے کی انی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک جگہ میں دم لینے کو رُکا، تو کسی نے مجھے زور سے دھکا دیا، اور میں چاروں شانے چت زمین پر گر پڑا میری ٹانگ کے زخموں سے خون بہنے لگا۔ میں نے غضب آلود نظروں سے سردار کی طرف دیکھا، تو اس نے لوگوں کو ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا، تاہم تمام راستے لالی کو بُری طرح پیٹا گیا یہاں تک کہ اس کی ناک اور منہ سے خون بہنے لگا۔ جھونپڑی میں پہنچ کر انھوں نے مجھے اندر دھکیل دیا اور لالی کو گھسیٹتے ہوئے ایک کھلے میدان میں لے گئے جہاں اسے بُری طرح زدوکوب کیا گیا۔ دروازہ بند تھا، اس لئے مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ تھوڑی دیر تک لالی کی دلخراش چیخیں سُنائی دیتی رہیں پھر وہ سسکیوں میں ڈوب گئیں۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھُلا اور بے ہوش لالی کو اندر دھکیل دیا گیا۔ دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔ جھونپڑے کے ایک کونے میں صراحی رکھی تھی۔ میں نے اس میں سے پانی لے کر لالی کے چہرے پر چھڑکا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ہوش آگیا۔ رات کے گیارہ بجے کے قریب دروازہ ایک مرتبہ پھر کھُلا اور سردار کی بیوی دو پیالوں میں بطخ کا گوشت لے کر اندر آئی۔ پیالے زمین پر رکھ کر وہ باہر نکل گئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ لالی نے گوشت کے ٹکڑے اپنی جیب میں ٹھونس لئے اور جیب سے چاقو نکال کر جھونپڑی کی عقبی دیوار کی طرف بڑھا۔ یہ دیوار ٹھوس سرکنڈے کی بنی ہوئی تھی، لیکن اس کی موٹائی دو فٹ کے قریب تھی لالی نے صراحی سے پانی لے کر اس پر چھڑکا، تاکہ سرکنڈے ذرا نرم ہو جائیں اور پھر آہستہ آہستہ انھیں کاٹنے لگا۔ جب وہ تھک جاتا تو میں اس کی جگہ سنبھال لیتا۔ رات کے سوا تین بجے ہم دیوار میں ڈیڑھ فٹ لمبا اور ایک فٹ چوڑا شگاف بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

سب سے پہلے لالی خود باہر نکلا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے مجھے بھی باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بندوق اس کو پکڑا دی اور خود زمین پر گھسٹتا ہوا باہر نکل آیا۔ اچانک ایک کتا بھونکنے لگا

لالی نے منھ سے ایک خاص قسم کی آواز نکالی جسے سن کر وہ فوراً دُم ہلاتا ہوا ہمارے سامنے آگیا۔ اسے دیکھ کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کا قد چھوٹے گدھے کے برابر تھا۔ لالی نے جیب سے گوشت کا ٹکڑا نکالا اور اس کے سامنے پھینک دیا۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ وہ خوشی خوشی اس پر پل پڑا۔ ہم دبے پاؤں چلتے ہوئے بستی سے باہر نکل آئے۔ راستے میں جہاں جہاں کوئی کتا نظر آتا، لالی گوشت کا ایک ٹکڑا اس کے سامنے پھینک دیتا۔ اس وقت رات کے چار بج رہے تھے۔ صبح پانچ بجے تک ہم کافی دور نکل چکے تھے۔ پھر بھی پکڑے جانے کا خوف تھا۔ ایک جگہ ناریل کا ایک درخت اپنی جگہ سے اکھڑ کر زمین پر جھکا ہوا نظر آیا۔ ہم اس کی شاخوں میں چھپ گئے۔ دن بھر ہم وہیں چھپے رہے۔

شام کے پانچ بجے، پچاس ساٹھ جاپانی ایک مقامی باشندے کی سرکردگی میں ہمیں تلاش کرتے ہوئے اس جگہ آنکلے، تاہم ہم پتوں میں چھپے ہوئے تھے، اس لئے ان کی نظر ہم پر نہیں پڑی۔ رات کی سیاہی پھیلتے ہی ہم باہر نکلے اور جنوب کی سمت چل پڑے۔ صبح سات بجے کے قریب ہم ایک گاؤں میں پہنچے، جہاں لالی کا ایک دوست سکونت پذیر تھا۔ مجھے گاؤں سے باہر ٹھہرا کر لالی اندر گیا اور تھوڑی دیر میں اپنے دوست اور گاؤں کے سردار کو ساتھ لے کر لوٹا۔ اس گاؤں کا سردار بڑی روانی سے انگریزی بول سکتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عیسائی مشنری کے ہسپتال میں کام کرتا تھا جسے جاپانیوں نے جزیرے پر قبضہ کرتے ہی تباہ و برباد کر دیا تھا۔ وہ بڑی محبت سے پیش آیا اور ہمیں اپنے ساتھ گاؤں میں لے گیا۔ گاؤں کے ایک بوڑھے طبیب نے ہمارے زخم دھو کر مرہم پٹی کی۔ کھانے کے بعد ہم میٹھی نیند سو گئے۔

دوسری صبح میں نے شیو بنائی اور غسل کیا۔ میرے کپڑوں سے پسینے کی بو آرہی تھی۔ سردار کے کہنے پر میں نے انھیں اتار کر سردار کے حوالے کر دیا اور خود ایک صاف چادر جسم کے گرد لپیٹ کر بیٹھ گیا۔ دوپہر کے قریب سردار گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور خوف زدہ لہجے میں بولا:

"معلوم ہوتا ہے لالی کے قبیلے والوں نے انھیں آپ کی گمشدگی کی اطلاع کر دی ہے، جاپانی فوجیوں کا ایک دستہ آپ کی تلاش میں یہاں پہنچ گیا ہے۔ وہ سارے گاؤں کی تلاشی لے رہے ہیں۔ آپ جلدی سے کہیں چھپ جائیے۔"

میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ کمرے میں کہیں چھپنے کی جگہ نظر نہیں آرہی تھی۔ آخر میں لکڑی کے ایک تخت پوش کے نیچے گھس گیا۔ سردار نے میری جیب سے نکلی ہوئی چیزیں اور بندوق بھی تخت پوش کے نیچے چھپا دی اور خود تیزی سے باہر نکل گیا۔ اگلے ہی لمحے چند جاپانی سپاہی کمرے میں داخل ہوئے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد انھوں نے سردار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ایک امریکی ہوا باز اس طرف آنکلا ہے۔ اگر وہ یہاں آئے، تو اسے فوراً گرفتار کر لو اور ہمارے حضور پیش کرو۔ اگر تم نے اسے پناہ دی، تو یہ بستی جلا دی جائے گی اور تم سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد میں تخت پوش کے نیچے سے نکلا۔ دروازے کی طرف دیکھا، تو خوف سے میری چیخ نکل گئی۔ چند جاپانی بندوقیں سیدھی کئے ہوئے میری طرف آرہے تھے۔

"تم بہت چالاک بننے کی کوشش کر رہے ہو، شاید تم یہ بھول گئے کہ تمھارے کپڑے ابھی تک باہر رسی پر لٹکے ہوئے ہیں۔"

ہتھیار ڈالنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میرے علاوہ انھوں نے لالی اور سردار کیتوپ کو بھی گرفتار کر لیا اور ایک کھلی جیپ میں بٹھا کر چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گئے۔

چھاؤنی دس مربع میل کے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں

ستر ہزار جاپانی فوجی مقیم تھے۔ ایک طرف ہوائی جہازوں کے اترنے کا وسیع و عریض اڈا تھا جس میں پختہ سڑکیں بنی ہوئی تھیں رہائشی کمرے بہت کم تھے، اس لیے ہمیں ایک تنگ کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ یہ کوٹھڑی شاید باورچی خانے کے طور پر استعمال کی جاتی رہی تھی کیونکہ اس کی چھت اور دیواریں دھوئیں سے کالی ہو رہی تھیں۔ تین دن تک ہم بھوکے پیاسے وہاں قید رہے۔ چوتھے روز صبح ہمیں ایک اعلیٰ فوجی افسر کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک آگئی اور غراتے ہوئے بولا:

"ہوں، تو یہ تم تھے جو مقامی باشندوں کو ہمارے خلاف بھڑکا رہے تھے۔"

"یہ غلط ہے۔ میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔"

"تو تم اس ویران جزیرے میں کیسے ٹپک پڑے۔"

میں نے طیارے کی تباہی سے اب تک اپنی پرانی کہانی سنا دی، لیکن اس کے تیور نہ بدلے۔

"بکواس بند کرو۔ یہ من گھڑت قصے تمھیں بے گناہ ثابت نہیں کر سکتے۔ اگر یہ کہانی سچ ہوتی، تو شاید ہم تمھیں گولی کا نشانہ بنانے پر اکتفا کرتے، لیکن تم ایک منصوبے کے تحت کام کر رہے ہو اور ہم چاہتے ہیں کہ تم ان تمام اشخاص کے نام اور پتے ہمیں بتا دو جو اس سازش میں تمھارے شریک ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں آپ کس سازش کا ذکر کر رہے ہیں۔"

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرے قریب آ کر دانت پیستے ہوئے بولا:

"جب سے تم آئے ہو مقامی باشندوں نے جابجا ہمارے خلاف مظاہرے شروع کر دیے ہیں۔ وہ ہمارے اکے دکے سپاہی کو جان سے مار ڈالتے ہیں اور ہماری سبزیاں چرا کر لے جاتے ہیں۔ ان کے پاس امریکی بندوقیں ہیں جو اس بات کا مکمل ثبوت ہیں کہ تم لوگ انھیں ہمارے خلاف بغاوت پر آمادہ کر رہے ہو۔"

"یہ الزام بالکل غلط ہے، میں یہاں ....."

ایک زناٹے کا تھپڑ میرے منہ پر پڑا۔ ابھی میں سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے میرے پیٹ میں ایک لات مار دی۔ دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو تھامے ہوئے میں زمین پر گر پڑا۔ اچانک لالی اپنی جگہ سے اچھلا اور جاپانی افسر کو دبوچ لیا۔ کمرے میں اس وقت صرف تین سپاہی موجود تھے۔ سردار نے ایک جست لگائی اور دو سپاہیوں کو زمین پر گرا کر ان پر چڑھ بیٹھا۔ اس عرصے میں میرے اوسان بحال ہو چکے تھے۔ میں نے لپک کر فرش پر گری ہوئی ایک بندوق اٹھالی اور سب کو ہاتھ اوپر اٹھانے کا حکم دیا لالی بندوق چلانا نہیں جانتا تھا، پھر بھی اس نے ایک بندوق اٹھالی اور جاپانیوں کی طرف سیدھی کر دی۔ ہم نے چاروں جاپانیوں کو ایک کونے میں سمٹنے پر مجبور کر دیا اور خود الٹے پاؤں چلتے ہوئے دروازے تک پہنچ گئے۔ ایک جست میں باہر نکل کر ہم نے دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا اور کنڈی چڑھا کر ہم اندھا دھند ایک طرف کو بھاگ اٹھے۔ کمرے میں سے جاپانیوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اندر سے دروازے کو بری طرح پیٹ رہے تھے۔ خاردار تاروں کو پھلانگتے ہوئے ہم دوڑتے ہوئے چلے گئے۔ میری ٹانگ کا زخم کھل گیا تھا اور اس میں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

دوڑتے دوڑتے ہم کھیتوں میں جا پہنچے جہاں سبزیاں بوئی گئی تھیں، وہاں چند جاپانی کام کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ راستے میں آن کھڑے ہوئے۔ ہم ایک لمحہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک کے سر پر بندوق کا کندہ مار کر میں صاف نکل گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو لالی اور سردار چار پانچ جاپانیوں سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ میں نے بندوق سیدھی کرتے ہوئے جاپانیوں کو ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا اور اس طرح میرے دونوں ساتھی نکل

بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک ڈیڑھ میل تک ہم اسی طرح دوڑتے چلے گئے۔ ایک جگہ چھوٹی سی ندی دکھائی دی۔ ہم نے یہاں تھوڑی دیر آرام کیا اور ڈٹ کر ٹھنڈا پانی پیا۔ بھوکے پیٹ پانی پیتے ہی مجھے قے آ گئی۔ لالی نے دو تین کچے ناریل توڑے، ان کا دودھ پی کر جان میں جان آئی۔ رات ہم نے یہیں گزاری۔ صبح ندی عبور کر کے دوسرے کنارے پہنچے ہی تھے کہ عقب سے شور سنائی دیا۔ غور سے دیکھا، تو دُور سے بے شمار جاپانی اس طرف آتے دکھائی دیے۔ مجھ میں مزید دوڑنے کی سکت نہیں تھی۔ ہم ایک جھنڈ میں گھس گئے اور گھنے پتّوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں جاپانی نہر کے کنارے آ پہنچے۔ میں نے ٹہنیوں کو ایک طرف ہٹا کر دیکھا، تو دہشت کی ایک لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ جہاں تک نظر کام کر رہی تھی، سر ہی سر دکھائی دے رہے تھے۔ نہر عبور کرتے ہی جاپانی مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔ وہ ایک ایک جھاڑی اور ایک ایک جھنڈ کو اچھی طرح دیکھ بھال رہے تھے۔ بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ آن کی آن میں وہ ہمارے سروں پر آن پہنچے۔ میں نے اپنی بندوق سنبھال لی۔

"ہاتھ اوپر اٹھا لو اور خاموشی سے باہر نکل آؤ، ورنہ گولی مار دیں گے۔"

میں نے آواز کی سمت کا تعیّن کرتے ہوئے بندوق سیدھی کر دی اور لبلبی دبا دی۔ فائر کی آواز سنائی دی اور اگلے ہی لمحے کسی نے میری بندوق کھینچ لی۔ میں نے لپک کر دوسری بندوق اٹھانا چاہی، لیکن ایک زور کا دوہتّڑ میرے سر پر پڑا اور میں زمین پر گر گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں ایک مسلّح دستے کی نگرانی میں دوبارہ چھاؤنی کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

ایک دفعہ ہمیں ایک تہہ خانے میں بند کر دیا گیا۔ چار دن گزر گئے۔ بھوک اور پیاس سے ہمارا دم نکلا جا رہا تھا۔ اٹھ کر کھڑے ہونے کی سکت نہیں تھی۔ گیلے اور بدبودار فرش پر ہم بے سدھ پڑے تھے۔ پانچویں صبح دروازہ کھلا اور ہمیں بیس سپاہیوں کی نگرانی میں دوبارہ اسی افسر کے پاس لے جایا گیا جو غالباً اس چھاؤنی کا انچارج تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ غصّے سے دانت پیستے ہوئے بولا:

"تمھیں ایک اور موقع دیا جاتا ہے۔ صاف صاف بتا دو کہ تم نے اب تک کتنے لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا ہے، ورنہ....."

میں نے اسے ایک بار پھر یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہم بے قصور ہیں اور مقامی باشندوں کی بغاوت میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں، لیکن اس نے ایک نہ مانی۔ چند سپاہیوں کو بلا کر اس نے دھیرے سے کچھ کہا۔ ہمیں ایک کھلے کمرے میں لے جایا گیا جہاں پانی کے نل لگے ہوئے تھے۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر ہمیں تین کرسیوں پر بٹھا دیا گیا۔ اب ربڑ کی تین نلکیاں ہر شخص کے منہ میں ٹھونس دی گئیں۔ یہ باریک نلکیاں ہمارے حلق تک پہنچ رہی تھیں۔ ایک جاپانی نے جو لباس سے لیفٹیننٹ معلوم ہوتا تھا، کونے میں لگی ہوئی ایک مشین کا بٹن دبا دیا، پانی کی تیز دھار نلکیوں میں سے ہوتی ہوئی ہم میں سے ہر شخص کے حلق میں اترنے لگی۔ میں نے سر اِدھر اُدھر ہلا کر پانی باہر نکالنے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ پانی کی دھار بہت باریک تھی، لیکن اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ جلد ہی ہمارے پیٹ بھر گئے۔ اب مجھے سخت تکلیف ہو رہی تھی، پیٹ رفتہ رفتہ پھولتا جا رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پانی کی یہ خونی دھار بند نہ ہوئی، تو پیٹ پھٹ جائے گا۔ پھر بے چینی سے میں سر اِدھر اُدھر پٹخنے لگا۔ ایک سیکنڈ گزر گیا۔ میرا سر تیزی سے گھوم رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے اپنے پیٹ کی طرف دیکھا، وہ لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا تھا۔ میں اپنی کرسی پر اچھلنے لگا۔ پانی کے چند قطرات میری سانس کی نالی میں داخل ہو گئے تھے اور میں مسلسل چھینک رہا تھا۔ مجھے سارا کمرہ گھومتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میرے پیٹ میں پانی کی موجیں

لہریں مار رہی تھیں۔ سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ شاید پانی معدے اور آنتوں کے بعد جگر اور دوسرے اعضا کا رُخ کر رہا تھا۔ میرے منھ سے دبی دبی چیخیں نکل رہی تھیں۔ میرے سارے جسم میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی اور میری رہی سہی ہمت جواب دے گئی۔ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح ایک آخری چیخ میرے حلق سے نکلی اور میرا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

مجھے ہوش آیا، تو میں اسی طرح کرسی پر بندھا ہوا تھا۔ میرا پیٹ پھول کر کُپّا ہو رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لالی ہوش میں تھا۔ ایک جاپانی سپاہی اس کے پیٹ پر لوہے کی ایک سلاخ سے ضربیں لگا رہا تھا۔ ہر بار جب وہ ضرب لگاتا، لالی کے پیٹ سے ڈھول کی مانند آواز نکلتی، لیکن آفرین ہے اس کی ہمت پر، مجال ہے جو اس نے منھ سے ایک لفظ بھی نکالا ہو۔ میری آنکھیں کھلی دیکھ کر دو سپاہی میری طرف متوجہ ہوئے۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹ سی کر آنے والی مصیبت کے لیے تیار ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے دونوں جاپانی میرے سر پر تھے۔ آہنی سلاخ کی پہلی ضرب نے مجھے ادھ مُوا کر دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی میرے دل اور جگر کو اپنی مٹھی میں لے کر دبا رہا ہو۔ تکلیف کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرے منھ سے نلکی نکالی جا چکی تھی، اس لیے میں پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔ انھوں نے میرے منھ میں ربڑ کی ایک گیند دے کر اوپر سے پٹی باندھ دی۔ اب میں بے بسی سے سر اِدھر اُدھر پٹخ رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور جاپانی افسرِ اعلیٰ کمرے میں داخل ہوا۔ قریب پہنچ کر اس نے طنزیہ لہجے میں کہا:

"کہو، طبیعت ٹھکانے لگی یا نہیں؟"

میرا منھ کھول دیا گیا۔ میں نڈھال ہو چکا تھا۔ مجھ میں بولنے کی سکت نہیں رہی تھی، پھر بھی میں نے جی کڑا کر کے کہا:

"میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتلا سکتا۔"

"اچھا یونہی سہی۔ تم یہ بتلا دو کہ اس علاقے میں تمھارے خفیہ ہوائی اڈے کہاں کہاں ہیں جہاں سے تمھارے بمبار طیارے اڑتے ہیں اور آن کی آن میں پورے علاقے پر بمباری کر کے دوبارہ روپوش ہو جاتے ہیں۔"

مجھے اُن اڈوں کا علم تھا، لیکن یہ باتیں میں بتانے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ میں نے ہونٹوں کو مضبوطی سے بند کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ افسرِ اعلیٰ کے اشارے پر ایک سپاہی نے بے ہوش سرجارکے پھولے ہوئے پیٹ پر اس زور سے آہنی سلاخ ماری کہ غریب کا پیٹ پھٹ گیا اور گندہ پانی باہر نکلنے لگا۔ خوف سے میرا سارا جسم منجمد ہو گیا۔

"تم اب بتانے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے اپنی پوری قوت سے چیختے ہوئے جواب دیا۔

"انھیں کھول دو اور کوٹھڑی میں ڈال دو۔"

تھوڑی دیر بعد ہم کوٹھڑی کے فرش پر بے جان پڑے تھے۔ ہمارے پیٹ پانی سے بھر چکے تھے۔ کچے فرش پر اپنا جسم گھسیٹتے ہوئے میں لالی کے پاس گیا۔ وہ ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اُسے جھنجھوڑا، تو اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، یہ کوٹھڑی کسی زمانے میں باورچی خانے کے طور پر استعمال کی جاتی رہی تھی۔ ایک کونے میں چند اینٹیں پڑی تھیں جو غالباً چولھا بنانے کے لیے یہاں لائی گئی تھیں۔ میں نے انھیں ایک دوسرے کے اوپر رکھا اور پیٹ کو ان پر رکھ کر زور سے دبایا۔ جنگلی بھینسوں کی طرح ڈکراتے ہوئے مجھے قے آ گئی۔ دو تین مرتبہ یہی عمل انجام دینے سے میرے پیٹ کا سارا پانی منھ کے راستے خارج ہو گیا۔ میری حالت بہتر ہو چکی تھی پھر بھی لالی کے پیٹ سے پانی نکالنا ضروری تھا۔ میں نے اس پر

کبھی یہی طریقہ آزمایا۔ تھوڑی دیر میں ہماری مشکل آسان ہو گئی۔ کوٹھڑی کا سارا فرش گندہ ہو چکا تھا۔ کمزوری سے ہم نیم جان ہو رہے تھے۔ اسی حالت میں نیند نے ہمیں آن لیا۔

رات بھر سردار کی صورت آنکھوں کے سامنے رہی جس کا کھولا ہوا پیٹ ایک ہی ضرب سے پھٹ گیا تھا۔ صبح ہمیں ایک ایک پیالہ دودھ اور سیاہ آٹے کی دو ڈبل روٹیاں کھانے کو دی گئیں۔ کھانے کے بعد ہمیں دوبارہ اسی کمرے میں لے جایا گیا۔ سردار کی لاش ابھی تک فرش پر پڑی تھی، اس کا منہ کھلا تھا اور چہرے پر مکھیاں منڈلا رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر ہماری آنکھیں نم ہو گئیں۔ ہمیں دو الگ الگ کرسیوں پر بٹھا کر ستونوں سے بٹی ہوئی رسی سے باندھ دیا گیا۔ ایک سپاہی اس رسی پر پانی ڈالنے لگا۔ جوں جوں یہ رسی بھیگتی جا رہی تھی، اس کی گرفت میرے جسم پر سخت ہو رہی تھی جیسا کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا، یہ رسیاں ایک خاص سرکنڈے سے بنائی جاتی تھیں جو اس علاقے میں عام ملتا تھا۔ رسی چاقو کی طرح جسم کو کاٹ رہی تھی بعض مقامات پر تو یہ رسی گوشت میں گھس گئی تھی۔ لیفٹننٹ دوبارہ کمرے میں آیا اور پوچھنے لگا کہ کیا ہم سب راز بتانے کے لئے تیار ہیں۔ میرے انکار پر وہ واپس چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں کھول دیا گیا اور نقاہت سے ہم فرش پر گر پڑے۔ تین سپاہیوں نے ہمیں گھسیٹ کر باہر لا کھڑا کیا۔ صحن میں چند ٹنڈ منڈ درخت کھڑے تھے جن کی سوکھی شاخوں پر مردار خور پرندے بیٹھے تھے۔ دو سپاہی سیڑھی لگا کر اوپر چڑھ گئے، اور ہمارے کندھوں سے رسے باندھ کر ہمیں ایک درخت کی سب سے اونچی شاخ سے باندھ دیا گیا۔ اب ہمارے جسم ہوا میں لٹک رہے تھے۔ دونوں کندھوں پر سارا وزن تھا اور بغلیں زخمی ہوتی جا رہی تھیں۔ ہم چمگادڑوں کی طرح درخت سے لٹکے ہوئے تھے۔

لیفٹننٹ نے قریب آ کر اونچی آواز میں کہا،

"اچھا بیٹا، خدا حافظ! کل ملیں گے جب تمہارے جسم سے سارا گوشت غائب ہو چکا ہو گا۔ اس عرصے میں اگر سب کچھ بکنے پر آمادہ ہو جاؤ، تو گیٹ پر کھڑے ہوئے سپاہی کو کہہ دینا۔ ہم تمہیں اتار دیں گے۔"

میں نے نفرت سے اس پر تھوکا اور وہ گالیاں بکتا ہوا احاطے سے باہر نکل گیا۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ ہمارے کندھے درد سے ٹوٹنے لگے۔ میں نے لالی کی طرف بے چارگی سے دیکھا۔ اس کے منہ سے دبی دبی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ بے چارہ لڑکا صرف میری وجہ سے یہ ساری تکلیف برداشت کر رہا تھا۔ میرا دل بھر آیا۔ اچانک ایک نئی مصیبت نے مجھے آن لیا۔ درخت پر بیٹھے ہوئے مردار خور آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ ہم بے بس تھے اور وہ آزاد۔ یہ پرندے، گدھ کی مانند تھے۔ ان کی صورت دیکھ کر خوف آتا تھا۔ ان کے لمبے لمبے غلیظ پنجوں پر خون کے دھبے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی آنکھیں میلی اور خونخوار تھیں۔ ایک پرندہ میرے کندھے پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کندھے جھٹک کر اسے اڑانے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اگلے ہی لمحے اس نے میری گردن پر چونچ آزمانا شروع کر دی۔ میں نے گردن ہلائی اور سارے جسم کو جھٹکے دیے، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نئی مصیبت کا سامنا کرنا میرے لئے بہت مشکل تھا۔ اب مجھے لیفٹننٹ کے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے جاتے وقت کہے تھے۔ اس صورت میں تو واقعی ایک رات میں ہمارے جسموں سے گوشت غائب ہو جائے گا۔ میں نے لالی کی طرف دیکھا، اس کا دھڑ تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ دو مردار خور پرندے اس کے چہرے پر بار بار حملے کر رہے تھے۔ مجھ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ میں نے زور زور سے آوازیں دیں۔ میرا ارادہ تھا کہ لیفٹننٹ سے صاف صاف کہہ دوں کہ لالی بے قصور ہے، وہ مجھے

جس قدر چاہیں سزا دیں، لیکن لالی کو چھوڑ دیں۔ میں دیر تک مدد کے لئے پکارتا رہا لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔ شام کا جھٹپٹا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ رات کی تاریکی میں تو یہ پرندے اور شیر ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ کسی طرح اس مصیبت سے نجات حاصل کی جائے۔

آخر بچپن کی سیکھی ہوئی ورزشیں میرے کام آ گئیں میں نے اپنے سارے جسم کو جھولے کی طرح دو تین ہلکورے دئے اور پھر ایک جھٹکے سے ٹانگیں اس شاخ سے پھنسا دیں جس سے میں رسی کے ذریعے بندھا ہوا تھا۔ اب میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ گرفتاری کے وقت ہماری تلاشی لی گئی تھی، لیکن مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ چاقو ابھی تک میرے پاس تھا۔ آخر پچھلی جیب سے وہ مل گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا چاقو تھا جس کا پھل بمشکل ڈیڑھ انچ کے قریب تھا، تاہم اس وقت یہ بہت کام آیا۔ یہ درخت جس پر ہمیں "پھانسی" دی گئی تھی زمین سے کوئی تیس فٹ اونچا تھا اتنی بلندی سے گرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا، لیکن درخت پر لٹکے رہنے سے بہر حال بہتر تھا۔

میں نے چاقو دانتوں میں پکڑ لیا اور رسّی کاٹنا شروع کر دی تقریباً بیس منٹ میں میں اپنی رسّی کو کاٹنے میں کامیاب ہو گیا اور دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ خوش قسمتی سے میرے زیادہ چوٹیں نہیں آئیں۔

کپڑے جھاڑتا ہوا میں اٹھ بیٹھا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دُور دور تک کوئی جاپانی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ٹانگ کے زخم کی وجہ سے مجھ میں درخت پر چڑھنے کی ہمت نہیں تھی، لیکن مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق یہ کارنامہ بھی انجام دینا پڑا۔ دو تین بار گرا اور چوٹ کھائی، تاہم آخری مرتبہ میں اس شاخ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جس سے لالی لٹک رہا تھا۔ میں نے اسے اوپر کھینچنے کی بے حد کوشش کی، لیکن اس کا سارا جسم منجمد ہو چکا تھا اور اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ بازوؤں کے سہارے ٹہنے تک پہنچ سکے۔ تکلیف سے وہ ادھ موا ہو رہا تھا۔ الفاظ اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ میں نے جی کڑا کرتے ہوئے اس کی رسیاں کاٹ دیں اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ میں ہانپتا ہوا نیچے اُترا، وہ ساکت پڑا تھا۔ اسے ہوش میں لانے کے لئے پانی کی ضرورت تھی جو سر دست ملنا ناممکن تھا میں اس کے ہاتھ پیروں کی مالش کرنے لگا۔ بار بار میں اس کے سینے پر کان رکھ کر دیکھتا کہ اس کا دل حرکت کر رہا ہے یا نہیں۔ اس کی نبض بہت مدّھم چل رہی تھی۔ گھنٹے بھر کی مالش نے اس کے جسم میں قدرے حرارت پیدا کر دی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ رات بھر ہم وہیں بیٹھے رہے۔ صبح احاطے کا دروازہ کھلا اور لیفٹیننٹ چند سپاہیوں کے ہمراہ اندر آیا۔ ہمیں زمین پر بیٹھے دیکھ کر وہ تاؤ میں آ گیا۔

"شیطانو، تم تو زمین پر پاؤں پسارے اس طرح بیٹھے ہو جیسے یہ تمھاری خالہ کا گھر ہو۔"

سنگینوں کے سائے میں ہمیں دوبارہ افسرِ اعلیٰ کے پاس لے جایا گیا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ میز پر بیٹھا ہوا جاپانی افسر مجھے اس طرح دکھائی دے رہا تھا جیسے پانی کی لہروں پر کسی چہرے کا عکس ہو۔ بار بار میں سٹول سے زمین پر گر پڑتا اور وہ لوگ مجھے دوبارہ سٹول پر بٹھاتے۔

"دیکھو کیپٹن، ہم نہیں چاہتے کہ تم اپنی جان گنوا بیٹھو اور پھر اس کالے کلوٹے کا کیا قصور ہے جو تم اپنے ساتھ اسے بھی موت کے منہ میں دھکیل رہے ہو۔ بہتر یہی ہے کہ تم سب کچھ مجھے بتا دو۔ ہم تمھیں بحفاظت تمھارے علاقے تک پہنچا دیں گے اگر تم چاہو گے، تو ہم تمھیں جاپان بھیج دیں گے جہاں سے جنگ ختم ہونے پر تم اپنے گھر جا سکو گے۔ تم ابھی نوجوان ہو، ہو سکتا ہے تمھارے بچے بھی ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ وہ یتیم ہو جائیں



دوسری جنگِ عظیم کا ایک منظر

اور تمہاری بیوی ساری عمر بیوگی کی زندگی گذارے۔ آخر تم اپنے ساتھ ان معصوموں کی جان کے دشمن کیوں ہو۔ میں تمہیں آخری موقع دیتا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو۔ میں جانتا ہوں اس وقت تم جذبات کی رَو میں بہہ رہے ہو، اس لئے سنجیدگی سے غور نہیں کر رہے۔"

میں نے جواب دینے کی کوشش کی، لیکن کمزوری کی وجہ سے لب نہ ہل سکے اور میرا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نرم اور آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا

دو سپاہی جو جنگی قیدی بنائے گئے



تھا قریب ہی لالی بھی ایک بستر میں آرام کر رہا تھا۔ ایک بوڑھا جاپانی دروازے میں بیٹھا تھا مجھے اٹھتے دیکھ کر وہ فوراً میرے پاس آیا اور الماری سے گرم بھنے ہوئے گوشت کی ایک پلیٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ ایک لفظ کہے بغیر میں کھانے پر پل پڑا۔ پانی کا گلاس پی کر میری جان میں جان آئی۔ میں نے لالی کو اٹھایا۔ اسے بھی گوشت کی ایک پلیٹ مل گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں گرم پانی سے غسل کرا دیا گیا۔ نہاتے وقت میں نے جسم پر بے شمار زخم دیکھے۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک طاقچے میں رکھی ہوئی مرہم مل گئی۔ میں نے تولیے سے جسم خشک کیا اور تمام زخموں پر مرہم مل دی۔ بغلوں سے خون رسنے لگا تھا، اس لئے تولیہ کو پھاڑ کر ایک پٹی بنائی اور اسے زخم پر باندھ دیا۔ لالی بھی غسل سے فارغ ہو گیا، تو ہمیں دوبارہ افسرِ اعلیٰ کے پاس لے جایا گیا۔ وہ بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے وہی پرانا سوال دہرایا۔

میرے صاف انکار کر دینے پر وہ آگ بگولہ ہو گیا۔

"تو یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔"

میں خاموش رہا۔ اس نے لیفٹننٹ کو بلایا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ بیس سپاہیوں کی نگرانی میں ہم چھاؤنی سے باہر نکل آئے چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں سے ہوتے ہوئے ہم ایک ڈھلوان جگہ پہنچے جہاں چاروں طرف انسانی کھوپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اچانک لالی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا میں نے اس سے وجہ پوچھنے کی کوشش کی، لیکن وہ منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر آنسو بہاتا رہا۔ ایک کھوہ کے پاس پہنچ کر ہم رک گئے۔ دو سپاہیوں نے کچے گوشت کے چند ٹکڑے کھوہ میں پھینک دئے۔ لیفٹننٹ نے قریب آ کر مجھے تمام کپڑے اتارنے کا حکم دیا۔ میں نے خاموشی سے تعمیل کی۔ لالی نے مزاحمت کی، لیکن پانچ چھ جاپانیوں نے زبردستی اس کے کپڑے اُتروا دئے۔

ب ہم باہر کھڑے تھے۔ اچانک دو سپاہیوں نے مجھے اٹھالیا ر کھوہ میں پھینک دیا۔ ابھی میں سنبھلنے نہ پایا تھا کہ لالی کا جسم تھ پر آگرا۔ یہاں باہر کی نسبت تاریکی تھی، اس لیے شروع س میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ آہستہ آہستہ ہماری آنکھیں کام نے لگیں ——— یہ کھوہ نیچے دُور تک چلی گئی تھی۔ کچھ دُور تک لو کام کرتی تھی اور پھر اتھاہ تاریکیوں میں ڈوب جاتی تھی۔ س جگہ پر ہم نیم دراز تھے، وہاں سے سُرنگ کا منہ کم و بیش پچاس ٹ کے فاصلے پر تھا۔ ہمیں جاپانی سپاہیوں کے سر نظر آرہے تے جو سُرنگ کے "ہر" پر پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے لالی سے س کے رونے کا سبب دریافت کرنا چاہا، لیکن وہ ایک بار پھر نے لگا بمشکل اسے خاموش کیا۔

"موت بے چینی سے ہماری منتظر ہے۔" اس نے ہچکیاں تے ہوئے بتایا۔

"کیا مطلب؟"

"میں اس غار سے بخوبی واقف ہوں۔ اس میں چیونٹیاں رہتی کروڑوں کی تعداد میں یہ چیونٹیاں اس علاقے کی ظالم ترین مخلوق ہیں پانیوں کی آمد سے قبل ہم لوگ مجرموں کو یہاں پھینک دیا کرتے تھے یہ چیونٹیاں آن کی آن میں انھیں چٹ کر جاتی تھیں۔"

"کیا یہاں سے بچ کر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے؟" میں بے صبری سے پوچھا۔

"ایک ہی راستہ ہے جس پر جاپانی پہرہ دے رہے ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ چیونٹیاں؟"

"نیچے کھوہ میں ہیں ابھی یہاں پہنچ جائیں گی۔ انھیں گوشت کی بو فوراً آجاتی ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا جب ہم باہر کھڑے ے تو جاپانیوں نے کچے گوشت کے چند ٹکڑے اندر پھینکے تھے۔"

ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا۔ مدھم سی ن میں ہمیں گوشت کے وہ چند ٹکڑے تلاش کرنے میں زیادہ



جاپانی فوج اپنی شکست سے قبل

دقت پیش نہیں آئی۔ میں نے جلدی جلدی انھیں ریت میں دبا دیا لیکن اس اثنا میں یہ ٹکڑے اپنا کام کر چکے تھے۔ ہم سرخ چیونٹیوں کے ایک لشکرِ عظیم کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ چکے تھے۔ وہ کروڑوں کی تعداد میں تھیں اور سُرنگ کی تہہ سے ہماری طرف آرہی تھیں۔ سناٹے میں ان کے زمین پر رینگنے کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ میرا دماغ پھٹنے لگا۔ میں نے لالی کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں موت کی سیاہی تھی۔ دونوں ہاتھ زمین پر رکھے وہ خاموشی سے چیونٹیوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"یہ چیونٹیاں انتہائی زہریلی ہوتی ہیں۔" اُس نے سرگوشی کی۔

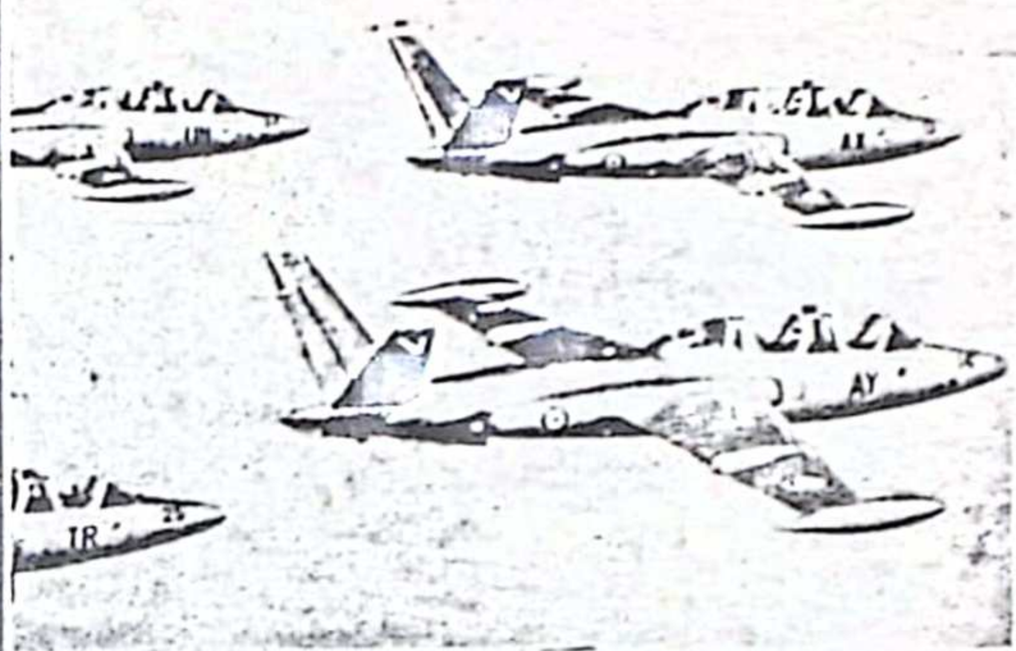
وقت گذرتا جارہا تھا۔ میرا سانس رُک گیا تھا۔ پھٹی پھٹی

ایک سپاہی کا ہزاروں سے یوں مقابلہ ہوتا ہے



نکھوں سے میں سُرخ لشکر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک منٹ گزر گیا، پھر دوسرا ـــــ اور پھر اچانک ہی لالی کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔ وہ مجھ سے ذرا آگے تھا اور چیونٹیوں کے ہراول دستے نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ درد سے بلبلاتا ہوا وہ دونوں ہاتھوں سے چیونٹیوں کو اپنے جسم پر چڑھنے سے روک رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے سُرنگ کے منہ کی طرف بھاگا۔ قریب پہنچ کر میں نے اسے زمین پر اوندھے منہ لیٹنے کا اشارہ کیا۔ آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے ہم اوپر پہنچ گئے۔ میں نے مٹی کے ایک ڈھیلے کو سَر کے سامنے رکھا تاکہ جاپانی مجھے دیکھ نہ سکیں، اور باہر نظر دوڑائی۔ صرف تین سپاہی بندوقوں کا سہارا لئے باہر کھڑے تھے۔ وہ آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ لیفٹننٹ ان سے کچھ فاصلے پر رومال بچھائے زمین پر بیٹھا تھا۔ اس نے ایک مڑا تڑا اخبار گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اچھی طرح سے اندازہ لگانے کے بعد لالی کے کان میں آخری ہدایات دیں۔ اگلے ہی لمحے ہم دونوں ہاتھوں سے ریت سپاہیوں کی آنکھوں میں پھینکنے لگے۔ ہمارا حملہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ وہ سنبھل نہ سکے اور آنکھیں ملنے لگے۔ ان میں سے ایک نے بندوق ہماری طرف سیدھی کر دی اور لبلبی دبانے ہی والا تھا کہ میں نے لپک کر نالی کا رخ آسمان کی طرف پھیر دیا۔ اس اثنا میں لالی ایک بندوق چھین چکا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے بندوق پکڑ کر لیفٹننٹ پر دو فائر کر دئے جو اپنی جگہ سے اُٹھ کر جیب سے ریوالور نکال رہا تھا۔ غار کے منہ پر ابھی تک گرد کے بادل چھائے ہوئے تھے اور لالی دونوں ہاتھوں سے مٹی اُڑا رہا تھا۔ میں نے گرد میں گھس کر ایک سپاہی کے سر پر بندوق کا کندہ مارا۔ اب صرف دو سپاہی میدان میں باقی رہ گئے تھے۔ لالی ان میں سے ایک سے گتھ گیا۔ تیسرا سپاہی ابھی تک آنکھیں مل رہا تھا۔ میں نے اس پر یکے بعد دیگرے تین فائر کئے۔ اب میدان صاف تھا۔ لالی اپنے مدِ مقابل کی مرمت کر چکا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ہم چھاؤنی کی مخالف سمت دوڑنے لگے۔ فائر کی آواز سن کر چھاؤنی کی طرف سے چند سپاہی آ رہے تھے۔ ہم ایک درخت کے تنے کی آڑ میں چھپ گئے۔ سپاہی گزر گئے تو ہم باہر نکلے اور اندھا دھند ساحل کی طرف دوڑے۔ عین اس وقت آسمان پر امریکی بمبار طیارے دکھائی دئے۔ چھاؤنی پر پہنچ کر انھوں نے خوب بمباری کی۔ جاپانیوں میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور کسی کو بھی ہمارے فرار ہو جانے کا علم نہیں ہوا۔ ساحل پر پہنچ کر ہم رُک گئے۔ سمندر کو عبور کرنا ہمارے بس کا روگ نہ تھا۔ ریت پر کھڑے ہو کر ہم زور زور سے چلانے لگے۔ طیارے کافی نیچی پرواز کر رہے تھے لیکن کسی نے ہم پر توجہ نہ دی۔ مجھے دُور سے ایک سیاہ جھنڈا دکھائی دیا۔ لالی نے بتایا کہ یہ نیو برٹن کے باشندوں کا جھنڈا ہے۔ بھاگم بھاگ ہم وہاں پہنچے اور بانس سمیت جھنڈا اکھاڑ لائے۔ چھاؤنی پر بمباری کرنے کے بعد طیارے فوراً ہی فضا میں بلند ہو جاتے تھے۔ خوش قسمتی سے ایک طیارے والوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ ہم زور زور سے جھنڈا ہلا رہے تھے۔ اور پوری قوت سے چیخ رہے تھے۔ طیارے نے فضا میں ایک چکر کاٹا اور ہمارے سروں پر سے گزر گیا۔ اس مرتبہ کھڑکی میں سے ایک سر باہر نکلا ہوا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ فلائٹ لیفٹننٹ ڈگلس تھا۔ دوسری مرتبہ جب طیارہ ہمارے قریب سے گزرا، تو میں نے پوری قوت سے اسے آواز دی۔ خوش قسمتی سے اس نے مجھے پہچان لیا۔ تیسری مرتبہ اس نے کھڑکی کھول کر سیڑھی باہر پھینکی۔ ہم نے تیزی سے بھاگتے ہوئے سیڑھی پکڑ لی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں رسّے کی ایک سیڑھی سے چمٹے ہوئے سمندر عبور کر رہے تھے۔ اس شام ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے جہاں تین ماہ ہسپتال میں رہنے کے بعد ہم اس قابل ہو سکے کہ وطن واپس جا سکیں۔

جنگ کے خاتمے پر لالی مجھ سے رخصت ہو کر اپنے وطن چلا گیا۔ ★



نازیوں کے بم ان کی تلاش میں تباہی مچاتے رہے

انعام یزدانی

سیکرٹ سروس ایجنٹ کرٹ لانگ کو اپنی آنکھوں پر پل بھر کے لیے یقین نہیں ہوا۔ وہ اپنی سائیکل سے اتر کر اس موٹر کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا جو ابھی اس کے قریب سے گزری تھی۔ اور ناروے کے اس گاؤں کی بڑی شاہراہ سے مڑ کر ایک پرکشش مکان کے احاطے میں کھڑی ہو گئی تھی۔ دوسرے ہی لمحہ وہ اپنی سائیکل پر سوار ہو کر تیزی سے گاؤں کی دوسری طرف چلا جہاں ان دنوں اس کی رہائش گاہ تھی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ نازیوں کے ذریعہ حال ہی میں قبضہ کیے گئے ناروے کی دارالحکومت اوسلو میں قائم شدہ سکریٹ سروس کے صدر دفتر سے اپنے شارٹ ویو سیٹ پر باتیں کر رہا تھا۔

"میں نمبر ۲۹۸ بول رہا ہوں ـــ وہ اپنی عجلت کو قابو میں کرنے میں بڑی دشواری محسوس کر رہا تھا۔ شہنشاہ ہاکون نے ابھی ابھی نیرگ سنڈ گاؤں کی سرائے میں آ کر قیام کیا ہے۔ ان کے ساتھ شہزادہ اولاف، وزیر خارجہ ہالودان کاٹ اور وزیر سپلائی ٹرگ تریلی بھی ہیں۔ ایک کوئی میجر ساتھ میں ہے۔ جسے میں نہیں جانتا۔"

صرف چار دن پہلے ۱۹۴۰ء کی ۹ اپریل کو جبکہ موسم کی گرمیں ابھی پھوٹی بھی نہ تھیں۔ کہ ہٹلر نے اپنی پوری طاقت سے اچانک ناروے اور ڈنمارک پر ایک ساتھ حملہ کر دیا۔ مغربی دوست ملکوں اور جرمنی کے دوران گزشتہ آٹھ ماہ سے چل رہی جنگ میں ناروے اور ڈنمارک بالکل غیر جانبدار رہے تھے۔ لیکن ہٹلر کو یہ پسند نہ آیا تھا۔ ڈنمارک نے تو فوراً اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے لیکن ناروے نے جس کے پاس صرف شہری فوج اور برائے نام فضائیہ تھی اور جس نے گزشتہ ہزار سال سے کوئی جنگ نہ لڑی تھی۔ ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس صورت میں اس مقابلہ کا سہرا بندھا ناروے کے ۶۸ سالہ شہنشاہ ہاکون ہفتم کے سر جو اس عمر میں بھی مضبوط، طاقتور اور نڈر شخص تھے۔ جنہیں آزادی



ناروے کی فوج جس نے ہتھیار نہیں ڈالے.

عزیز تھی. جب تک ہاکون آزاد تھے، زندہ تھے. ناروے جنگ جاری رکھنے والا تھا اور نازیوں کے ذریعہ بنائی گئی کوئی بھی کٹھ پتلی حکومت اسے تسلیم نہ تھی.

نازی اس حقیقت سے واقف تھے. اسی لئے اس نازی حملے سے مہینوں پہلے نبرگ ستنڈ جس پر تب تک جرمن فوجوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا. اس طرح کے مختلف علاقوں میں لانگ جیسے بہت سے جرمن ایجنٹ پھیل چکے تھے. دارالحکومت میں شہنشاہ ہاکون کے بچ نکلنے کے فوراً بعد ہی تمام ایجنٹوں کو مطلع کر دیا گیا تھا.

"شہنشاہ کہاں ہیں ان کا پتہ لگایا جائے — اور ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے."

یہ ہدایت خود ہٹلر کی جانب سے ملی تھی. ہٹلر کا منصوبہ تھا کہ شہنشاہ کے تین سالہ پوتے ہیرلڈ کو ناروے کی گدی پر بٹھا کر اس کے نام پر اپنی حکومت قائم کی جائے. اس نے ناروے کے محاذ پر تعینات فوج کے کمانڈر جنرل نکولس وان فاکین ہرسٹ سے کہا تھا. "اگر یہ بے وقوف ناروے کے شہری شہنشاہ ہی چاہتے ہیں تو شہزادے ہیرلڈ کو گدی پر بٹھا دو."

لگاتار ۷۲ گھنٹوں سے جرمن فوجی شہنشاہ کا تعاقب کر رہے تھے اور شہنشاہ و شہزادہ اولاف اپنے دیگر تین ساتھیوں کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام پر بھاگے پھر رہے تھے. سب تھک کر چور ہو گئے تھے اور ان کے چہرے مرجھا گئے تھے. بزرگ سنڈ کی اس سرائے میں انہیں توقع تھی کہ کچھ گھنٹوں کا آرام مل جائے گا. باورچی خانے میں سرائے کی نگراں مارٹا نیلسن ان کے لئے کافی تیار کر رہی تھی.

سب خاموش بیٹھے تھے. بولنے تک کی سکت ان میں باقی نہ رہی تھی. صرف ۶ فٹ ۳ انچ لمبے، دبلے پتلے شہنشاہ ہاکون ہی خاموش نہ تھے. انہوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا. "میں اب بھی کہتا ہوں کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے." انکی آواز کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر گونجی.

"ہر بار جہاں کہیں بھی ہم ٹھہرتے ہیں منٹوں میں یہ نازی کتے آجاتے ہیں."

ٹھہر کر انہوں نے کچھ ہوا میں سونگھا. اور پھر پرسکون لہجہ میں کہا. "کافی کی مہک بڑی پیاری ہے."

لیکن ان لوگوں کی قسمت میں کافی نصیب نہ تھی.

اولاف کے تیز کانوں نے اسی لمحہ خطرے کی آہٹ سن لی اور وہ اسی لمحہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"میز کے نیچے چھپ جاؤ" وہ ایک دم چیخا۔ "جلدی کرو"

مردہ جسموں میں گویا ایک بار پھر زندگی آگئی ہو۔

پانچوں اشخاص فوراً ہی لکڑی کی اس مضبوط اور بڑی میز کے نیچے ایک دوسرے سے مل کر کسی طرح گھس کر بیٹھ گئے۔ کسی پہلوان کی مضبوط اور سڈول رانوں کی طرح مضبوط پایوں والی اس میز پر ہی ان کی تمام امیدیں وابستہ تھیں۔ اسی وقت سرائے کی کھپرے والی چھت پر گولیوں کے اولے پڑنے لگے۔

نازیوں کا وہ حملہ تقبنی دیر رہا ــ خوف اور ہیجان طاری رہا۔ بمبار جہاز غصہ میں جیسے دہاڑتے ہوئے بار بار نیچے کی جانب جھک رہے تھے۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے.. کھڑکیوں کے شیشے جھنجھناتے ہوئے ٹوٹ کر گر پڑے۔ پوری عمارت ہل گئی۔ دونوں وزیروں اور میجر ویڈ لے جسے لانگ پہچان نہیں پایا تھا۔ اور جو شہنشاہ ہاکون کا سالوں سے ذاتی محافظ رہا تھا۔ چہرے خوف سے سفید ہو گئے تھے۔ اولاف کی مٹھیاں رہ رہ کر بندھ جایا کرتی تھیں اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں غصہ سے وہ بدبدا اٹھتا تھا

آخر جہازوں کا شور ختم گیا۔ اور ان کے اوپر کی طرف اڑ کر جانے کی آواز سنائی دی۔

"کاش ہم اس حملہ کا جواب دے سکتے۔" چرچراتی آواز میں اولاف نے کہا۔

"وہ بار بار ہم پر حملہ کریں۔ اور ہم بس یونہی بیٹھے رہ جائیں۔ یہ دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔" اس نے اپنے پاس واحد ہتھیار کی طرف اشارہ کیا۔

"لیکن ایک ریوالور بھلا کیا کام کر سکتا ہے۔"

"ہمارا موقع بھی آئے گا.....۔" شہنشاہ ہاکون نے نرم لہجہ میں کہا۔ ان کی آواز میں برائے نام بھی گھبراہٹ نہیں تھی ــ "میں نے درست ہی کہا تھا۔" شہنشاہ نے کہا ــ "کہ ہمارا تعاقب ابھی بھی کیا جا رہا ہے۔"

"آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں ــ یور مجسٹی" تی نے فکرمند لہجہ میں کہا۔

"ہٹلر کوئی احمق نہیں ہے۔ آپ عوام کے نام لڑائی جاری رکھنے کے لئے پیغام نشر کر رہے ہیں۔ آپ نے ہٹلر کے سفیر کو بے عزت کیا اور ہٹلر جانتا ہے کہ جب تک زندہ ہیں، ناروے کے عوام آپ کو اپنا شہنشاہ مانتے رہیں گے۔"

"آپ کا مطلب ہے ــ وہ میرے والد کو بے رحمانہ طور پر ہلاک کر دیں گے۔"

اولاف نے کہا۔

شہنشاہ ہاکون نے جواب دیا ــ "ہاں مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا کرنے میں کچھ کسر باقی نہ چھوڑیں گے۔"



اور جیسے اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے نازیوں کے ہوائی جہاز دوبارہ آپہنچے ــ شہنشاہ اور ان کے ساتھیوں نے



نازیوں کے بم ان کی تلاش میں

پھر اسی میز کے نیچے پناہ لی۔ یہ دوسرا حملہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ خوفناک تھا۔ موت کے انتظار میں وہ سب سانس روکے بیٹھے رہے۔

گولیوں کی بوچھاڑ اور بمباری کے بعد جہاز پھر غائب ہو گئے تو اس وقت سرائے کی عمارت کئی جگہ سے ڈھ چکی تھی۔ باورچی خانے میں کافی بنانی ہوئی مسز نلیسن موت کی گہری نیند سو چکی تھی۔ لوہے کی مانند مضبوط میز نے شہنشاہ اور ان کے ساتھیوں کی حفاظت ضرور کی تھی لیکن بمباری سے ایک پتھر کا نکیلا ٹکڑا اچھل کر وزیر سیلاسی مسرتی کے آ لگا تھا اور ان کے ایک پیر میں گہرا زخم ہو گیا تھا۔ اس زخم کا فوری علاج لازمی تھا۔ اس حادثے نے ان کے لئے ایک مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔

شہنشاہ ہائلی نے کہا ——"اب ہم لوگوں کو یہاں سے نکل چلنا چاہیئے۔ لیکن پہلے ہمیں ڈاکٹر کی کے لئے کچھ کرنا چاہیئے —— "وینڈیل؟" شہزادے اولاف نے میجر سے کہا —— "جاکر دیکھو شاید کوئی ڈاکٹر مل جائے۔ گاؤں میں کوئی نہ کوئی تو ہوگا ہی۔ تب تک میں یہ دیکھ لیتا ہوں کہ ہماری موٹر کی کیا حالت ہے۔"

وینڈیل نے باہر آکر سرائے کے بڑے پھاٹک سے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ اپنی موٹر کی جانب بڑھتے ہوئے شہزادے اولاف کی تیز نگاہوں نے دور آسمان میں ایک سیاہ دھبے کو دیکھا۔ اسے یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ دشمن بمباری کے بعد اس انتظار میں ہیں کہ سرائے سے کہیں کوئی زندہ بچ کر نکلتا تو نہیں ہے۔ فوراً ہی اولاف نے وینڈیل کو آواز دی۔ مگر کم سننے والے وینڈیل کے کانوں تک آواز پہنچی نہیں۔ اولاف جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اس کی طرف دوڑا۔ لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی اور دوسرے ہی لمحہ وینڈیل زمین پر گر پڑا۔ ایک سے زائد گولیوں نے اپنی منزل پالی تھی۔

آخری رسومات کے لئے نہ وقت تھا اور نہ مناسب موقع وہاں زیادہ دیر ٹھہرا نہیں جا سکتا تھا۔ باقی لوگوں کے لئے فوری وہاں سے نکل چلنا ضروری تھا۔ خوش قسمتی سے موٹر کو کوئی خاص گزند نہیں پہنچی تھی۔ زخمی کو سہارا دیکر ان لوگوں نے موٹر میں لٹا دیا۔ اور پھر کہیں پناہ کی

تلاش میں ان کی موٹر مل پڑی۔

ناروے کے ایک بڑے حصے پر جرمنوں کا قبضہ ہوگیا تھا لیکن شمالی ناروے میں اب بھی لڑائی چل رہی تھی۔ وہاں کمانڈر ان چیف جنرل آٹو روز کی کمان میں ناروے کی پیدل اور فضائیہ نازی دشمنوں کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے۔ دوست ملکوں کی جانب سے امداد کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ وقت پر مدد مل جانے سے ناروے کو ہٹلر کے پنجے سے بچا لینے کی امید تھی۔ اس شہنشاہ ہاکون کو خود دشمنوں کے پنجے سے محفوظ رکھا تھا۔

اولاف شمال کی جانب موٹر بڑھائے چلا۔

اسٹرنگ وہیل پر ہاتھ رکھے ہوئے سامنے کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "کسی طرح یہ معلوم ہوتا کہ نازی سپاہی کہاں ہیں؟"

شہنشاہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا ——— "موجودہ حالت میں ہم لوگوں کو یہ مان لینا چاہیئے کہ وہ سب جگہ موجود ہیں ———"

برف پوش سڑک پر ان کی موٹر دوڑ رہی تھی۔ نبرگ سنڈ سے روانہ ہوئے انہیں چھ گھنٹے بیت چکے تھے۔ ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے شہنشاہ ہاکون نے کہا ——— "وہ کوئی ریڈیو اسٹیشن ہی ہے نا؟ تب تو میں یہاں سے اپنے ملک کے عوام کے نام پیغام نشر کر سکتا ہوں وہاں چل کر ہمیں دیکھنا چاہئیے۔"

اولاف نے موٹر ادھر موڑ دی۔ اور شہنشاہ ہاکون کے چہرہ پر مسکراہٹ ناچ اٹھی۔ کچھ دیر بعد ہی مائک کے سامنے ان کی آواز گونجنے لگی ——— "ناروے، آج حملہ کا شکار بنا ہوا ہے۔ امن پسند ناروے کے شہریوں پر ظالم حملہ آوروں نے بلاوجہ بمباری کر کے ہلاکت اور بربادی کا مظاہرہ کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں برتی ہے۔ عورتوں اور بچوں کو بے رحمانہ طور پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔"

"میں آپ لوگوں کو یہ نہیں بتا سکتا کہ میں اور شہزادہ اولاف ابھی ناروے کے کس حصہ پر ہیں کیونکہ جرمن ہماری جان کے دشمن بنے گھات میں بیٹھے ہیں۔"

"میں ناروے کے ان سبھی بہادر فوجیوں کی تعریف کرتا ہوں جو اس لڑائی میں اپنے اپنے مورچوں پر بہادری سے ڈٹے ہیں۔"

شہنشاہ ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ پہلا بم وہاں گرا۔ نازیوں کو اس کا پتہ لگانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی تھی کہ کنگ کا نام وہ پیغام کہاں سے نشر کیا جا رہا ہے۔

"خدا ناروے کی حفاظت کرے ———" شہنشاہ نے مائکروفون کے سامنے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک بم گرا۔

ریڈیو اسٹیشن کے کارکن نے مائک کا پلگ کھینچ کر نکال دیا۔ اور قریب قریب چیخ کر کہا ——— "اس راستے سے آئیں ...... یور میجسٹی!"

جب تک نازی طیارے بمباری کرتے رہے ——— شہنشاہ اور ان کے ساتھی باہر دیوار کے درختوں کی آڑ میں چھپے رہے۔ ریڈیو اسٹیشن کی عمارت دیکھتے ہی دیکھتے ملبہ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی۔ لیکن اس بار بھی یہ معجزہ ہی ہوا کہ ان کی موٹر آگے سفر کرنے کی پوزیشن میں تھی۔

طیارے اب وہاں سے کہیں دور چلے گئے تھے اور شہنشاہ مع اپنے ساتھیوں کے پھر اپنی موٹر میں آگے بڑھے۔ تیز رفتاری سے موٹر چلاتے ہوئے اولاف سوچ رہا تھا۔ کئی بار نازیوں کے ہاتھوں پڑنے سے بال بال بچے تھے۔ راستے میں کبھی کبھی کسی کسان کے گھر کھانا اور گرم

کافی مل جاتی مگر پناہ لینے کو شہنشاہ تیار نہ ہوتے۔ کیونکہ شمالی ناروے میں جہاں کمانڈر روز دشمنوں سے لوہا لے رہا تھا۔ وہاں جلد پہنچنا ضروری تھا۔

بالآخر قسمت نے ان کا ساتھ دیا۔ اور وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ راستے میں ان کی ملاقات اپنے فوجیوں سے ہوئی اور انہوں نے شہنشاہ کو کمانڈر روز تک۔۔ پہنچادیا۔۔۔ لیکن اس کے لئے انھیں موٹر چھوڑنا پڑی۔ فوجیوں نے ہتھ گولوں سے اس کے پرزے پرزے کر دیئے اور پھر سخت اور دشوار گزار راستوں سے ان کو آگے بڑھنا پڑا۔ ان کے لئے ایک اسٹریچر کا انتظام ہوگیا تھا۔

کمانڈر روز نے بتایا۔۔۔ "جرمن فوجی ہر طرف پھیلتے جارہے ہیں۔ ہماری طاقت کم ہوتی جارہی ہے۔ لیکن آج ناروے کے جنوب اور شمال میں، برٹش اور فرنچ فوج کے سپاہی پہنچ چکے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ ہم لوگوں کو ۔۔۔۔ ان کی مدد سے وہاں اپنا مورچہ بنانا چاہیئے۔"

"لیکن ۔۔۔۔" اولاف نے کہا ۔۔۔ "ہم لوگوں کو شہنشاہ کو یہاں سے جلد ہی اپنے ملک کے باہر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دینا چاہیئے۔"

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمانڈر روز نے کہا۔ "برٹش بحریہ کے بیڑے سے ہمارا رابطہ قائم ہوچکا ہے۔ میں ان سے شہنشاہ کو بحفاظت نکال لے جانے کی بات کرتا ہوں۔"

شہنشاہ ہاکون کو ناروے سے نکال لے جانے کے پلان بن گئے۔ لیکن پانچ یوم تک کچھ بھی ممکن نہ تھا۔ چھٹے دن ۲۹ راپریل ۱۹۴۰ء کو شہنشاہ ہاکون کو ناروے کے مغربی ساحل پر ایک مخصوص مقام پر پہنچنا تھا۔ جہاں سے انھیں برٹش جہاز ناروے سے باہر لے جانے والا تھا۔

جہاں تک نازیوں کا سوال تھا۔ آئندہ پانچ یوم تک شہنشاہ ہاکون ان کے لئے غائب ہوچکے تھے۔ لیکن ۲۸ راپریل کی شام کو شہنشاہ ہاکون نے کہا ۔۔۔ "اپنے ملک کے عوام کے نام، میں ایک پیغام ضرور نشر کروں گا۔ انھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں کیوں یہاں سے جارہا ہوں۔"

شہنشاہ نے ریڈیو پر اپنے عوام کے نام ایک پیغام نشر کرتے ہوئے کہا۔ "میں ناروے سے باہر کچھ ہی دنوں کے لئے جارہا ہوں۔ میں واپس آؤں گا ۔۔۔ اور دشمنوں کی شکست یقینی ہے ۔۔۔" اور شہنشاہ نے اپنا یہ وعدہ ۱۹۴۵ء کو پورا کر دیا۔

شہزادہ اولاف نے اپنے باپ کو جلدی ہی ریڈیو اسٹیشن سے باہر نکالا۔ اور پھر وہ ایک فوجی اسٹاف کار میں بیٹھ کر مولڈ بندرگاہ کی جانب چل پڑے۔ جہاں سے۔۔ شہنشاہ کو ایک برطانوی جہاز پر سوار ہونا تھا۔ ان کے آگے پیچھے اور گاڑیاں بھی چل رہی تھیں۔ جن میں فوجی جوان سوار تھے۔

لیکن اس ریڈیو براڈ کاسٹ نے جرمنوں کو ان کی نشاندہی کرادی تھی۔ وہ مولڈ کے قریب پہنچ ہی رہے تھے کہ مشین گنوں کی بوچھاڑ نے ان کا استقبال کیا۔ شاہ کے۔۔ محافظ فوجی جوانوں نے دشمن کی گولیوں کا جواب گولیوں سے دینا شروع کیا۔ شہنشاہ اور ان کی پارٹی ایک دیوار کی آڑ میں لیٹ گئے۔ یہ مقام دشمن کی گولیوں سے محفوظ تھا۔ اچانک اولاف اٹھ کھڑا ہوا۔

"ابھی آیا ۔۔۔" کہہ کر شہنشاہ کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ ایک جانب گھوم کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ محافظ دستے کے فوجی کپتان کے پاس پہنچا۔

نازی فوجی کی گولیاں ان کے سروں سے گزر رہی تھیں۔

کپتان نے کہا ـــ "ہم لوگوں کو واپس مڑنا ہوگا۔"

"نہیں ـــ" اولاف نے کہا ـــ "ہم واپس نہیں مڑ سکتے۔"

"لیکن ہم آگے بھی تو نہیں بڑھ سکتے۔ دشمنوں کی کافی بڑی فوج سڑک روکے کھڑی ہے۔"

اولاف کے پاس جواب دینے کا وقت نہیں تھا۔ اچانک اسے اپنے سے بیس گز کے فاصلے پر ایک سایہ نظر آیا۔ اس سایہ کا داہنا ہاتھ اپنے سر کے پیچھے اوپر کی جانب اٹھا ـــ ایک دستی بم۔

اولاف نے اپنے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی نشانے پر لگی اور وہ جرمن سپاہی زمین پر آ گرا۔ اولاف نے اپنا سر گھمایا۔ کپتان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

اولاف نے کہا ـــ "اگر میں بھولتا نہیں ہوں تو اس کے پیچھے سے ایک راستہ نکلتا ہے۔ جو آگے جا کر عام شاہراہ سے مل جاتا ہے۔ یہ ایک پہاڑی راستہ تھا۔ لیکن اس سے کام نکل سکتا تھا۔ کچھ فوجی جوان دشمنوں کو الجھائے رکھنے کے لئے وہیں ڈٹے رہے۔ باقی لوگ اپنی منزل کی جانب چل پڑے۔ دو گھنٹوں کے بعد شہنشاہ اور ان کی پارٹی شمال کی جانب سے مولڈ میں داخل ہو گئے۔ ان کے ساتھ ایک موٹر میں حفاظت کے لئے فوجی جوان تھے۔ کپتان نے وہ مقام تلاش کر لیا جو پہلے سے مقرر تھا۔ پھر پہاڑی کی چوٹی سے پہاڑی کی چوٹی سے سمندر کی جانب روشنی کے ذریعہ اپنی موجودگی کا اشارہ کر دیا۔

کچھ دیر تک سوا اندھیرے کے کہیں کچھ نظر نہ آیا۔ برطانوی جہاز کیا نہیں پہنچ سکا؟ یا آنے میں تاخیر ہو گئی؟ تب تو شہنشاہ ہاکون کی زندگی اور بھی خطرے میں تھی۔ ان لوگوں کے ذہنوں میں مختلف خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن اسی وقت انھیں ان کے اشاروں کا جواب سمندر کی طرف سے مل گیا۔ انھیں وہاں سے ڈو میل جانب شمالی ساحل سمندر پر پہنچنا تھا۔ جہاں سے ایک موٹر لانچ انھیں سمندر میں کھڑے ایک جہاز میں پہنچانے والی تھی

موٹر آگے بڑھی۔ آگے ایک موڑ تھا جو سیدھا سمندر کی طرف چلا گیا تھا۔ گاڑی آگے بڑھتی رہی۔ اور تب اچانک سڑک پر روشنی کے ذریعہ ایک اشارہ ملا۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ برف پر پھیلی چاند کی روشنی میں برطانوی بحریہ کی پوشاک میں ملبوس ایک افسر کو کھڑے پایا۔ اس نے ان لوگوں کا استقبال کیا اور کہا "آپ چلنے کو تیار ہیں۔ یور مجسٹی؟"

شہنشاہ ہاکون کے اس طرح بچ نکلنے اور برطانیہ، فرانس اور پولینڈ کی مدد سے ناروے نے مکمل ۶۲ دنوں (۱۰ جون ۱۹۴۰ء) تک جرمن کے خلاف جنگ جاری رکھی ـــ جنگ کے ان ابتدائی دنوں میں۔ برطانیہ کے علاوہ دیگر کوئی ملک اتنے عرصہ تک لڑائی جاری نہ رکھ سکا ناروے کی لڑائی جاری ہی تھی کہ جرمنی کے سامنے ہالینڈ نے چار دن میں ہی گھٹنے ٹیک دیئے، بیلجیم کل اٹھارہ دنوں تک جنگ جاری رکھ سکا۔ اور فرانس جس پر ۱۰ مئی ۴۰ء کو ہٹلر نے حملہ کیا تھا۔ جون کی ۱۴ تاریخ تک نازیوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔ ناروے پر قبضہ کرنے کے لئے ہٹلر کو اپنے ۶۵ ہزار فوجیوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ اور قبضہ ہو جانے کے بعد بھی ناروے نے کبھی شکست قبول نہیں کی۔ شہنشاہ ہاکون لندن ریڈیو سے برابر اپنے عوام کو مخاطب کرتے رہے اور ناروے کے لوگ اپنی آزادی کے لئے جرمنوں کو تب تک پریشان کرتے رہے۔ جب تک ۱۹۴۵ء میں ناروے دوبارہ آزاد نہیں ہو گیا

۵۵



اور پھر کامیابی نے ان کے قدم چومے

ریحو رعنا

سسٹو کے جنگی کیمپ سے ٹرک میں سوار ہوتے وقت کاف مین پر وحشت طاری تھی لیکن جب اس نے اپنے علاوہ چار دوسرے امریکی قیدیوں کو ٹرک میں موجود پایا، تو اس کے چہرے پر قدرے اطمینان کے آثار نمودار ہوئے۔ اور اس نے قریب کھڑے ہوئے جرمن محافظوں کی طرف دیکھ کر منہ چڑھایا۔ تینوں محافظ سیخ پا ہو کر اس کی طرف بڑھے اور وہ سہم کر اپنے ساتھیوں میں جا گھسا پیچھے سے آتے ہوئے سارجنٹ کے بھاری جوتوں کی آواز نے محافظ سپاہیوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ سارجنٹ نے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی طرف دیکھا، رکا جیسے وہ کوئی راز سونگھ رہا ہو، مگر کچھ کہے بغیر وہ کیبن میں ڈرائیور کے پاس جا بیٹھا۔

ٹرک کیمپ سے نکل کر فلورنس کو جانے والی شاہراہ پر دوڑنے لگا، ابھی اس نے ایک میل ہی کی مسافت طے کی ہوگی کہ اس کی بریکیں چیخ اٹھیں۔ اور ساتھ ہی بھیڑ بکریوں کا شور و غل بلند ہوا۔ لیکن ٹرک رکا نہیں۔ کاف مین نے ٹرک کی چھت کی جگہ تنی ہوئی ترپال کو تھوڑا سا ہٹا کر باہر دیکھنے کی کوشش کی، ٹرک کے پہیئے خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اطالوی گڈریوں کی کئی بھیڑ اور بکریاں سڑک پر تڑپ رہی تھیں۔ ڈرائیور کے برابر بیٹھا ہوا سارجنٹ گڈریوں کو راستہ صاف کرنے کا حکم دے رہا تھا لیکن بھیڑ، بکریوں کی تعداد اور ان کی اچھل کود کے آگے بھیڑیے بے بس تھے جب سارجنٹ کی درشت کلامی اور بڑھی تو غریب گڈریے بھی بدزبانی

پر اتر آئے۔ اس بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ٹرک کو ایک خوفناک جھٹکا لگا، اور وہ سڑک کی ایک جانب جھک کر کھڑا ہو گیا۔

سارجنٹ غضبناک ہو کر ٹرک سے کودا اور خون خوار بھیڑیے کی طرح گڈریوں پر جھپٹ پڑا۔ گڈریے بھی ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مل کر سارجنٹ کو زمین پر گرا لیا اور گھونسوں سے اس کی مرمت کرنے لگے۔ سارجنٹ درد کرب سے چلانے لگے۔ یہ دیکھ کر محافظ سپاہیوں میں سے دو سپاہی ٹرک سے اتر کر اس کی مدد کو پہونچ گئے اور گڈریوں کو کھینچ کر سارجنٹ کے بدن سے جدا کرنے لگے۔

کاف مین نے معنی خیز نظروں سے اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا اور پھر سب اس تنہا محافظ پر ٹوٹ پڑے جو ٹرک میں بیٹھا اپنے ساتھیوں کو گڈریوں کے خلاف اکسا رہا تھا۔ سپاہی اس غیر متوقع حملے سے اس قدر خوفزدہ ہوا کہ اس کی چیخیں آسمان کی خبر لانے لگیں۔ لیکن ٹرک سے باہر انسانوں اور بھیڑ بکریوں کا شور اتنا زیادہ تھا کہ کسی کو بھی اس کی دردناک موت کا علم نہیں ہوا۔ اب اس کی خود کار رائفل کاف مین کے ہاتھ میں تھی۔ پھر رائفل سے تین شعلے نکلے اور گڈریوں کے ساتھ لڑنے والے تینوں جرمن فوجی خاک و خون میں لوٹنے لگے۔ کاف مین نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جو ٹرک کا کیبن توڑ کر ڈرائیور کو ہلاک کر چکے تھے۔ کاف مین کے اشارے پر وہ سب ٹرک سے کود پڑے اور اطاوی گڈریوں کو دہشت زدہ چھوڑ کر گھنے جنگل میں غائب ہو گئے۔ وہ وہاں رات گئے تک چھپے رہے۔ رات کو آگے روانہ ہونے سے پیشتر کچھ سفر کرنے کی بجائے تنہا تنہا سفر کرنا کم خطرناک اور زیادہ سود مند ہے۔ اس فیصلہ کے بعد وہ چاروں مختلف سمتوں میں نکل کھڑے ہوئے۔

کاف مین اپنے ساتھیوں سے جدا ہو کر مغرب کی سمت روانہ ہوا۔ چھ دن جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھانتا ہوا۔ ساحل سمندر کی تلاش میں وہ جنوب کی طرف مڑ گیا۔ کئی دن بعد، لوکا اور کیرا وا کے پر رونق قصبات سے گزرتا ہوا، کیواری، پہنچا۔ اس شہر میں داخل ہوتے ہی سڑک نے ایک نہایت خطرناک موڑ لیا۔ سامنے آنے والا بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ کاف مین کو دور سے بھاری بھرکم جوتوں کی آہٹ سنائی دی۔ گھبراہٹ سے اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس نے اپنے ماحول پر طائرانہ نظر ڈالی۔ اسے تھوڑے فاصلہ پر درختوں کے جھنڈ نظر آئے۔ وہ ان کی طرف دوڑا اور خود کو ان میں چھپا لیا۔ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ جس جگہ وہ چھپا ہوا تھا۔ اسی مقام پر مخالف سمت کے دو فوجی آپس میں ملے۔ پیچھے سے آنے والے فوجیوں نے آ کر بتایا کہ ہم نے راستے میں ایک ٹرک دیکھا ہے جس کے قریب چار جرمن فوجی مرے پڑے ہیں۔ ہم یہ اطلاع ہیڈ کوارٹر دینے جا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کوئی بڑا سانحہ پیش آیا ہے۔

کاف مین نے جب یہ سنا تو اس کا خون منجمد ہو گیا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں کسی کی نظر نہ پڑ گئی ہو۔ وہ.. سانس روکے وہیں کھڑا رہا۔ دو تین گھنٹوں کے بعد نکلا اور دوڑنے لگا۔

فرار ہونے کے بعد وہ درختوں کے پتے اور پودے کی جڑیں چبا کر گزارا کرتا رہا۔ جڑیں کھاتے کھاتے اب وہ زندگی سے بیزار ہو گیا۔ آخر اس نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ وہ دیہات سے خوراک چوری کرنے لگا۔ ایک بار

تو گرفتار ہوتے ہوتے بچا۔ ہوا یوں کہ وہ ایک کھیت میں واقع مکان کے نزدیک گھات لگائے بیٹھا تھا کہ اتنے میں دو سپاہی وہاں آ پہونچے انہوں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ بھی غافل نہیں تھا سپاہیوں کو جل دیکر بھاگ نکلا۔

وہ چھپتا چھپاتا، ایک اور قصبہ میں پہونچا۔ رات کا وقت تھا بھوک کی شدت سے وہ بے حال ہوا جا رہا تھا اسے ایک مکان نظر آیا جس کا دروازہ کھلا تھا۔ اور ہلکی ہلکی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ ہمت کر کے چلا گیا۔ کمرہ میں کوئی نہ تھا۔ وہ اور آگے بڑھا۔ یہ کھانے کا کمرہ تھا۔ میز پر کچھ پھل رکھے ہوئے تھے۔ ابھی اس نے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا۔ کہ تیز سیٹی کی آواز آئی۔ وہ گھبرا کر مکان سے باہر نکلا کیا دیکھتا ہے کہ جرمن سپاہی اس مکان کی طرف آ رہے ہیں۔ اس کے قدم جم گئے اور بدن نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ اب سپاہی چند گز کے فاصلے پر تھے۔ کافمین نے خود کو دروازے کے پیچھے چھپا لیا۔ اسے ایک طرف دھڑکا لگا تھا کہ کوئی مکان سے باہر نہ نکل آئے۔ اور دوسری جانب جرمن سپاہی موت کی صورت میں اس کی طرف آ رہے تھے۔ اس نے خوف کی وجہ سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور جرمن سپاہیوں کا انتظار کرنے لگا۔ اب اسے قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ اور پھر قدم یکبارگی رک گئے۔ دوسرے لمحے ان کے دوڑنے کی آواز آئی۔ ایک دم موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ اور سپاہی اپنے خیموں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اتنے میں گولی چلنے کی آواز آئی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ اور قریب تھا کہ وہ چل کر گر پڑے کہ دو ہاتھوں نے اسے پیچھے سے تھام لیا۔

"آپ اتنی سخت سردی میں یہاں کیا کر رہے ہیں؟ آپ اندر کیوں نہیں آ جاتے؟"

اجنبی کی شفقت بھری آواز ابھری۔

"میں، بارش سے بچنے کے لئے یہاں آ گیا تھا۔ معاف کیجئے، میں آپ کی اجازت کے بغیر اندر آ گیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں؟" اجنبی نے ذرا رازدارانہ لہجے میں کہا۔

اس لہجے میں اسے نامعلوم سا خوف محسوس ہوا۔ وہ کچھ کہے بغیر مکان سے نکلا اور پیچھے دیکھے بغیر ایک طرف کو دوڑنے لگا۔ اتنا تیز وہ اس سے پہلے کبھی نہیں دوڑا تھا ہوا کی تیزی، بارش کی ٹھنڈک اور بھوک کی شدت نے اسے بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ وہ اسی عالم میں ایک کھیت میں گھس گیا۔ جہاں تاریکی میں لپٹا ایک مکان اس کی نگاہوں کا مرکز تھا۔ مکان سے کچھ فاصلے پر ٹھہر کر اس نے ماحول کا جائزہ لیا۔ اور پھر انگور کی بیلوں کے عقب سے ہوتا ہوا وہ ایک تنگ پگڈنڈی پر پہونچ گیا۔ جہاں سے دروازہ نظر آتا تھا۔ اسے خوشی ہوئی لیکن فوراً ہی آہٹ سنائی دی وہ گھبرا گیا تو لوٹنا ہی چاہتا تھا کہ بھوک نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ اور پھر وہ ایک بار حوصلہ کر کے چوری کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

پگڈنڈی کوڑے، کرکٹ اور جھاڑیوں سے اٹی پڑی تھی۔ اس لئے کھڑے ہو کر چلنا دشوار تھا۔ اس نے پیٹ کے بل رینگنا شروع کر دیا۔ اور دروازے پر پہنچ کچھ دیر کے لئے بے حس و حرکت پڑا رہا پھر دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مکان میں گھپ اندھیرا تھا۔ ایک۔ دو۔ تین۔ تیسرا قدم اٹھاتے ہی وہ اچھل پڑا کیونکہ سامنے سے تاریکی کو چیرتی ہوئی موم بتی کی روشنی

اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چاقو پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ پھر وہ حیران رہ گیا کہ اس کو مخاطب کرنے والی ایک ایک خوبصورت انگریز لڑکی تھی۔ اس کا چہرہ خوف یا دہشت سے بالکل خالی تھا۔ اس نے نہایت شستہ انگریزی زبان میں کہا ——!

"گھبرایئے نہیں، میں آپ کے لئے خطرہ ثابت نہیں ہوں گی ——!!"

کاف مین نے سنبھلتے ہوئے کہا: "مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ کیا یہاں کھانے کو کچھ ملے گا؟"

"کیوں نہیں —؟ میں ابھی لاتی ہوں۔ ویسے تم مجھے بھاگے ہوئے قیدی کا نظر آتے ہو۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے، لیکن میں کھانا کھانے کے بعد زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گا۔"

"اوہ! میرا یہ مقصد نہیں تھا۔" لڑکی ندامت کا اظہار کرتے ہوئے مسکرادی۔

پھر اس نے قریب رکھی ہوئی الماری سے بکری کا دودھ اور ڈبل روٹی کے ٹکڑے نکالے اور کاف مین کے آگے رکھ دیئے اور وہ ندیدوں کی طرح جھٹ پٹ چٹ کر گیا۔ اور جب وہ کھانے سے فارغ ہو کر جانے کے لئے اٹھا تو لڑکی نے ہمدردی اور محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور سادگی سے بولی۔

"آپ اس وقت کہاں جائیں گے؟ بے حد تھکے ہوئے ہیں۔ یہیں آرام کیجئے۔"

کاف مین انکار نہ کر سکا اور لڑکی کے ہاتھ کا اشارہ پا کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ لڑکی نے ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوتے وقت کہا —— "جنگ نہایت لغو چیز ہے، چند سال پیشتر میں اور میرا شوہر ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے تھے۔ کہ جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور وہ ہلاک ہو گیا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ آنکھیں بند کرتے ہی نیند کی آغوش میں جا چکا تھا۔

جب صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس کے کانوں میں یہ الفاظ ٹکرائے۔

"تمہاری خدمات کی ہم قدر کرتے ہیں۔ یہ حقیر رقم آپ کی بیش قیمت خدمات کا صلہ نہیں ہو سکتی۔ اصل انعام تم کو جنگ ختم ہونے کے بعد ملے گا۔ اور تم دنیا کی امیر ترین عورت بن جاؤ گی۔"

وہ شدت جذبات سے بے چین ہو گیا۔ "دیکھا مسٹر میں نہ کہتی تھی کہ جنگ سراسر لغویات ہے۔"

اس پر جرمن سپاہیوں نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔

اسی دوران کاف مین نے یہ محسوس کر لیا کہ جرمن سپاہی اس لڑکی کے حسن سے بہت مسحور ہیں اور ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو گئی ہے۔ جرمنوں پر ایک مدہوشی سی طاری ہوتی گئی۔ کاف مین کے لئے یہ سنہری موقعہ تھا۔ وہ اچھلا، جھپٹا اور سارجنٹ سے پستول چھین لیا دوسرے ہی لمحہ گولی سارجنٹ کے بھیجے کو چیر کر دوسری طرف نکل گئی تھی۔ لڑکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

"مکار کتنا حسین جال بچھایا تھا تو نے۔"

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر وہ انداز دلربائی سے اس کی طرف بڑھنے لگی۔

کاف مین موقعہ کی نزاکت کو بخوبی سمجھتا تھا۔ اس نے بلا تامل لڑکی پر گولی چلادی اور اس کی لاش تڑپنے لگی۔

اس خونیں ڈرامے سے فارغ ہو کر اس نے سپاہیوں کے جسموں سے اسلحہ، مکان کی الماری سے نقدی اور خوراک سمیٹ کر ایک بڑا تھیلا بھر لیا۔

"اماپالو" کو چھوڑتے وقت اُسے خیال آیا. کہ اس سفر کے دوران، جنیوا راستے میں آئیگا۔ اور جنیوا میں جرمن سپاہیوں کی نظر سے بچ نکلنا محال تھا۔ یہ سوچ کر اس نے پہاڑی راستہ اختیار کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جنیوا کے گرد ایک لمبا چکر کاٹ کر آگے جا نکلے گا۔ پہاڑوں سے گزرتے وقت اُسے شدت کی سردی کا مقابلہ کرنا پڑا. شب و روز برفانی ہوائیں چلتی رہتیں. جس سے اس کے قوئی اکڑ جاتے اور اسے گھنٹوں اپنے جسم کو ہاتھوں سے رگڑنا پڑتا۔ درختوں کے پتے جھڑ جھڑ کر پہاڑی راستوں پر جمع ہو گئے تھے. اور یہ چلنے میں سخت رکاوٹ ڈالتے تھے. راستے کے دیہات سنسان اور مکان ویران پڑے تھے. اگرچہ موسم اور ماحول دونوں حوصلہ شکن تھے. لیکن وہ مستقل مزاجی سے آگے بڑھتا رہا تین دن کے بعد وہ جنیوا کا چکر کاٹ کر ایک ایسے مقام پر کھڑا تھا. جو فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے درمیان حد فاصل ہے۔

پہلے اس نے فرانس کی حدود میں داخل ہونے کا ارادہ کیا، کیونکہ وہاں وہ دہشت پسندوں کے ساتھ مل کر جرمن فوج سے انتقام لینا چاہتا تھا، مگر یہ سوچکر اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی، کہ فرانس تو گسٹاپو کے جنگل میں بری طرح پھنس چکا تھا. اور وہاں کے دہشت پسندوں کی سرگرمیاں کبھی کی ماند پڑ گئی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کے متعلق سوچنا ہی ...... بے سود تھا، کیونکہ اس کی غیر جانبدارانہ پالیسی قوم پرستوں کی راہ کا پتھر ثابت ہو رہی تھی. بہت سوچ بچار کے بعد اس نے "مناکو"... جانے کا فیصلہ کیا اگرچہ "مناکو" بھی جرمن فوج کے قبضہ میں تھا. لیکن وہاں اس کی پالیسی ظلم و تشدد کی نہیں تھی. رات کے وقت اس نے پہاڑوں سے اتر کر۔ وادی کے ساتھ ساتھ مغرب کی سمت چلنا شروع کر دیا۔ اور دن ڈھلے دریائے ٹمنیارو کے کنارے پر پہنچ گیا. یہاں کچھ دیر سستانے کے لئے لیٹ گیا. تھکا ماندہ تو تھا ہی. دو تین گھنٹے سوتا رہا۔ جب وہ بیدار ہوا. تو سورج کچھ دیر کا مہمان تھا. اس نے دو تین بسکٹ کھا کر دریا کا پانی پیا. اور تازہ دم ہو کر دوبارہ سفر پر روانہ ہو گیا۔

"مناکو" کی حدود میں داخل ہونا ایک پیچیدہ مسئلہ تھا کیونکہ راستہ کے اختتام پر جرمن فوج کی حفاظتی چوکی واقع تھی اور سرحد کے ساتھ مسلح فوجی گشت کر رہے تھے کاتین کو ایک ترکیب سوجھی، وہ دیہاتیوں کی طرح سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھا کر چوکی کے بالکل قریب سے گزرنے لگا. ایک.. سپاہی نے اسے مشکوک سمجھ کر روک لیا. وہ ذرا بھی نہ گھبرایا اور دیہاتیوں کے لب و لہجہ میں باتیں کرتا رہا سپاہی نے اسے جانے کی اجازت دے دی. ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ پیچھے سے سپاہی دوڑتا ہوا آیا. اس دفعہ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تاہم اس نے اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا. سپاہی نے کچھ سکے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ چلتے وقت تمہارے تھیلے میں سے گر پڑے تھے" اس نے فوجی کا شکریہ ادا کیا اور آگے چل نکلا۔ جب سپاہی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے تھیلے کا جائزہ لیا. اس میں سوراخ ہو گیا تھا. اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اگر سوراخ بڑا ہوتا اور کارتوس گر پڑتے تو وہیں دھر لیا جاتا۔

مناکو میں داخل ہونے کے بعد اس نے مانٹ کارلو کا رخ کیا. ایک جگہ سے گزر رہا تھا کہ کسی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی!

"اجنبی شہر کی گلیوں میں اس طرح گھومنا خطرناک ہے

جرمن سپاہی تم کو مشکوک سمجھ کر پکڑ لیں گے۔"

یہ سن کر اس کا دل زور، زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے مخاطب کی طرف دیکھا۔ اس کی دائیں طرف ایک نوجوان کھڑا مسکرا رہا تھا۔

یہ نوجوان چارلس تھا جس نے اسے بتایا کہ وہ عرصہ سے سیاحوں کی رہنمائی کا کام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک نظر میں ملک ملک کے باشندوں کو پہچان لیتا ہے۔ پھر اس نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو، تم امریکی ہو؟"

"شاید...... لیکن تم کیا جاننے ہو؟" —— کاف مین نے اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"اگر تم مجھ پر اعتبار کرو تو میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"اعتبار!.... مدد!" کے الفاظ کاف مین کے گلے میں اٹک کر رہ گئے۔

چارلس ایک طرف کو مڑ گیا۔ اب وہ ایک مکان میں داخل ہو گیا۔ چارلس کے دوست جین نے انھیں.. خوش آمدید کہا۔ تعارف کے بعد کاف مین غسل خانے میں چلا گیا۔ جب وہ کپڑے بدل کر واپس آیا، تو دونوں دوستوں نے اسے جوتا بھی بدلنے کو کہا۔ وہ یہ سنکر حیران رہ گیا کہ چارلس نے اسے دراصل جوتوں سے ہی پہچانا تھا۔

چارلس نے جاتے وقت اسے ہدایت کی کہ وہ اس گھر سے اس وقت تک باہر نہ نکلے جب تک داڑھی گھنی ہو کر اس کے چہرے کو پوری طرح ڈھانپ نہ لے۔ وہ تین ہفتے گھر میں چھپا بیٹھا رہا۔ اس دوران چارلس اپنے کئی دوستوں کے ساتھ وہاں آتا اور سب جنگ کے موضوع پر گھنٹوں گفتگو کرتے۔ اس گفتگو میں ایک خوبصورت لڑکی بھی شریک ہوتی۔ اس کا نام یان تھا۔ چند ہی دن بعد چھ مردوں اور ایک لڑکی پر مشتمل یہ چھوٹا سا گروہ جرمنوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کو تیار ہو گیا۔

کئی روز کی بھاگ دوڑ اور مسلسل غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مناکو کی سرزمین ان کی سرگرمیوں کے لئے موزوں نہیں۔ اس لئے انھوں نے فرانس کی سرزمین پر گوریلا جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔

۲۵ نومبر ۱۹۴۳ء کی رات بہت بھیانک تھی۔ دھند اور تاریکی میں لپٹی ہوئی کائنات کی ہر چیز پراسرار نظر آ رہی تھی۔ مانٹ کارلو سے چند میل دور فرانس کی سرحد پر جرمن توپ خانے کے محافظ سپاہی نے کچھ فاصلہ پر ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا۔ وہ حیرت و استعجاب کے عالم میں اس کی طرف بڑھا۔ لڑکی والہانہ انداز میں مسکرائی اور اٹھلاتی ہوئی ایک طرف کو نکل گئی۔ محافظ نے اسے خاص نظروں سے دیکھا اور دبے پاؤں اس کے پیچھے چلتا ہوا درختوں میں غائب ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد فوراً چند سائے توپ خانے کی طرف بڑھے اور توپوں کے نیچے کوئی چیز رکھ کر فوراً غائب ہو گئے۔ محافظ سپاہی اپنی ناکامی پر پیچ و تاب کھاتا ہوا واپس آیا اور بے قراری سے ٹہلنے لگا۔ پھر آدھی رات کے وقت فضا زبردست دھماکوں سے گونج اٹھی اور جرمن چوکی میں بھگدڑ مچ گئی۔

کاف مین اور اس کے ساتھیوں کی اس کامیابی نے اٹلی، فرانس، مناکو اور جرمنی میں کہرام مچا دیا۔ فرانس کے طول و عرض میں قوم پرست عناصر کی سرکوبی کے لئے نازی جاسوسوں کی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں۔ ہوٹلوں، قحبہ خانوں اور دفتروں پر پہرے بٹھا دئے گئے۔ جب یہ خبر مناکو کی سرحد عبور کر کے مانٹ کارلو پہنچی تو کاف مین کے ساتھی پہلے سے کہیں زیادہ مستعد ہو گئے۔ اور دوسری تیسری رات علاقہ

پھیل کر جرمن چوکیوں پر ایسے بھرپور وار کرنے لگے کہ جرمن حکومت تلملا اٹھی۔

۱۹ دسمبر ۴۲ء کو کینیز کے سپلائی ڈپو میں آدھی رات کے وقت پراسرار طور پر آگ بھڑکنے لگی۔ آگ دوسرے دن شام تک بجھائی نہ جا سکی۔ ڈپو میں ہزاروں من پٹرول اور اناج کے علاوہ سینکڑوں من گولہ بارود محفوظ تھا۔ اس ڈپو میں آگ لگ جانے سے دور دور تک تباہی پھیل گئی۔ حکومت کو سب سے بڑا صدمہ پہنچا کہ آگ سے خودکار اسلحہ کی بہت بڑی تعداد کے علاوہ بیس ہزار ایسی گولیاں بھی تلف ہو گئیں جو ہوائی حملے کے وقت جہازوں کو مار گرانے کے کام آتی تھیں۔

اس حادثے کے بعد جرمنوں نے فرانسیسیوں پر بہت زیادہ ظلم و تشدد کیا۔ اور اس صورتحال نے کان یین اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو مشتعل کر دیا۔ انہوں نے سڑکوں کے پل اڑا کر وہ تمام راستے مسدود کر دیئے جن کے ذریعے جرمن فوجیوں کو کمک اور سامان رسد پہنچتا تھا۔

۲۰ جون ۴۴ء کو رات کے پچھلے پہر کینیز کا سپلائی ڈپو ایک بار پھر حریت پرستوں کی سرگرمیوں کا ہدف بنا ہوا تھا۔ ڈیوٹر نے اس کے گرد ایک بار پھر اس کے گرد ڈائنامیٹ لگا کر فلیتے کو آگ لگا دی۔ پھر جرمن سپاہیوں کے شور و غل سے فضا گونج اٹھی۔ اندھیرے میں سرچ لائٹ کے طاقتور بلب پھر روشن ہو گئے۔ ایک جرمن سپاہی بھاگتا ہوا اس کے بالکل قریب آ گیا۔ اس نے گھبرا کر پستول کی لبلبی دبا دی۔ سپاہی لڑکھڑایا اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ جب وہ گھر پہنچے تو جین کی زبانی یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ یان جرمن سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو چکی

ہے۔ لیکن انہیں یقین تھا کہ وہ گسٹاپو کے جبر و تشدد کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے گی۔ اور جب تک زندہ ہے حریت پرستوں کے متعلق کچھ نہیں بتائے گی۔ یان کی گرفتاری سے سب کو صدمہ ہوا۔ کان نے عہد کیا کہ یان کو آزاد کرانے سے پہلے ہم ایک لمحے کے لئے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

اس رات کان یین اور اس کے تین ساتھی، نانسی میں گسٹاپو کے صدر دفتر کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ ایک غیر معمولی عمارت تھی جس کے چپے چپے پر مسلح سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ وہ اس میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ غیز یان وہیں کہیں محبوس ہے۔ اندر جانے کا کوئی راستہ ایسا نہ تھا جس پر مسلح سپاہیوں کی اچھی خاصی کھیپ موجود نہ ہو۔

کافی غور و خوض کے بعد ان کے ذہن میں ایک تدبیر آئی اور وہ سامنے سے ہٹ کر عمارت کے عقب میں چلے





گئے۔ اب وہ بائیں سے گزر رہے تھے۔ پھر وہ ایک کھڑکی کے
قریب آ گئے جو اس عمارت کی عقبی دیوار میں روشنی اور ہوا
کے لئے نصب تھی، اور یہاں سے وہ تینوں گوریلے ایک
دوسرے کی مدد سے گسٹاپو کے صدر دفتر میں داخل ہو گئے۔
ایک کمرے کے نزدیک انھیں سسکیوں کی آواز سنائی دی
کاف مین چاقو سیدھا کر کے تیزی سے آواز پر لپکا۔
لیکن اس کے قدم اٹھاتے ہی ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی
اور کمرہ یکایک روشن ہو گیا۔ اور سامنے کھڑے ہوئے تنومند
جرمن سپاہی نے پستول سے فائر کیا گولی نے اس کے دائیں
بازو کو چھید ڈالا۔ پھر کاف مین نے سپاہی کو دوبارہ فائر
کرنے کی مہلت نہ دی۔ اس کا تیز شکاری چاقو سپاہی کے
سینے کو پھاڑتا ہوا اس میں گھس گیا۔ کاف مین چاقو نکالنے
کے لئے جھکا تو اس کی نظر یان پر جا پڑی۔ جو لکڑی کے ایک
تختے کے ساتھ جکڑی پڑی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپائے۔
دراصل وہ کاف مین کو بھاگ جانے کا مشورہ دے رہی تھی
کاف مین نے جلدی جلدی تختے کے بند کھولے اور
یان کو ہاتھوں پر اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کے جسم میں ہلکی
حرکت ہوئی اور وہ تڑپ کر کاف مین کی گرفت سے نکل
گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن زبان اس کا ساتھ نہ دیتی تھی
اس کا چہرہ زرد تھا۔ جسم پر جگہ جگہ تشدد کے نشان پڑے
ہوئے تھے۔ اس نے بمشکل حواس کو مجتمع کرتے ہوئے کربناک
انداز میں سرگوشی کی۔

"میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔"

"مجھے یقین ہے ——"

"خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں ساتھ لیکر جاؤں گا۔"

"لیکن ..... میں تو چند لمحوں کی مہمان ہوں۔" اور
پھر یان کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

کاف مین جذبات کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس نے
یان کو جھنجھوڑ کر دیکھا۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا
تھی۔ پھر اس کی آنکھیں کھلیں اور اس نے کاف مین پر
سوالیہ نظر ڈالی اور .....

عین اسی وقت ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور اس
کی دائیں ران میں پیوست ہو گئی۔ وہ لنگڑاتا ہوا کھڑکی کی
طرف بڑھا۔ اور کسی نے اسے کھڑکی سے باہر گھسیٹ لیا۔
وہ زیرہ سنگھ کی پشت پر لدا ہوا درختوں کے جھنڈ میں غائب
ہو گیا —— کاف مین نے درد کی شدت سے بے قرار ہو کر
آنکھیں کھولیں اسے یقین نہ آیا کہ وہ جیپ کے مکان میں

اپنے بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے کے واقعات اس کے ذہن میں تازہ تھے پھر اس نے سوچا کہ شاید اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن چکرا کر بستر پر گر پڑا۔

اس علاقے کو دو مہینے گزر گئے، اور اس دوران میں کوئی بھی حریت پرست گھر سے باہر نہیں نکلا۔ کیونکہ نازی جاسوس ہر وقت ان کی تلاش میں تھے۔ وقت پر طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے کاف میں کے زخم مندمل ہونے کی بجائے زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ اس کے بگڑتے ہوئے زخموں کو دیکھ کر ایک دن میں باہر جانے کے لئے مچل گیا۔ تاکہ کسی ماہر معالج سے مشورہ کر سکے۔ لیکن کاف مین گسٹاپو کے خطرے کی وجہ سے اجازت دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ دفعتہ دروازے پر دستک ہوئی۔ انھوں نے سمجھا کہ جرمن سپاہی انہیں گرفتار کرنے کے لئے آئے ہیں۔ کرے پر موت کا سناٹا چھا گیا۔

باہر سے کسی نے انگریزی زبان میں کہا۔

"دروازہ کھول لے ۔۔۔ ہم دوست ہیں"۔

اور پھر مسلسل دستک ہونے لگی۔ دستک دینے کا انداز شریفانہ تھا۔ چار و ناچار دونوں دوست آگے بڑھے اور دروازہ کھول دیا۔ انھوں نے حیرت سے دیکھا آنے والے جرمن نہیں، امریکی فوج کے افسر اور سپاہی تھے۔ جو منا کو فتح کرنے کے بعد حریت پرستوں کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے آئے تھے۔

کاف مین کو زخمی حالت میں دیکھ کر وہ اسے اپنے ساتھ ہسپتال لے گئے اور وہ تین ہفتوں میں صحت یاب ہونے کے بعد امریکہ روانہ ہو گیا۔ ●●



وہ ایک عظیم ماں تھی

(انیس اختر صدیقی)

دوسری عالمی جنگ میں رومین گیری Romain Gary نے جو خدمات انجام دیں وہ فرانس کا ہر فرد جانتا ہے۔ آج فرانس میں رمین گیری کی حیثیت ایک سفیر اور اعلیٰ ناول نگار کی ہے اس نے دوران جنگ میں متعدد ناول لکھے جو آج بھی مشہور ہیں اس کے ہر ناول کا انگریزی میں ترجمہ کیا جا چکا ہے لیکن دوسری عالمی جنگ میں رومین گیری کو اتنی شہرت اور عنایت کیسے حاصل ہوئی اس کے پیچھے ایک بہت بڑی ہستی تھی اور وہ تھی رومین گیری کی بزرگ ماں ایک لازوال ماں جس نے اپنے اکلوتے بیٹے کی خاطر اپنی زندگی کی ساری خوشیوں کو ترک کر دیا اور زندگی کے آخری لمحوں تک اپنے بہادر سپوت کو ہمت اور جرأت کی تلقین کرتی رہی۔

جنگ چھڑنے کے پہلے دن رومین گیری کی ماں اپنا آلٹ ٹیکسی میں لگاتار پانچ گھنٹے تک سفر کرکے اس تک پہنچی اور اپنے جرأت مند بیٹے کو الوداع کہا اور دعا دی کہ خدا تمہیں آسماں میں ہزار ہا کامیابیاں عطا کرے کیونکہ رومین گیری اس وقت فرانس کی فضائیہ میں توپ خانے کا افسر تھا۔ اس کی ماں کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی تھی۔ جس کے سہارے وہ ٹیکسی سے اتر کر رومین گیری کے پاس آئی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر خوشی نمایاں طور سے دیکھی جا سکتی تھی وہ بہت مسرور نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو پیار کیا اور مسکراتے چہرے سے کئی بار ہدایات اور پھر اچانک وہ زور زور سے کہنے لگیں "تم فرانس میں بہت نام کماؤ گے، تم ایک بڑے ہیرو ہو گے تمہاری ماں کی بات کبھی غلط نہیں ہو سکتی لیکن چند افسران جو گیری اور اس کی ماں کی گفتگو سن رہے تھے ایک زور دار قہقہہ کے

ساتھ ہنس پڑے۔ روبین گیری کی ماں کو اپنے بیٹے کی یہ توہین برداشت نہ ہوئی اور اس نے غصے سے اپنی چھڑی سے ان افسران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، گیری تم واقعی ایک بڑے ہیرو ایک جنرل اور فرانس کے سفیر ہو گے۔ یہ نالائق تمہیں نہیں جانتے کہ تم کیا ہو۔ روبین گیری کو اس تکرار نے عجیب کش مکش میں مبتلا کر دیا۔ اس نے اپنی ماں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے مدھم آواز میں سمجھایا مگر اس نے گیری سے کہا تم اپنی ماں کی وجہ سے شرم محسوس کر رہے ہو اس کے بعد اس کی ماں نے ان مشینوں اور جنگی سازو سامان کا معائنہ کیا جن کا گیری کو جنگ میں استعمال کرنا تھا۔

پھر اس نے اپنے بیٹے کو ایک آفیسر کی طرح ہدایات دیں کہ اس دوران تمہیں اپنا گلا صاف رکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ پھر مسکرائی اور گیری کو مخاطب کرتے ہوئے بولی کہ تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اس کے چہرے پر اعتماد جھلک رہا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے قسمت سے سمجھوتہ کر لیا ہو۔ روبین گیری اپنی ماں کے ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہا تھا۔ اس کے دماغ میں بار بار اپنی ماں کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے اپنی ماں سے پھر پورے اعتماد اور بہت ہی نرم لہجہ میں کہا ماں تم پھر دیکھو مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں مگر ان الفاظ کے سننے کے چند لمحوں بعد ہی گیری کی ماں کے چہرے کی مسکراہٹ زائل ہو گئی اور ایک ہلکی سی اداسی اس کے چہرے پر چھا گئی اس نے دھیمی آواز سے گیری سے اپنا خدشہ ظاہر کیا کہ شاید تمہارے پاؤں میں چوٹ آ جائے گی روبین گیری نے اپنی بزرگ ماں کو ایک بار پھر دلاسا دیا اور وہ چلی گئی۔

روبین گیری اپنی ماں کے ساتھ فرانس کے ایک شہر نائس (NICE) میں رہتا تھا۔ اس کی ماں روبین چھوڑ کر فرانس چلی گئی تھی اس کے والد اور تمام رشتے دار روس میں ہی رہ گئے تھے۔ بچپن ہی سے گیری کی ماں اپنے بیٹے کا بہت خیال رکھتی تھی جب وہ ۱۳ سال کا ہوا تو اس نے اسے نائس کے ایک اعلیٰ اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہ اپنا اور اپنے بیٹے کا گزارا ایک چھوٹی سی دکان چلا کر کیا کرتی تھی۔ اس دکان پر اسکارف، بیلٹ وغیرہ فروخت ہوتے تھے جس میں سے اسے دس فیصدی منافع ملتا تھا۔

اسی طرح دس سال تک وہ لگاتار دکان لگاتی رہی اور اپنے بیٹے کے لئے اسکول کی فیس، کپڑے، جوتے غرض یہ کہ ہر طرح کی سہولت بہم پہنچاتی رہی۔ اپنے اس کام میں وہ بڑی دلچسپی لیتی اور بڑا فخر محسوس کرتی کہ اس کا لڑکا بڑا ہو کر ایک اعلیٰ آفیسر بنے گا وہ اپنے بیٹے کے کھانے پر خاص دھیان دیتی اور اکثر اسے گوشت وغیرہ سے دور رکھتی اسے اس بات کی بہت جلدی اور بے چینی تھی کہ اس کا بیٹا جلد ہی کچھ بن جائے۔

حالانکہ روبین گیری کو ابتداء میں کچھ ناکامیاں بھی ہوئیں، مگر اس کی ماں اسے ہمیشہ دلاسہ دلاتی رہی۔ ایک بار اس نے گیری سے پوچھا تمہارے اسکول کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟ گیری نے مردہ دلی سے جواب دیا اس بار پھر حساب میں لوٹ ملا ہے حساب میں کمزوری ہے۔ یہ سنکر وہ مسکرائی اور اس نے کہا کہ دراصل تمہارے ٹیچر تمہیں نہیں پہچانتے کہ تم کیا ہو۔ انھیں اپنی ان باتوں پر ایک دن ضرور پچھتانا ہوگا۔ وہ وقت اب آنے والا ہے جب تمہارا نام سنہری حرفوں میں اسی سکول کی دیوار پر لکھا جائے گا۔ بس کل تمہارے اسکول جا کر انھیں



رومین گیری جسے بچپن میں کئی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

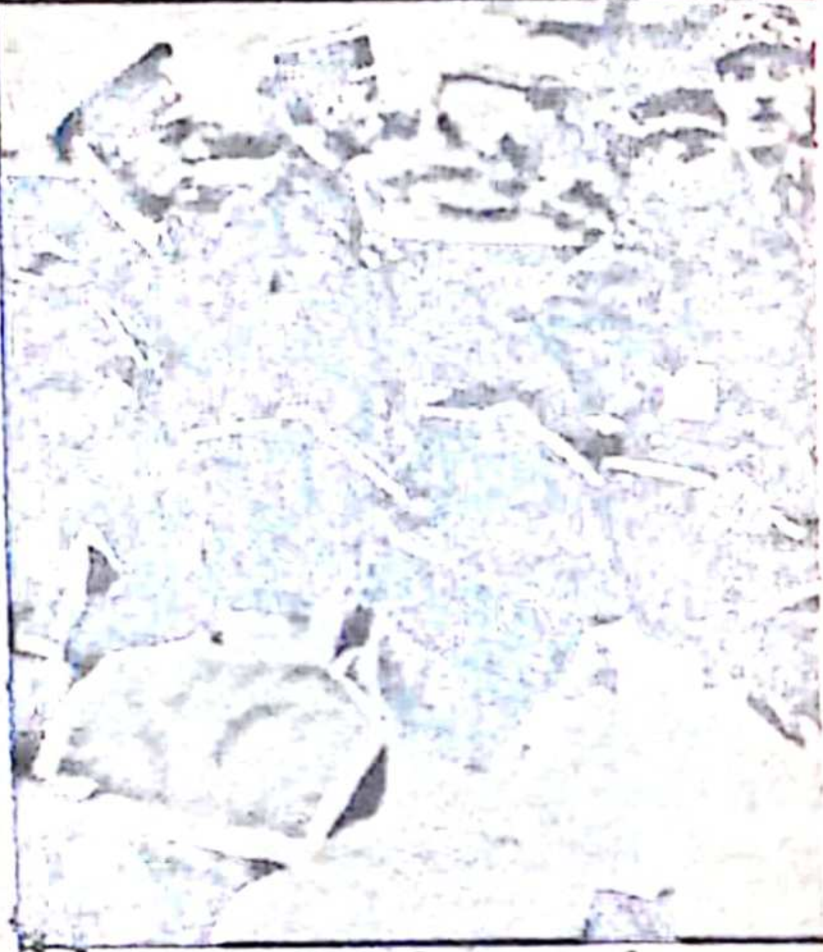
یہ سب کچھ بتادوں گی۔ میں انھیں تمہاری وہ تازہ نظم بھی سناؤں گی جو تم نے حال ہی میں لکھی ہے۔ تم بڑے ہوکر دوسرے وکٹر ہیوگو (victor Hago) ہوگے۔"

یہ الفاظ وہ تھے جنہوں نے رومین گیری کو کبھی بھی کسی بھی وقت جھکنا نہیں سکھایا۔ ان الفاظ میں وہ طاقت تھی جس نے رومین گیری میں برق سی تیزی اور طوفان سے لڑجانے کی ہمت پیدا کردی تھی اس کی ماں کو اپنے ایک ایک الفاظ کی قیمت معلوم تھی۔ اس نے گیری کو ہر مشکل اور دشواری میں "ڈٹنے کی ہمت پیدا کردی حالات سے لڑنے کی اور ٹکرانے کی تلقین کی

اکثر جب وہ دن بھر کی تھکن کے بعد گھر لوٹتی تو وہ اپنا باقی وقت گیری کے ساتھ گزار دیتی اکثر اس کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہتی اور بار بار یہی الفاظ دہراتی تم ایک دن ضرور فرانس کے سفیر ہوگے تمہارے پاس ایک عالی شان کار اور بنگلہ ہوگا۔ وہ اکثر اپنے کام کی وجہ سے اتنا تھک جاتی کہ گھر لوٹتے لوٹتے اسے ہلکا سا بخار بھی ہوجاتا تھا۔ مگر وہ ہر بار یہی کہتی کہ صبر کرو میں ٹھیک ہوجاؤں گی۔ جب گیری سولہ برس کا ہوگیا تو اس کی ماں ایک چھوٹے سے ہوٹل کی منیجر بن گئی وہ صبح سات بجے اٹھ جاتی اور ناشتہ وغیرہ تیار کرنے کے بعد اپنی چھڑی اٹھا کر ہوٹل کی طرف روانہ ہوجاتی اور شام کو پھل اور خوشبودار پھولوں کے ساتھ گھر لوٹتی ہوٹل کی سیڑھیاں بڑی اونچی تھیں جن پر گیری کی ماں کو دن میں تقریباً بیس مرتبہ چڑھنا اترنا پڑتا تھا۔ اور ایک دفعہ ایک حادثہ یہ ہوا کہ گیری کی ماں سیڑھی سے اترتے وقت لڑکھڑا گئی اور قریب ہی رکھی ایک کرسی سے جا ٹکرائی۔ اس کے چہرے سے خون بہنے لگا کیونکہ اس کے سر میں چوٹ آئی تھی۔ بروقت ڈاکٹری امداد مل گئی مگر گیری کی ماں اپنے آپ کو کمزور محسوس کرنے لگی تھی اور اکثر بیمار رہنے لگی۔ گیری جب جوان ہوگیا تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس کی ماں نے جو خواب دیکھے تھے شاید اب اس کی زندگی میں پورے نہیں ہو

کو الوداع کہہ کر اپنی منزل کی طرف بڑھ چکا تھا وہ جانتا تھا یہ وہی منزل ہے جس کو پانے کے لئے میری بہادر ماں نے مجھے پیدا کیا ہے اس سے پہلے کہ دشمن کی افواج فرانس پر حملہ کرتیں گیری کو ایک تار نے چونکا دیا۔ یہ تار اس کی بزرگ ماں کی علالت کا تھا۔ اور اس کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ فوراً جا کر اپنی ماں سے ملے۔

رومین گیری سے جتنی جلدی ہو سکا وہ اپنے شہر نائیس پہنچا اور سیدھا وہاں کے نرسنگ ہوم پہنچا جہاں اس کی ماں زیر علاج تھی۔ گیری کی ماں شاید اس وقت سو رہی تھی اس کے چہرے سے کمزوری اور گھبراہٹ عیاں تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دنیا کے سارے غم اس کے چہرے میں سمٹ آئے ہوں۔ اس کے بستر کے بائیں طرف میز پر چاندی کا وہ میڈل بھی رکھا تھا جو گیری نے ۱۹۳۲ء میں ایک ٹیبل ٹینس کے مقابلہ میں جیتا تھا اس کی ماں اچانک نیند کے غلبے سے چونک گئی اور سامنے اپنے سپوت کو کھڑا دیکھ کر جیسے اپنے سارے غم بھول گئی اس نے گیری کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور کہا بیٹا اب تمہیں ایک اچھی عورت کی ضرورت ہے اور یہ میری ہی غلطی رہی کہ میں تمہیں وہ نہ دے سکی اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوئیں۔ گیری نے اپنی جیب سے تاش کی ایک گڈی نکالی اور ماں کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ مگر گیری نے یہ بات نوٹ کی کہ وہ اکثر کھیل کے دوران اسے گھورتی رہی اور ہلکے ہلکے مسکراتی رہی۔ غرض کچھ دن اسی طرح گزر گئے نائیس (Nice) کے سینٹ انٹونی کلینک (Saint Artonic clinic) میں رومین گیری کے آنے سے جیسے بہار آگئی۔ ادھر پھر جنگ چھڑ گئی تھی۔ ہٹلر کی نازی فوجیں فرانس پر حملہ کر چکی تھیں



جنرل ڈیگال کی قیادت میں گیری مصروف جنگ تھا

سکتے۔ وہ بہت پریشان رہنے لگا۔ ادھر اس کی ماں کے سینے میں درد کی شکایت رہتی تھی اور دن بدن اس کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑتی جا رہی تھی۔ وقت بہت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا آخر کار وہ دن آ ہی گیا جب . . .

. . . ۱۹۳۸ء کو رومین گیری کو فرانس کی فضائیہ میں نوکری مل گئی اور وہ اپنی فضائیہ مشقوں میں مصروف ہو گیا اس کے داخلہ کے چند دن بعد ہی دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی رومین گیری کی فرانس کو بہت سخت ضرورت تھی۔ اور رومین گیری بھی اپنی پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ میدان جنگ میں کودنے کے لئے بیتاب تھا۔ اس کو زیادہ دن انتظار بھی نہیں کرنا پڑا کہ اسے جنگ کے لئے بلوا لیا گیا۔ جرمنی افواج۔ فرانس پر گولے برسانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ گیری اپنی ماں

ٹوپ خانے گرج رہے تھے تو ہیں آگ برسا رہی تھیں چھٹی کی میعاد پوری ہو چکی تھی اور اب روبین گیری کو میدان جنگ میں سخت مقابلہ درپیش تھا۔

روبین گیری کے الفاظ ہیں "میں ان لمحات کو کبھی نہیں بھلا سکتا جب میں نے اپنی ماں کو آخری سلام کیا میرے چہرے پر مسکراہٹ تھی مگر میرا دل بیقرار تھا۔ نہ جانے میں ان لمحات میں اپنے دل کو کس طرح قابو میں رکھ سکا۔ گیری نے اپنی ماں کے رخسار پر پیار کیا اور اجازت طلب کی گیری کی بہادر اور دلیر ماں نے گیری سے اپنے بارے میں کہا بیٹا۔ تم میری ذرا بھی پرواہ نہ کرنا میں تو ایک پرانے گھوڑے کی طرح ہوں جو اپنے جانے کے دن گن رہا ہے گیری کی ماں نے اس سے اپنی فوجی ٹوپی اتارنے کو کہا اور اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس کی پیشانی پر کراس بنا دیا اور کہا: "میری ہزاروں دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اس کے ساتھ گیری دروازے تک گیا اور پھر پلٹ کر اپنی پیاری اور ہمدرد ماں کی جانب مڑ کر دیکھا دونوں نے ایک دوسرے کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا اور اپنی زندگی کے ہزاروں منصوبوں کو سچ کرنے کے لئے آگے بڑھ گیا۔

جنگ کی لپیٹ میں فرانس آچکا تھا ہٹلر کی فوجیں ہر محاذ پر فتح کامرانی کی جھنڈے گاڑ رہی تھیں۔ فرانس کی فوجوں کو پیچھے ہٹنا پڑ رہا تھا دھیرے دھیرے فرانسیسی فوج کو ہار ماننا پڑی اور اس کے فوجی دوست ممالک میں بانٹ دیئے گئے۔

روبین گیری کو انگلینڈ میں رائل ایئر فورس (R.A.F) کے حوالے کر دیا گیا اور اس نے جہاں پر لازوال بہادری دکھائی۔ روبین گیری کو انگلینڈ پہنچتے ہی اس کی ماں کا خط ملا جو اس نے خفیہ طور سے اپنے ایک عزیز کے ذریعہ جو سوئیزرلینڈ میں تھا بھیجا تھا روبین گیری جنرل ڈیگال (Digal) کی قیادت میں مصروف جنگ تھا اور اسکو اس کی ماں کے خطوط برابر ملتے رہے اور یہ سلسلہ پورے تین سال اور چھ ماہ جاری رہا۔ گیری کی ماں کے ہر خط میں وہ طاقت اور ہمت ہوتی ہے کہ ان کو پڑھ کر گیری بہت تقویت محسوس کرتا۔ اس کی ماں کے خطوط بیحد ہمت افزا ہوتے تھے۔ اور یہ خطوط پورے ساڑھے تین برس تک تھوڑے تھوڑے وقفے سے گیری کو ملتے رہے وہ اپنی خطوط کچھ اس طرح لکھتی تھی!

میرے بہادر اور پیارے بیٹے ہم لوگ تقریباً ہر روز تمہاری کامیابیوں کے بارے میں اخبارات میں چرچا سن رہی ہیں۔ میں بہت فخر محسوس کرتی ہوں۔ جب لوگ مجھے تمہاری کامیابی پر مجھے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ میں امید کرتی ہوں کہ تم اسی طرح آسمان پر چھائے رہوگے اور دشمن کے دلوں میں دہشت بھر دوگے۔ "تمہاری ماں"

روبین گیری رائل ایئر فورس کے ہر حملہ میں ہمیشہ آگے سے آگے رہتا اور دشمن کے ٹھکانوں پر بھرپور وار کرتا اس کے دماغ میں اس کی ماں کے الفاظ گونجتے رہتے اور وہ بیقراری سے ان لمحوں کا انتظار کرنے لگتا جب کہ اسے کامیابی حاصل ہو۔ اسے ماں کے ہر خط سے یہی محسوس ہوتا کہ اس کے پڑوسی اس کے دوست اس کی بہادری کے گیت گا رہے ہیں۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے یہ ثابت کر دیا ہو کہ واقعی وہ بہادر اور دلیر ہے اور اپنی ماں کو وہ سب کچھ دے سکیگا جس کی وہ زندگی بھر تمنا کرتی رہی وقت گزرتا

گیا اور اس کی ماں کے خطوط بھی کچھ مختصر ہونے لگے اور کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ خطوط بہت جلدی اور گھبراہٹ میں لکھے گئے ہوں۔ خطوط کی رفتار بدستور کم ہونے لگی مگر اب بھی ان خطوط میں وہی نعرے درج ہوتے جو ایک فوجی کو میدان جنگ میں دیئے جاتے وہ اپنا ہر خط میرے بہادر بیٹے سے شروع کر کے اس کا خاتمہ یہ لکھ کر ہی کرتی کہ تم میری ذرا بھی پرواہ نہ کرنا میں بالکل ٹھیک ہوں بعض اوقات اس کے خطوط اکٹھا چار پانچ آجاتے تھے۔ اور ہر خط سے اس کی خیریت معلوم ہوتی رہتی تھی۔ لیکن ایک دن ایک خط نے روبین گیری کو چونکا دیا۔ یہ خط اپنے ساتھ کچھ غمگینی کا پرتو لئے تھا۔

پیارے بیٹے!

میں تم کو ایک بار پھر لکھتی ہوں کہ تم میری رتی برابر بھی پرواہ نہ کرنا اور میری طرف سے بالکل بے فکر رہنا ہمت سے کام لو اور یاد رکھنا کہ اب میں تمہارا زیادہ ساتھ نہیں دے سکتی اب تم ایک آدمی بن گئے ہو اب تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے ہو۔ لہٰذا اب تم جلدی سے شادی کر لو۔ تم میرے بارے میں ذرا بھی نہ سوچنا۔ میری تندرستی اب ٹھیک ہے اور ٹیڈسی ڈاکٹر رومینوف مجھ سے بہت خوش ہیں وہ میری کافی مدد کرتے رہتے ہیں وہ بھی تمہیں اپنی نیک خواہشات بھیجتے ہیں۔ میدان میں ڈٹے رہو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔

"تمہاری ماں"

روبین گیری کا دل یہ خط پڑھ کر بھر آیا۔ وہ خاصی الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ روبین گیری کو یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ اس خط میں ضرور کوئی ایسی بات ہے جو مجھ سے چھپائی گئی ہے۔ اس کے ذہن نے یہ سوال کیا کہ کہیں ماں کو کچھ ہو تو نہیں گیا۔ مگر نہیں۔ گیری نے اس خط کو ایک ایسی نشانی سمجھا جس کی مدد سے وہ منزل تک پہنچ سکتا تھا۔ آخر کار متحدہ جنگ کا پانسہ پلٹا اور جرمنی پر زبردست کامیابیاں حاصل ہونا شروع ہو گئیں گیری کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی جب اس نے ماں کے وہ خطوط پائے۔ جن میں اس کی کامیابیوں پر اسے مبارکباد پیش کی گئی تھی۔ لیکن ان خوشیوں کے خطوط میں اسے ایک ایسا خط پھر ملا جو کہ اس کے ذہن کو ہلا دینے کے لئے کافی تھا۔

"میرے پیارے بیٹے!

ہم ایک دوسرے سے برسوں سے جدا ہیں اور میں محسوس کرتی ہوں کہ تم میری غیر موجودگی میں بھی خوشی محسوس کرتے ہو گے۔ اور ساتھ میں اب تم زیادہ تندرست اور شاداب دکھائی دیتے ہو گے۔ یاد رکھو مجھے تمہارے اوپر پھر پورا اعتماد ہے اور جب تم واپس لوٹو گے تو تمہیں ساری بات کا تفصیل کے ساتھ علم ہو جائے گا۔ اور تم سے اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔"

روبین گیری کی عقل حیران تھی کہ میری ماں کو آخر کیا ہو گیا جو یہ لکھ رہی ہے کہ اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔

جنگ کے بادل ختم ہونا شروع ہو گئے تھے اور گیری کو مسلسل اپنی فوج کے ہمراہ کامیابیاں مل رہی تھیں۔ پیرس کو آزاد کرا لیا گیا۔ جرمن افواج نے فرانس کو خیرباد کہہ دیا اور ان کو بہت بڑا جانی اور مالی نقصان پہنچا اس سب کے ساتھ ہی دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ ہو گیا۔ اور فوجیوں کو دھیرے دھیرے چھٹیاں دی جانے لگیں۔ گیری کو بھی چھٹی مل گئی اور اب وہ فاتحانہ مسکراہٹ

لئے اپنے وطن نائیس کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اس کو اپنی اس فوجی وردی پر ناز تھا جس پر سونے اور چاندی کے کئی تمغے لٹکے ہوئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے ان تمغوں کی کیا قیمت ہے اور میری بزرگ ماں جب اسے دیکھے گی تو خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔ یہ جنگی نوجوان واقعی کسی شہزادے سے کم نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کی کالی وردی پر یہ میڈل اور کئی رنگ کی پٹیاں چاند تاروں سے کم نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ اس کے بائیں کاندھے پر ایک فوجی بیگ لٹک رہا تھا جس میں وہ ناول رکھے ہوئے تھے جو اس نے جنگ کے دوران لکھے تھے۔

روبین گیری اب نائیس کی گلیوں میں داخل ہو چکا تھا اور کبھی کبھی اس کے دائیں پیر میں درد اٹھ آتا تھا جس کو وہ آج بھول گیا تھا لیکن پھر بھی چونک پڑتا تھا یہ درد در اصل ایک زخم کی وجہ سے ہوتا تھا جو ایک گولی لگ جانے کی وجہ سے ہوا تھا۔

روبین گیری اپنے دل میں ہزاروں خوشیاں اور کئی داستانوں کو لئے لوٹ رہا تھا۔ اس نے اپنے آنے کی اطلاع بھی نہیں کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے لئے اب یہ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے اس نے سب سے پہلے ہوٹل ہینٹن ہیر مونٹس کا رخ کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ماں اس کے استقبال کے لئے وہیں انتظار کر رہی ہو گی وہ ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ لیکن اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا اس کے استقبال کے لئے کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ گھبرا گیا اور اس کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے منیجر سے اپنی ماں کے بارے میں دریافت کیا لیکن اس منیجر نے بھی اس کی ماں کے بارے میں بتانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ اس نام کی کسی بھی روسی عورت کو نہیں جانتا تھا۔ بعد میں کچھ لوگوں سے دریافت کرنے پر روبین گیری کو صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اس کی ماں کو مرے ہوئے پورے ساڑھے تین برس ہو چکے ہیں۔ روبین گیری کی حالت ایک بپھرے ہوئے شیر سے کم نہ تھی وہ سیدھا نرسنگ ہوم گیا جہاں اس کی ماں زیر علاج تھی وہاں کے پرانے ریکارڈ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جب گیری اپنی ماں کو آخری سلام کر کے لوٹا تھا اس کے چند دن بعد ہی اس کی نرسنگ ہوم میں موت واقعی ہو گئی تھی۔ مگر گیری کی بہادر ماں نے اپنا منصوبہ کچھ اس قدر ہوشیاری سے بنایا تھا کہ گیری کو اس کی موت کا پتہ نہ چل سکا۔ روبین گیری کی ماں نے اپنے انتقال سے چند دن پہلے تقریباً ۲۷۵ خطوط مرتب کئے تھے اور ان خطوط پر دن اور تاریخ نہیں ڈالی تھی اور ان تمام خطوط کو اس نے اپنے ایک عزیز دوست کو سوئٹزرلینڈ میں بھیج دیئے تھے۔ جو ان کو ترتیب وار روبین گیری کو روانہ کرتا رہا۔

ایسی ماں لاکھوں میں ایک ہوا کرتی ہے جو اپنے سپوت کو اتنی ہمت اور طاقت دے کہ وہ ہر آندھی وطوفان سے جا ٹکرایا روبین گیری کی آنکھیں نم تھیں جب وہ اپنی ماں کی قبر پر پھول چڑھا رہا تھا۔

آج اس کے پاس وہ سب کچھ ہے جو اس کی ماں نے برسوں پہلے اسے بتا دیا تھا۔ آج وہ فخر محسوس کرتا ہے جب لوگ اسے مشہور ناولسٹ اور فرانس کے سفیر کی حیثیت سے ملتے ہیں۔

★★



دوسری جنگِ عظیم کا سب سے انوکھا خفیہ ہتھیار

جارج۔آر۔تھامسن

۲۳ برس گزرنے کے باوجود وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ۱۰ اگست ۱۹۴۴ء کو دو بجے دوپہر میں اپنے لڑاکا طیارے "جنٹل گوز" میں، رودبارِ انگلستان عبور کر رہا تھا کہ ایک جرمن بمبار نے اچانک مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکوں حملہ آور غائب ہو چکا تھا۔ میرے طیارے کے چار انجنوں میں سے ایک تباہ ہو گیا، دن بھر دشمن پر بمباری کی وجہ سے تیل ختم ہونے کے قریب تھا، اس لئے مقابلے کے بجائے میں نے فرار میں عافیت سمجھی۔ چند منٹ بعد ہیڈ فون پر میرے ساتھی پائلٹ کی آواز سنائی دی:

"ہیلو۔ تھامس، ذرا بائیں طرف دیکھو۔ میرا خیال ہے دو جرمن طیارے آپس میں ٹکرانے والے ہیں۔"

میں نے بائیں طرف دیکھا، لیکن کچھ دکھائی نہ دیا۔

"رالف، وہ طیارے کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔ ابھی اس نے جواب نہ دیا تھا کہ ایک عجیب و غریب منظر دکھائی دیا۔ یوں نظر آتا تھا جیسے ایف۔ ڈبلیو ۱۹۰ لڑاکا کی پشت پر جے۔ یو ۸۸ بمبار طیارہ سوار ہے۔ ایک بار تو میں سمجھا شاید دو الگ الگ طیارے ہیں، لیکن غور کرنے سے پتہ چلا کہ واقعی ایف۔ ڈبلیو ۱۹۰ پر جے۔ یو ۸۸ طیارہ رکھا ہے۔ اس سے پہلے کبھی ایسی چیز دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ ہیڈ فون پر اپنے عملے کو حیرت اور پریشانی کے عالم میں اس عجیب و غریب جرمن طیارے کے بارے میں باتیں کرتے سنا۔ میں خود حیران تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جرمنوں کو یہ کیا سوجھی۔ ایف۔ ڈبلیو ۱۹۰ از خود بہت اچھا لڑاکا طیارہ تھا اور جے۔ یو ۸۸ بھی نہایت کارآمد اور مفید بمبار سمجھا جاتا تھا۔ آخر ان دونوں کو ملانے کا مقصد کیا تھا، ہو سکتا ہے یہ بھی ہٹلر کی نئی جنگی چال ہو۔ ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ میرے ساتھی نے چیخ کر کہا:

"تھامس، ہوشیار ہو جاؤ، جے یو ۸۸۔ ایف ڈبلیو لڑاکا کی پشت پر سے اُتر آیا ہے۔"

یکایک صورتِ حال مجھ پر واضح ہو گئی۔ ہمارا پالا جرمن میزائل سے پڑا تھا۔ جے۔ یو ۸۸ طیارہ اصل میں میزائل تھا جو

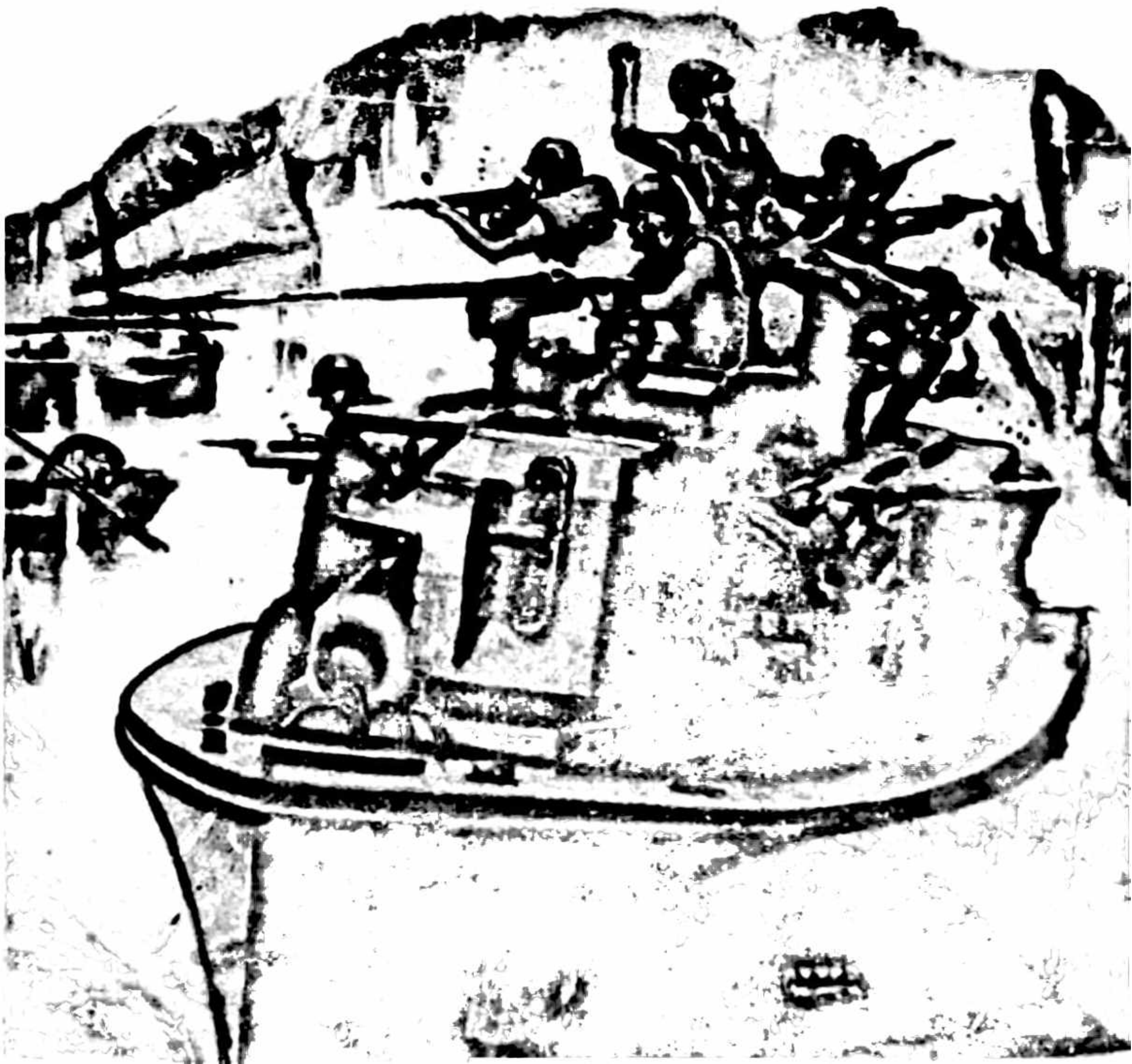
ایف۔ ڈبلیو ۱۹۰ کا طیارے کے کنٹرول میں تھا۔ جرمن پائلٹ جب چاہتا اسے کسی نشانے پر گرا سکتا تھا۔ میں نے نقشے پر نظر ڈالی۔ جرمن جے۔ یو۔ ۸۸ طیارہ بڑی تیزی سے ساؤتھمپٹن کی طرف جا رہا تھا جہاں اتحادی فوجیں چھاؤنی ڈالے پڑی تھیں اور ہائی کمان کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھیں۔ چھاؤنی میں گولے بارود کا ذخیرہ بھی تھا جسے فوراً آگ لگ سکتی تھی۔

"رالف، ہوشیار ہو جاؤ، ہم جے۔ یو۔ ۸۸ کا پیچھا کریں گے ہر قیمت پر اسے نیست و نابود کرنے کی کوشش کریں گے، ورنہ ساؤتھمپٹن کے اسلحہ خانے کی تباہی کا خطرہ ہے۔"

میں پہلے بتا چکا ہوں، ہمارے پاس تیل قریب الختم تھا اور ایک انجن بھی بیکار ہو چکا تھا لیکن ساؤتھمپٹن چھاؤنی کی طرف بڑھتے ہوئے اس طیارہ نما میزائل کو روکنا بہت ضروری تھا میں نے "جنٹل گوز" کو پوری رفتار سے جرمن طیارے کے پیچھے لگا دیا اور فون پر عملے کو ہدایت کی:

"جونہی جے۔ یو۔ ۸۸ آپ کی زد میں آئے، فائر کھول دیجئے!"

میرا خیال تھا اس پر حملہ کرنا چنداں مشکل نہ ہوگا کیونکہ اس میں توپچی ہوں گے اور نہ نشانہ لے کر بم پھینکنے والے۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ جرمن طیارہ ایف۔ ڈبلیو ۱۹۰، اس



علاقے میں تھا اور چھوڑے ہوئے میزائل نما جے۔یو ۸۸ طیارے کو کنٹرول کر رہا تھا۔

جنگ کے دنوں میں اتحادی طیاروں کی موثر بمباری سے تنگ آ کر ہٹلر نے میزائل نما طیارے تیار کرنے کا حکم دیا جو ٹارگٹ پر جا کر خود تباہ ہو جائے لیکن اس جگہ کو تہس نہس کر دے۔ انھیں فوج کی مخصوص اصطلاح میں

کہتے تھے۔ ان طیاروں میں سے مسٹل خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو لڑاکا اور بمبار طیارے کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ عرفِ عام میں اسے "باپ بیٹا" طیارہ کہتے تھے۔ مسٹل طیارے جنوری ۱۹۴۴ء میں تیار کر لئے گئے۔ ان کے موثر ہونے کے تجربات بھی ہو چکے تھے۔ مسٹل کا زیریں حصہ ایف۔ ڈبلیو ۱۹۰ پر مشتمل تھا اور بالائی حصہ جے۔یو ۸۸ سے مشابہہ۔ جے۔یو ۸۸ میں عملے کے بیٹھنے کی جگہ بارود ہی بارود بھرا ہوا تھا اور اس میں پائلٹ کی ضرورت نہ تھی۔ ایف۔ ڈبلیو ۱۹۰ میں بیٹھا ہوا پائلٹ جب چاہے اسے کسی خاص نشانے پر گرا سکتا تھا۔ اس طیارہ نما میزائل کو الگ کرنے سے پہلے پائلٹ اس میں حسبِ ضرورت ایندھن بھرتا تھا تاکہ زیادہ ایندھن ضائع نہ ہو اور اس وقت تک علاقے میں موجود رہتا تھا جب تک جے۔یو ۸۸ ٹھیک نشانے پر نہ لگے۔ اگر اس کا رخ درست نہ ہو تو پائلٹ ریڈیو پر آزاد کئے ہوئے طیارے کو کنٹرول کر سکتا تھا۔

ورنر بمباش، جرمن بمبار طیاروں کا ناظمِ اعلیٰ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوتے ہی وہ مسٹل استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن لفٹ ویفی کے چیف ہرمن گوئرنگ نے اجازت نہ دی۔ ایسٹ پرشیا میں انھیں پہلی بار استعمال کرنے کا منصوبہ بنا لیکن اس کا موقع ہی نہ ملا، کیونکہ روس نے ایسٹ پرشیا پر قبضہ کر لیا۔ بالآخر گوئرنگ نے حکم دیا کہ مسٹل طیارے مغربی محاذ پر اتحادی بحری جہازوں اور زمینی چھاؤنیوں کو تباہ کرنے کے لئے بھیجے جائیں۔ کئی ہفتے تک اتحادیوں پر حملے ہوتے رہے، لیکن وہ یہ سراغ نہ لگا سکے کہ تباہ کن جے۔یو ۸۸ طیارہ نہیں، میزائل ہے۔ ٹارگٹ پر گرتے ہی یہ طیارے جل کر راکھ ہو جاتے تھے اور یہ اندازہ کرنا ممکن نہ تھا کہ ان میں کوئی پائلٹ تھا یا نہیں۔ بہرکیف میں وہ پہلا اتحادی پائلٹ ہوں جسے حقیقتِ حال کا علم ہوا، لیکن یہ واقفیت مجھے بہت مہنگی پڑی اور ایک بار تو میں سمجھا کہ اب بچنا ناممکن ہے۔

رودبار انگلستان عبور کرتے ہی مسٹل سے چھوڑے ہوئے جے۔یو ۸۸ کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ میں "جنٹل گوز" کو اس کے قریب لے گیا۔

"تیز اور تیز، رالف، ہمت کرو، ورنہ وہ چھاؤنی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا۔"

جلد ہی ہم ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے جرمن جے۔یو ۸۸ پر آسانی سے حملہ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا:

"اگر توپچی یہاں سے بھی نشانہ نہ لے سکیں تو ان سب کا کورٹ مارشل کرا دوں گا۔"

اگلے ہی لمحے مجھ پر اپنی حماقت ظاہر ہو گئی۔ اگر میں یہاں جرمن طیارے کو تباہ کرنے کے لئے فائر کھلواؤں تو جرمن طیارے کے ساتھ ساتھ ہماری تباہی یقینی ہے۔ جے۔یو ۸۸ میں بارود اور بھک سے اڑ جانے والے مادے کثرت سے ہوں گے اور ہم کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں، اپنے طیارے کو دور نہ لے جا سکیں گے۔ ہم جے۔یو ۸۸ کے بالکل متوازی پرواز کر رہے تھے۔ میں ہیڈ فون پر توپچیوں کے بڑبڑانے کی آواز سن رہا تھا۔ غالباً وہ حیران تھے کہ میں فائر کھولنے کا حکم کیوں نہیں دیتا۔ میں نے سوچا کہیں وہ جوش میں آ کر یہ حماقت نہ کر بیٹھیں، پوزیشن واضح کرنے کا وقت نہ تھا۔ بار بار فون پر کہنے لگا۔

"فائر مت کھولو، فائر مت کھولو، کسی قیمت پر فائر مت کھولو۔" اور ساتھ ہی ساتھ پوری کوشش کی کہ "جنٹل گوز" کو

جرمن تباہ کن جے۔یو ۸۰ سے دور لے جاؤں۔ جب اپنے خیال میں ہم جے۔یو ۸۰ کی پہنچ سے باہر آ گئے تو ڈمی میں سے ایک توپچی چلایا۔

"پائلٹ، سنبھل جاؤ، جے۔یو ۸۰ اپنا پہلا راستہ چھوڑ کر تمہارے پیچھے آ رہا ہے۔"

خون میری رگوں میں منجمد ہو گیا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ جے۔یو ۸۰ کی رفتار بہت تیز ہے اور چار کے بجائے تین انجنوں کی طاقت پر میرے لیے اس کا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ جے۔یو ۸۰ کو مجھ پر فائر کھولنے کی ضرورت نہ تھی، وہ صرف میرے طیارے سے ٹکرانا چاہتا تھا سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس عفریت سے کیسے جان بچاؤں۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ڈمی میں سے توپچی پھر چلایا۔

"پائلٹ! جرمن طیارہ ایف۔ڈبلیو۔۱۹ ابھی ہمارے سر پر منڈلا رہا ہے۔"

ادھر کنواں ادھر کھائی، یا اللہ رحم کر، میں نے بڑی تیزی سے "جنٹل گرز" کو دائیں سمت موڑ لیا، لیکن ڈائل پر نظر ڈالی تو خوف سے بدن میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ تیل ختم ہونے والا تھا اور اندازے کے مطابق میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ اور پرواز کر سکتا تھا۔ زمین سے بہت قریب آ چکا تھا اور درختوں کی چوٹیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ادھر توپچی پریشانی کی حالت میں ابھی تک شکایت کر رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا میں فائر کھولنے کی اجازت کیوں نہیں دیتا۔

"فائر مت کھولنا، فائر مت کھولنا۔" میں نے ایک بار پھر تنبیہ کی۔

ہم ہوا میں قلابازیاں کھا رہے تھے۔ کبھی دائیں مڑتے کبھی بائیں۔ دونوں جرمن طیارے "باپ اور بیٹا" ہمیں نرغے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ اچھے بھلے اڈے کی طرف جا رہے تھے، خواہ مخواہ یہ مصیبت مول لی۔ تیل کا ذخیرہ ختم ہوتا جا رہا تھا، پلٹ کر جرمن طیاروں پر جھپٹنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ کبھی دائیں بائیں اور کبھی سر پر، ایف ڈبلیو۔۱۹ منڈلا رہا تھا، تو پیچھے جے۔یو ۸۰۔ ہم زمین سے قریب تھے، دوبارہ اوپر جانا ممکن نہ تھا۔ میں سمجھ گیا جرمن پائلٹ کیا چاہتا ہے۔ وہ ہم سے اس طرح کھیل رہا تھا جیسے بلی چوہے سے کھیلتی ہے۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ اس وقت تک مجھے دائیں بائیں یا اوپر نہ جانے دے جب تک تباہ کن جے۔یو ۸۰ مجھ سے ٹکرا نہ جائے۔ موت آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔ آخر میں نے تہیہ کر لیا کہ اس سے قبل کہ جرمن طیارہ نمبر ایک مجھے تباہ کرے، میں خود کو ایف۔ڈبلیو۔۱۹۰ سے ٹکرانے کی کوشش کروں گا تاکہ تباہی کی صورت میں جرمنوں کا بھی نقصان ہو۔

"رالف، بچنا بہت مشکل ہے ـــ میں ایف ڈبلیو ۱۹۰ سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں، تم سنبھل جاؤ۔" میں نے ہیڈ فون پر کہا۔

"او کے۔" اس کی تھکی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے رفتار بڑھانے کی کوشش کی، لیکن تیل کا پریشر کم ہو گیا تھا۔ ڈائل پر نظر ڈالی، میں سات منٹ تک ہوا میں رہ سکتا تھا۔

سات منٹ ـــ یعنی ۴۲۰ سیکنڈ ـــ میں ایک بار پھر طیارہ اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا اور احساس ہوا کہ تیسرا انجن بھی بیکار ہو گیا ہے ـــ شاید رفتار کا دباؤ پڑنے سے اس کے کل پرزے جام ہو گئے تھے۔ اب صرف دو انجن کام کر رہے تھے۔ تیل ختم ہونے میں ساڑھے چھ منٹ باقی تھے۔

نصف منٹ گزر گیا ـــ ایک اور منٹ گزر گیا۔

میرے طیارے کی رفتار خود بخود آہستہ ہو رہی تھی۔

اچانک جرمن طیارہ ایف ڈبلیو۔۱۹ مجھ پر جھپٹنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں از خود رفتار کم کر دوں تاکہ پیچھے آنے والا طیارہ نمبر

میزائل مجھ سے ٹکرا جائے۔ مایوسی ہی مایوسی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ گھر والوں اور دوستوں کی تصویریں آنکھوں کے سامنے لہرانے لگیں۔ موت کا یقین ہو جائے، تو انسان کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگتا ہے۔ اس مختصر سے وقفے میں سیکڑوں خیال آئے۔ دماغ کی فلم تیزی سے چل رہی تھی۔

میرے طیارے کی رفتار اور کم ہو گئی، دو انجن کہاں تک ساتھ دے سکتے تھے۔

ڈائل پر دیکھا، پانچ منٹ سے زیادہ کا تیل نہ تھا۔



ہم سطح زمین سے زیادہ سے زیادہ بیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے تھے کہ میری نظر پانی کی ایک بہت بڑی ٹینکی پر پڑی۔ میں نے طیارے کا رُخ اس طرف موڑ دیا۔ پانی کی ٹینکی سامنے آگئی۔

میں نے بالکل قریب پہنچ کر سارا وزن ڈھیل پر ڈال دیا اور ہم یک لخت اوپر اُٹھ گئے۔ میں نے جو سوچا تھا وہی ہوا۔ جلدی میں ایف ڈبلیو ۱۹۰ کا جرمن پائلٹ بمشکل سنبھل سکا، لیکن اسے اتنا وقت نہ ملا کہ جے۔یو ۸۸ کا رُخ بدل سکے جس میں کوئی پائلٹ نہ تھا اور جو ہمارے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ ایک دھماکا ہوا اور جرمنوں کا جدید ترین طیارہ نما میزائل پانی کی ٹینکی میں دھنس گیا۔ فضا دھندلی ہو گئی تھی اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ دھواں کم ہوا تو میں نے نیچے دیکھا جے۔یو ۸۸ تباہ ہو چکا تھا اور ایف ڈبلیو ۱۹۰ کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ میرا خیال تھا، وہ مایوس ہو کر چلا گیا ہے

ڈائل کی طرف دیکھا، ہم ساڑھے تین منٹ تک پرواز کر سکتے تھے۔ "جنٹل گوز" کے دو انجن بیکار ہو چکے تھے، تاہم اڈے تک پہنچنے میں زیادہ مشکل پیش نہ آئی۔

بعد میں پتہ چلا کہ جرمن مسٹل کا بالائی حصہ (جے۔یو ۸۸) اینڈور کے مقام پر گرا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں صرف دو مسٹل طیارے انگلستان میں تباہ ہوئے۔ ان میں سے ایک ہم نے ٹینکی سے ٹکرا دیا، دوسرا مینس فیلڈ میں پانچ اتحادی لڑاکوں نے مل کر گرایا جن میں سے ایک اتحادی طیارہ موقع ہی پر تباہ ہو گیا۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، جنگِ عظیم کی تاریخ میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ ایک ہیوی بمبار "جنٹل گوز" نے بیک وقت مسٹل طیارے کے دونوں حصوں (جے۔یو ۸۸ اور ایف ڈبلیو ۱۹۰) کا مقابلہ کیا ہو۔

آج تیس برس گزرنے پر بھی مجھے ایک ایک منظر اسی طرح یاد ہے، اور جب اس معرکے کی تفصیلات پر غور کرتا ہوں، بدن میں سنسنی سی محسوس ہوتی ہے حالانکہ اب جرمنوں کا یہ خفیہ ہتھیار کوئی خفیہ ہتھیار بھی نہیں رہا ہے، روس اور امریکہ بڑے طاقتور میزائل بنا چکے ہیں اور خود کار میزائل بنا چکے ہیں۔ میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ اگر دنیا میں تیسری جنگ ہو گئی تو اس کا انجام کیا ہو گا۔

■■

گے۔ اور انہیں معافی عطا کردی جائے گی۔ لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے دُکھ محسوس ہوتا ہے کہ عیسائیوں کے دلوں میں مسلمانوں کے بارے میں ایسا جذبۂ خیرسگالی کبھی پیدا نہیں ہوسکا، بلکہ جوں جوں کسی شخص کا رتبہ "چرچی" حلقوں میں بلند ہوجاتا ہے۔ اس کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں نیک خواہشات کا خاتمہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

ہمارے گھرانے کے مزاج میں ادبی ذوق رچا بسا ہوا تھا۔ میری والدہ عربی اور فارسی ادب سے گہرا لگاؤ رکھتی تھیں انہیں لاتعداد شعر زبانی یاد تھے۔ کھانے کے دوران اکثر والدہ ادب کے بارے میں گفتگو فرماتیں۔

مجھے اپنے لڑکپن کے بارے میں ایک بات کا احساس بہت شدت سے ہے اور وہ یہ کہ ان دنوں میں بہت خوش و خرم رہتا تھا۔ یا اداس اداس اور بجھا بجھا سا؟ — اس سوال کا کوئی حتمی جواب دینے سے تو میں قاصر ہوں، لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اس وقت میرا کوئی ہم عمر ساتھی نہیں تھا، سوائے دو آدمیوں کے، ایک میرے رشتہ کے بھائی آغا شمس الدین تھے اور دوسرے ان کے بھائی عباس۔ یہ قریب قریب میرے ہم عمر تھے اور اس کے ساتھ ساتھ میرے ہم ذوق اور ہم نظر بھی۔ یہ دونوں میرے لڑکپن کے بہترین دوست اور میری بہت محبوب شخصیتیں تھیں۔ ایک بات مجھے بڑی اچھی طرح یاد ہے اور وہ یہ کہ میں بہت محنتی آدمی تھا اور بڑے اَن تھک انداز میں کام کرنے کا عادی تھا۔ تیرہ سال کی عمر تک پہنچتے ہی میں انگریزی بولنے اور لکھنے پر قادر ہوگیا تھا۔ فرانسیسی کی بھی شُدبُد تھی۔ فارسی بھی اچھی خاصی تھی۔ اور عربی کا بھی معقول علم حاصل کرلیا تھا۔ مجھے رُوم کی تاریخ پر بھی خاصا عبور تھا۔ اور اسلامی تاریخ پر بھی۔ سائنس کے مضامین میں بھی خاصی حد تک واقفیت رکھتا تھا میری سائنسی تعلیم محض نظریاتی نہیں تھی۔ اپنے تمام گھروں میں میں نے لیبارٹریاں قائم کر رکھی تھیں اور میں روزانہ کچھ نہ کچھ وقت لیبارٹری میں جاکر تجربے ضرور کرتا تھا۔

مجھے مطالعے کا بھی بے انتہا شوق تھا، ابھی میں دس



نئے آغا خان پرنس کریم بمبئی میں



برلن پر پہلا ہوائی حملہ

انا طولی ہوالوف

"۷، ۸ اگست کی رات کو بالٹک بیڑے کے ایر فورس کے ڈی۔ بی ۔۳ بمبار ہوائی جہازوں نے کرنل وائی۔ این۔ پریوبراژنسکی کی کمان میں سار یما جزیرے سے اڑان کی اور برلن پر پہلا ہوائی حملہ کیا۔"

نازی جرمنی سے جنگ کے پہلے سال ۱۹۴۱ء کے اس بھیانک اگست میں جب ریڈیو سے مندرجہ بالا خبر نشر کی گئی تو یہ فاشزم پر آئندہ فتح کی طرف صرف ایک قدم اٹھانے کی خبر ہی نہیں تھی۔ اس سے پہلے جولائی میں گوئرنگ نے ساری دنیا کو للکار کر کہا تھا کہ تیسری رائخ کی راجدھانی پر اگر ایک بھی روسی بم گرایا جا سکا تو وہ اپنا نام بدل کر "ملر" رکھ لے گا۔ (جو سب سے عام جرمن نام ہے۔)

کرنل یوگینی پریوبراژنسکی کی کمان میں بالٹک بیڑے کے بمبار ہوائی جہازوں کے ایک گروپ کا حملہ بہت زیادہ فوجی اور سیاسی اہمیت رکھتا تھا اس لئے کہ اس نے نازیوں کے ان بڑے بڑے دعووں کی قلعی کھول دی کہ انھوں نے سوویت ایر فورس کو بالکل تباہ کر دیا ہے۔

۸½ بجے شام کو تکنیک کاروں نے جہازوں کے انجن گرمانے شروع کئے۔ نیویگیٹروں نے اپنے آلات کی ایک بار پھر جانچ کی۔ بم گرانے والوں نے جہازوں پر بم ٹھیک سے جما کے رکھے اور کارتوسوں اور گولوں کی پیٹیوں کے کیس لادے۔ مغرب میں سورج ڈوب رہا تھا لیکن ابھی تک خاصی روشنی اور گرمی تھی۔ چاند مشرق میں آنے لگا تھا۔ اور اس کی ایک نوک لگتا تھا پائن کی شاخوں میں الجھی ہوئی ہے۔ یہ منظر اتنا پرسکون اور خواب جیسا تھا کہ لگتا تھا جنگ کا کہیں نام و نشان بھی نہیں۔ نہ بموں اور گولوں سے گھر ڈھے رہے تھے اور نہ کوئی اور چیز دنیا کے چین میں خلل ڈال رہی تھی۔

۹ بجے کرنل پریوبراژنسکی اپنا بمبار جہاز لے کر اڑے۔ ٹیک آف لائن پر سگنل کی بتیاں مدھم مدھم جل بجھ رہی تھیں جہاں سے ایک کے بعد ایک بمبار جہاز بلند ہونا شروع ہوئے اور تاریک ہوتے ہوئے آسمان کا جزو بن گئے۔ جہازوں نے رخصت ہونے سے پہلے ہوائی اڈے کا ایک چکر لگایا اور برلن کی طرف چل پڑے۔



جہاز ہر طرف سے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ نہ کچھ اوپر نظر آتا ہے نہ نیچے۔ آکسیجن ماسک اور آنکھوں کو ڈھکنے والی عینک پر برف جیسی دبیز دھند چھائی ہوئی ہے۔ کرنل نے پنسل سے اسے صاف کرنے کی کوشش کی لیکن بس ایک خراش پڑ کر رہ گئی۔ پریوبراژنسکی نے اپنا ماسک اتار لیا اور اس پر منھ سے گرم سانس کی پھونک مارنی شروع کی۔ انہیں لگا کہ انہیں متلی ہونے لگی ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے۔ رجمنٹ کے فلیگ نیویگیٹر پیوتر شخلوف نے اپنے سمور کے دستانے اتار لئے ہیں اس لئے کہ یہ دستانے پہن کے آلات کو ٹھیک سے استعمال نہیں کر پا رہے تھے۔

میجر میخائیل پلوتکن نے اپنا جہاز کمانڈر کے اسٹاربورڈ ونگ پر کر لیا۔ انہیں راستہ معلوم تھا، اس لئے کہ وہ راستہ معلوم کرنے کی پرواز پر چند دن پہلے اچھی طرح بموں سے لیس ہو کر گذر چکے تھے۔ لیکن انھیں حکم یہ تھا کہ ایک بم گرائے بغیر اڈے پر واپس آجائیں۔ پچھلے چند دنوں میں موسم خراب ہو گیا تھا لیکن اس کٹھن اڑان کے باوجود سارے پائلٹ خوش تھے۔ میخائیل اپنی پوری کوشش کر رہے تھے کہ کمانڈر کا جہاز نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ لیکن بار بار بادل انہیں ایک دوسرے کی نظر سے اوجھل کر دیتے تھے۔ دوسرے جہاز بھی ایک دوسرے کو دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ جہاز کے عملے اور اپنے ملک کے اڈوں کے درمیان ریڈیو مراسلت کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ صرف فلیگ ہوائی جہاز کے ریڈیو آپریٹر کرژنکو کو بس ایک پیغام بھیجنے کی اجازت تھی اور وہ بھی اس وقت جب مشن پورا ہو جائے۔

نیویگیٹر نے فلائٹ کے راستے پر رپورٹ دی۔ میجر پلوتکن نے گردن ہلا دی۔ حالانکہ راستہ انھیں زبانی یاد تھا۔ آنکھیں بند کر کے بھی وہ اس راستے پر جا سکتے تھے جیسے کہ ان کی ذہن کی آنکھیں فاشسٹ راجدھانی کی سڑکیں اور محلے اور اہم فوجی ٹھکانے صاف دیکھ رہی تھی انھوں نے پچھلے چند دنوں میں یوں ہی تھوڑا ہی برلن کی اس قدر ،، خاک چھانی ،، تھی۔ ظاہر ہے کہ برلن کی یہ سیر

انھوں نے نقشے کے ذریعے کی تھی۔

جہاز بلند ہونا شروع ہوا اور کیبن میں درجۂ حرارت اور آکسیجن کی مقدار کم ہونے لگی۔ سامنے سرمئی بادل تھے اور آنکھوں میں رنگوں کی پٹیاں تھرمرا رہی تھیں۔ زنہ اٹھاکر کنٹرول تک لے جانے میں بھی دشواری ہوتی تھی۔ لگتا تھا جیسے کیبن کی ہوا سرخ ہوگئی ہے۔ میجر نے آکسیجن ٹینک کھول دیا۔ نظر نہ آنے والی سکون بخش گیس کے جھونکے سے ماسک بھر گیا۔

چھ ہزار میٹر کی بلندی پر وہ اسٹیشن کے اوپر سے گزرے۔ ان کے انجنوں کی آواز بادلوں کو چیرتے ہوئے نیچے پہنچی ہوگی اس لئے کہ انہیں نیچے آنے کا اشارہ کرنے کے لئے اسپاٹ لائٹ روشن ہوگئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نازی رات کے اڑانوں کے کافی عادی تھے اور ان میزبانی کی وجہ صاف تھی وہ روسی جہازوں کو اپنے ہی سمجھ رہے تھے۔ اسپاٹ لائٹوں نے ہوائی اڈہ روشن کر دیا۔ جہازوں کی قطاریں ہنگار، مرمت کے شیڈ اور بارکیں صاف نظر آنے لگیں۔ کیا اچھا نشانہ تھا لیکن نہیں آگے جانا تھا۔

اسٹیشن کے آگے موسم اور خراب ہوگیا۔ جہازوں کے شیشوں پر گہرا سرمئی اندھیرا چھا گیا اور جہازوں کے دھڑوں پر اولے بالکل بموں کے پرخچوں کی طرح تڑاتڑ گرنے لگے۔ باہر کا درجۂ حرارت صفر سے ۴۵ ڈگری نیچے تھا۔

جہاز ہم پھسلے اور خود بخود نیچے دشمن کی زمین کی طرف گرنے لگے۔ اوپر جانا تکلیف دہ بہت تھا لیکن پائلٹوں نے ہوا کے اس پہاڑ پر ایک ایک میٹر کر کے چڑھنا شروع کیا۔ پنکھ کے نیچے بڑے بڑے غباروں کی طرح گھنے سیاہ بادل منڈلاتے رہے۔

اسٹیشن سے برلن تک کی پرواز پچاس منٹ تک کی تھی۔ انہوں نے ابھی آدھا فاصلہ طے کیا گیا تھا خخلوف نے اعلان کیا، برلن آنے ہی والا ہے۔

ریڈیو آپریٹر کرتنکو اور بم برسانے والا ردوگو پوری طرح تیار تھے۔ اچانک بادل غائب ہوگئے۔ سیاہ نیلگوں آسمان پر ستاروں کی بھرمار ہوگئی اور چاند نے سگنل لائٹ کے بغیر اڑنے والے جہازوں کو بھی بھر کے روشن کر دیا۔ کرنل نے سارے جہاز گنے۔ سب تھے۔ بادلوں میں کوئی بھٹکا نہیں۔ ہر ایک کے انداز سے وہ آسانی سے بتا سکتا تھا کہ کون سا جہاز کون پائلٹ اڑا رہا ہے! وہ فوکین ہے، وہ یفریموف، وہ گریچشنیکوف۔

افق پر سرخی نظر آنے لگی تھی۔ وہ سرخی جو کسی بھی بڑے اور خوب روشن شہر پہنچنے سے پہلے دور ہی سے نظر آتی ہے۔ پائلٹوں کو فاشستوں کے اعتماد پر حیرت ہوئی۔ کہیں بلیک آؤٹ کا نام ونشان نہیں۔ سڑکیں جھک جھک روشن تھیں اور رات گئے چلنے والی ٹرامیں اپنے پیچھے چنگاریوں کے بگولے چھوڑتی ہوئی اپنی جگ مگ جگ مگ کرتی پٹریوں پر دوڑتی پھر رہی تھیں۔

گھڑی کی سوئیاں رات کے بارہ بج کر ۵۰ منٹ بجا رہی تھیں۔ بلندی پیما بتا رہا تھا کہ جہاز اس وقت ہزار میٹر کی بلندی پر ہے۔

نیچے برلن پھیلا ہوا تھا۔ ایسا صاف جیسے نقشے پر بنا ہوا ہو اور لاکھوں بتیاں یوں روشن تھیں جیسے جنگ ہی نہ رہی ہو۔

کرنل نے جہازوں کو سگنل دیا کہ وہ پہلے سے طے

کئے ہوئے نشانوں کی طرف چل دیں۔

اپنے نشانے کے اوپر پہنچ کے پلوتکن نے حکم دیا۔ "تیار!" برلن جیسے سکتے میں جم کے رہ گیا۔ اچانک بلیک آوٹ ہو گیا۔ لیکن وقت گزر چکا تھا!

پلوتکن نے چیخ کر حکم دیا۔ "بم گراؤ"

اپنا بوجھ پھینکتے ہوئے جہاز نے ہچکولہ کھایا اور دھماکوں نے آنکھوں کو چکا چوند کر کے نیچے شہر کے پرخچے اڑا دئے

سیاہ شہر پر لڑاکا جہازوں کی روشنیاں آسمان کو چیرتی ہوئی اوپر آئیں۔ تین فاشسٹ جہاز پریوبراژنسکی کے جہاز پر لپکے "سائیکلوپوں کی طرح" یہ خیال دماغ میں کوندے کی طرح آیا اور کرنل نے اپنا جہاز موڑا تاکہ دونوں توپچیوں کو نشانہ لگانے کا موقع مل جائے۔

کروتنکو کی پہلی ہی مار نے ایک لڑاکا جہاز کے ٹکڑے کر دئے۔ باقی دو بھاگ کھڑے ہوئے۔ جہاز مار گولے آسمان میں آ آکر پھٹ رہے تھے۔ اور فاشسٹ پائلٹ شاید ڈر گئے کہ کہیں وہ اپنے ہی گولوں کا شکار نہ ہو جائیں گولے پھٹنے کی آواز تو نہیں سنائی دے رہی تھی لیکن جہازوں کے ارد گرد کے آسمان پر سفید دھوئیں کے مرغولے ہی مرغولے منڈلا رہے تھے۔

اور اب برلن اندھیرے میں چھپ بھی نہیں سکتا تھا بمباری سے آگ لگی تھی اور شہر کے کارخانے، پٹرول کے ٹینک، اور گوداموں میں رکھے ہوئے گولے اور بم جو محاذ پر بھیجے جانے کے لئے رکھے ہوئے تھے، جل اٹھے تھے اور پھٹ رہے تھے اور اسٹیشن کی شیشے کی چھت پر ناچتے ہوئے شعلوں کا عکس پٹرول کی روشنی کو اور بڑھا رہا تھا۔

کروتنکو نے فوراً سیدھے صاف لفظوں میں ایک پیغام بھیجا۔ "میں اس وقت برلن کے اوپر ہوں۔ مشن پورا ہو گیا! اپنے اڈے کو واپس ہو رہا ہوں"

شعلے سارے برلن میں پھیل کر رات کو شہر بدر کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جہاز وطن کی طرف لوٹ پڑے۔

جب وہ اپنے اڈے پر واپس آئے تو سورج نکل رہا تھا۔ سمور کے موٹے موٹے اوورکوٹوں اور سمور کے استر والے بوٹوں سمیت تھکے ماندے پائلٹ اپنے اپنے جہازوں سے نکل کر زمین پر بیٹھ گئے اور لیٹ گئے۔

پریوبراژنسکی کو کسی نے ایک تار لاکر دیا۔ انہوں نے اس پر نظر دوڑائی اور بہت سنجیدہ لیکن بلند آواز میں پڑھا "ماسکو، بالٹک کے پائلٹوں کو کامیابی کے ساتھ اپنا مشن پورا کرنے پر مبارکباد دیتا ہے"

صبح کو فاشسٹوں نے ریڈیو پر اعلان کیا کہ برطانوی بمبار جہازوں کی ایک بڑی ٹولی نے برلن پر بمباری کرنے کی کوشش کی لیکن جرمن لڑاکا جہازوں اور جہاز مار توپوں نے انہیں شہر کے باہر ہی سے مار بھگایا۔ یہ بھی کہا گیا کہ برطانیہ کے چھ جہاز مار گرائے گئے۔

پلوتکن نے مذاق کیا۔ "اگر مار گرایا ہے تو انجر پنجر کیوں نہیں دکھے۔ اب میں ایسا تو نہیں کہ انہیں مجھ پر انگریز ہونے کا دھوکا ہو"

اسی دن برطانیہ نے تردید کر دی اور اعلان کر دیا کہ موسم ایسا ہے ہی نہیں کہ جس میں جہاز اڑ سکیں اس لئے ان کے ایر فورس نے ۷ اور ۸ اگست کی درمیانی رات کو کوئی پرواز کی ہی نہیں۔

۱۳ اگست کو ہوائی اڈے پر ایک مسرت بخش خبر موصول ہوئی۔ یوگینی پریوبراژنسکی کو سوویت یونین کے ہیرو کا بلند خطاب ملا۔ اور برلن پر پہلی بمباری میں جتنے لوگوں نے حصہ لیا تھا ان سب کو تمغے دئے گئے۔ ★



کی ایک دردناک ڈائری

ایٹناواسو

۱۱ جنوری: ابھی تک میں نے شدید جنگ نہیں دیکھی۔ صرف دو ویت کانگ لونڈوں کو گرفتار کیا ہے۔ بڑے کم عمر ہیں۔ پندرہ سولہ سال کے لگ بھگ ہوں گے۔ دونوں پستہ قامت اور دُبلے پتلے ہیں۔ اگر جنگ کا مطلب یہی ہے تو میں حیران ہوں کہ جنگ اتنی طویل کیوں ہو رہی ہے۔

۱۲ جنوری: ہماری فوجی نقل و حرکت وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے۔ اس میں توپ خانے اور پیادہ فوج کے ہزار کے قریب جوان شامل ہیں۔ بمبار طیارے ان کے علاوہ ہیں۔ کسی ویت کانگ کو تلاش کرنا آسان نہیں، لیکن جب اسے پکڑ لیا جائے تو وہ کونے میں چھپے ہوئے چوہے کی طرح لڑتا ہے۔ ویت کانگ ہمیں تباہ کرتے ہیں اور ہم انھیں کرتے ہیں۔ ہر شخص کے دل و دماغ پر قتل و غارت گری سوار ہے۔ میں اس سے خوف زدہ نہیں، میں تو صرف اس سارے قضیے کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔

ہمارے بکتر بند دستے میں عجیب و غریب قسم کے لوگ موجود ہیں۔ مثلاً سیوتیسیا ہر وقت اپنی محبوبہ، اپنی والدہ اور گھر کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ زرمن کبھی اپنے کالج کی باتیں کرنے سے باز نہیں رہتا، اور اپنی مٹر گشتیوں کی داستانیں سناتا رہتا ہے۔ کرمین ایک ذلیل و خوار روح (حبشی) ہے، جسے اپنی گاڑی چلانے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔

اگر کوئی مسئلہ کھڑا ہوا تو اس کا ذمہ دار لیفٹیننٹ الڈن ہوگا یا سارجنٹ گوس۔ انھیں اپنا کام ازبر ہے لیکن کمبخت بڑے سست اور کاہل ہیں۔

۱۳ جنوری: بعض دیہات میں لوگ اس وقت تک ہمارے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتے ہیں جب تک ہم اُن سے بُرا سلوک نہ کریں۔ ہمارے آدمی ہر شخص کو ڈرانے دھمکانے لگتے ہیں خصوصاً کسی حسین ویت نامی دوشیزہ سے باتیں کرتے وقت وہ ضرور ایسا کرتے ہیں۔ سارجنٹ پال سن نے مجھے سزا کے طور پر بول و براز صاف کرنے پر لگا دیا ہے۔ کیونکہ اس نے مجھے دو نوجوانوں کو ملامت کرتے دیکھ لیا تھا۔ کسی شخص کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں۔ تاہم میں نے ایسا کیا تھا۔

۱۶ جنوری: یہ ملک حقیقی معنوں میں غریب ترین ملک ہے تم جہاں بھی جاؤ، لوگ گھٹنوں کے بل بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ بعض سفید چمڑی والے سپاہی اُن کی مفلسی سے کھیلتے ہیں۔ ہم جا رہے ہیں۔ ہمیں بھوک سے نڈھال بچوں کا ایک گروہ نظر آتا ہے۔ ایک شخص روٹی کا ایک ٹکڑا سڑک پر پھینکتا ہے۔ بچے بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اکثر گاڑی سے ٹکرا کر اس لوٹ کھسوٹ میں زخمی ہو جاتے ہیں۔ یہ منظر بڑا دردناک ہوتا ہے تمھیں کبھی کوئی حبشی ایسی ذلیل حرکت کرتا نظر نہیں آئے گا۔ اسی لئے جنوبی ویت نام کے باشندے حبشیوں کو پیار سے نیک روحیں کہتے ہیں۔

۱۸ جنوری: ایک ویت نامی جوان نے ایک حبشی سے سوال کیا کہ تمھارا رنگ اتنا سیاہ کیوں ہے۔ اس نے جواب دیا: "میری جان، میں خاص قسم کا انسان ہوں۔ مجھے رات کا جنگجو کہتے ہیں۔ کیونکہ ایک ویت کانگ کے لئے مجھے رات کی تاریکی میں تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔"

۲۰ جنوری: افواہیں پھیل رہی ہیں کہ کل ویت کانگ زبردست چھاپہ مارنے والے ہیں۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں ڈیلٹا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ شاید وہیں ان کا ہیڈ کوارٹر بھی قائم کیا جائے۔ ہم پر چھاپہ مارنے کے لئے یہ بہت طاقتور فوج تھی۔ لیکن ہمارے پاس اتنا گولہ بارود ہے جو سارے علاقے کو ملیامیٹ کر دینے کے لئے کافی ہے۔

۲۴ جنوری: ہم مائی تھو علاقے میں ہیں، کیا عجیب غریب مقام ہے۔ دلدل، گھنا جنگل، کیچڑ اور مچھر۔ یہ پیادہ فوج کا علاقہ ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ہم یہاں تھوڑا عرصہ رہیں گے۔

۲۸ جنوری: ہم نے ویت کانگ کے خلاف دو دفعہ کارروائی کی ہے۔ لیکن ہم نے مارٹر گنوں کے فائر سے اپنے ہی

↓ جنگ سے نفرت کے باوجود جنگ میں شرکت



آدمیوں کے ایک دستے کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔

تھوڑی دیر ہوئی ہمارے دو آدمی بارودی سرنگ سے ٹکرا گئے ہیں۔ ان کے جسم کا کوئی ٹکڑا نہیں بچا جسے دفن کرنے کے لئے وطن بھیجا جا سکے۔ ہمارے ارد گرد موت منڈلا رہی ہے۔ مجھے اس مقام سے سخت نفرت ہے اور کوئی شخص بھی ہمارے سامنے اس کی وضاحت نہیں کرتا۔ بعض دفعہ میں حیران ہو کر سوچنے لگتا ہوں کہ ہم ان لوگوں کی مدد کر رہے ہیں یا بلکہ انہیں اذیت پہنچا رہے ہیں۔ اگر آپ نے تنگ دستی اور افلاس کا نظارہ نہیں کیا تو ویت نام آ جائیں۔ آپ کو پتہ چل جائے گا۔

۲۹ جنوری: توپ خانے کے فرائض بڑے پیچیدہ ہوتے ہیں۔ آج کل مارٹر گنوں کے مرکز میں متعین ہوں میرا کام نقشے پر فائر کرنے کا مقام دکھانا ہے۔ او، پی ہمیں ہدایت دیتا ہے اور ہم ٹارگیٹ پر گولے پھینکتے ہیں بعض دفعہ میں خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کی زندگی کو اپنے ہاتھ میں لوں۔ فوج والے مجھ سے ان باتوں کی توقع رکھتے ہیں، لیکن یہ میری فطرت کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں مارٹر گن ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے چلانے میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے۔ میں ہمیشہ دعا مانگتا رہتا ہوں کہ مجھ سے نشانہ لگانے میں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔

۳۱ جنوری: گشت کرنے والے دستے کے ساتھ ایک او، پی کا ہونا لازمی ہے۔ اور ہمارے پاس سولہ دستوں کے لئے صرف تین او، پی ہیں۔ سارجنٹ پال سن اس کام کے لئے آدمیوں کا انتخاب کرتا ہے۔ ابھی تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس کام کے لئے حبشیوں اور پورٹوریکا والوں کو منتخب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہمیں کوئی سبق دینا چاہتا ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ جب بھی مجھے توپوں پر کام کرتے دیکھتا ہے تو میری طرف بڑی تلخ نگاہیں ڈالتا ہے۔ جب وہ آتا ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ کاش میری چمڑی بھی سفید ہوتی۔ کاش حبشی اور پورٹوریکا والے دنیا کو یہ بتا سکیں کہ اس فوج میں ان کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔

۲ فروری: پال سن پورا گدھا ہے۔ وہ ہمیشہ مجھ سے یہی کہتا رہتا ہے کہ حبشی سست ہیں اور اپنی مدد نہیں کرتے وغیرہ۔ اس ملعون فوج میں سفید چمڑی والوں کا بھی یہی حال ہے، لیکن میرے خیال میں حالات اس سے مختلف ہیں۔ کیونکہ یہاں سوال زندگی حیات کا ہے۔ لیکن پال سن پر اس کا کچھ اثر نہیں ہے۔ فوج کے تمام حبشی جوان غصے سے دانت پیسنے لگے ہیں۔ میری حالت مختلف ہے۔ لیفٹیننٹ آلٹن جو پلٹن کا افسر ہے۔ عام طور پر ہم حبشیوں کو بہت بری طرح مخاطب کرتا ہے۔ سارجنٹ گولاس ابن الوقت ہے۔ بعض مرتبہ وہ انسان معلوم ہونے لگتا ہے۔ بعض دفعہ وہ ہمیں خاک کے ذرے سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ یہ لوگ مجھے ویت کانگ لوگوں سے زیادہ برے لگتے ہیں۔ میں یہاں تلخ حقائق کا تجربہ کر کے سبق حاصل کر رہا ہوں۔ یہ سفید چمڑی والے سبق دینے میں ہوشیار ہیں۔

۷ فروری: مجھے ساری کارروائی دیوار پر لکھنی پڑتی ہے۔ پال سن کہتا ہے کہ میں لکھنے میں تیزی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ میں بوٹ پہن کر تیار ہو رہا ہوں۔

۹ فروری: مجھے ڈیوٹی سے ہٹا دیا گیا ہے۔ یہاں پھر سارجنٹ پال سن کام آیا ہے۔ اس نے مجھے یہ اطلاع مسکرا کر دی ہے اب مجھے او، پی بنا دیا گیا ہے۔ اب مجھے محاذ پر جانا ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم گاڑیوں پر نہیں بلکہ پیدل آگے بڑھیں اور ویت کانگ کا تعاقب کریں۔ میں نے وہ ٹیلیفون اٹھا رکھا ہے جس کے ساتھ ایک آلہ لگا ہے جس میں سے ٹارگیٹ بڑی اچھی طرح نظر آتا ہے۔ یہ کام دراصل ایک سارجنٹ کا ہے۔ لیکن پال سن میرا عہدہ ہرگز نہ بڑھائے گا۔ وہ پکا حرامی ہے۔

۱۲ فروری: پچھلے دو ہفتوں سے ہماری کمپنی کو پیادہ فوج کی ایک بٹالین سے منسلک کر دیا گیا ہے۔ یہ بہت بری بات ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو سلوک چاہیں ہم سے

کریں۔ پیادہ فوج کا کمانڈر مشینی دستوں سے نفرت کرتا ہے۔ وہ ذرا سے اشارے پر ہمیں گاڑیوں سے اُتر جانے کا حکم دے دیتا ہے۔

۱۳ فروری: میں کل کمپنی کے کلرک کے پاس گیا تھا۔ اور میں اس سے اس مسئلے پر گفتگو کرتا رہا کہ مجھے وہ طریقہ بتایا جائے جس سے میں سٹریچر یا تابوت کے بغیر اس عذاب سے نجات پاسکوں۔ اس نے قواعد کی کتاب دیکھ کر مجھے بتایا کہ اگر کوئی منظور شدہ کالج میری درخواست منظور کرلے، اور میرے پاس داخل ہونے کے لئے ۹۰ یوم سے کم ہوں۔ تو مجھے جلد جانے کی اجازت مل سکتی ہے تاکہ میں اپنی جماعت کے ساتھ تعلیم حاصل کرسکوں۔ میں نے ابا کو اس مطلب کا خط لکھ دیا ہے۔

۱۸ فروری: مجھے ڈیڈی نامی لڑکی کی طرف سے ایک خوب صورت محبت بھرا خط موصول ہوا ہے۔ میں اسے بالکل نہیں جانتا۔ ابا نے اسے میرا پتہ دیا ہے۔

۱۹ فروری: یہاں ہر شخص ہر وقت خوف زدہ رہتا ہے۔ اگلے دن، جب گولیاں میرے سر کے اُوپر سے گذر رہی تھیں تو میری حالت ایک خوف زدہ سپاہی کی تھی۔ لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح حواس بجا رکھے۔ صرف ایک مرتبہ میں نے غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو ظاہر کیا۔ لیکن خوش قسمتی تھی کہ کوئی ویت کانگ میرا منتظر نہ تھا۔ اگر میں کوشش کروں تو پھر ایسا موقع نہ آنے دوں گا۔

۲۲ فروری: ویت کانگ نے آج صبح ۲ بجے ہمارے ہیڈ کوارٹر سے کئی میل دُور ایک گاؤں پر حملہ بول دیا۔ وہ لگاتار حملے کرتے رہے۔ گو ہم ان سے بہت زیادہ طاقتور تھے۔ شہری لوگ بھاگنے لگے۔ وہ چیختے، چلاتے اور اپنے بچوں کو بچانے کے لئے زمین پر لیٹ جاتے تھے۔ ہمارے توپچی کے بازو میں گولی لگی۔ میں نے اس کی جگہ سنبھال لی اور ایک راؤنڈ ایک درخت پر چلا دیا جس کے نیچے دو ویت کانگ جاسوس چھپے تھے۔ میں نے یقیناً انھیں مار دیا تھا کیونکہ اس پوزیشن سے اب کوئی فائرنگ نہ ہوئی۔ مجھے اس کا بڑا لطف آیا۔ اس ساری کارروائی میں صرف آدھا گھنٹہ لگا۔ لیکن مجھے یہ عرصہ ایک سال سے زیادہ معلوم ہوا۔

۲۴ فروری: میں اس خونی کھیل کے انجام تک انتظار نہیں کرسکتا۔ یہاں ہر روز کسی نہ کسی کو تلاش کرنا پڑتا ہے جسے گولی سے اڑایا جائے۔ اور اگر تمھیں کوئی شکار نہ ملے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

۲۷ فروری: آج صبح میرے ایک ساتھی نے تقریباً میری جان لے لی تھی۔ ہُوا یوں کہ اس نے افراتفری میں اپنی رائفل کی نالی میری طرف کردی۔ میں فوراً زمین پر گر پڑا اور دعا مانگنے لگا۔ وہ بھی خوف زدہ تھا اور میں بھی، زیادہ کون تھا، مجھے معلوم نہیں۔

یکم مارچ: میرا خیال ہے کہ میں آج کل موت کے بارے میں کچھ زیادہ بے پروا ہو گیا ہوں۔ آج صبح سویرے ہم جمہوریہ ویت نام کے ایک دستے کے ساتھ گشت کر رہے تھے۔ اتنے میں ہم نے ایک ۱۴ سالہ ویت کانگ کو تاڑا جو ایک درخت کی کھوہ میں چھپا بیٹھا تھا۔ ویت نامی سارجنٹ نے اس سے پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بھاگ نکلا۔ ویت نامی نے اسے بندوق کے فائر سے ٹھنڈا کر دیا۔ میرے خیال میں اس نے اسے ٹھہر جانے کے لئے مطلق نہ کہا تھا۔ وہ ویت نامی خون میں لت پت پڑا تھا اور یہ منظر بڑا دردناک تھا میں برداشت نہ کرسکا۔ ویت نامی بدلوانے ہیں وہ انسانی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں جانتے۔

۲ مارچ: مجھے یقین ہے کہ مقامی لوگ ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ دن کی روشنی میں وہ ہم پر مسکراتے ہیں اور رات کی تاریکی میں ان کی اولاد ہم پر آگ برساتی ہے۔

۷ر مارچ: ہم اپنی نفری کی گنتی کر رہے تھے کہ سارجنٹ ینگ نے ایک ویت کانگ کی لاش کو یہ دیکھنے کے لئے ٹھوکر ماری کہ وہ زندہ ہے یا مُردہ۔ وہ مر چکا تھا۔ وہ گولیوں سے سر سے پاؤں تک چھلنی ہو چکا تھا۔ ینگ نے مجھ سے میرا چاقو مانگا۔ میں نے اسے دے دیا۔ اس نے چاقو سے ویت کانگ کی ایک انگلی کاٹ لی۔ اور اس میں سے سونے کی انگشتری اتار لی۔ میں تیزی سے وہاں سے ہٹ گیا۔ میں نے چاقو کا انتظار بھی نہ کیا اس لئے کہ میں سخت بیزار ہو گیا تھا۔

۱۱ر مارچ: میں ہسپتال میں پڑا ہوں۔ چچا سام نے مجھے میری ۲۳ ویں سالگرہ پر ایک تحفہ بھیجا ہے۔ ۷ر مارچ کو ایک دھماکہ ہوا تھا جس سے ہمارے دستے کے پرخچے اُڑنے لگے۔ جب میں زمین پر گرا تو مجھے معلوم ہوا کہ میری گردن سے کوئی چیز بہہ رہی تھی۔ یہ خون تھا۔ میری پیشانی اور بائیں آنکھ زخمی ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ ہمیں پتہ بھی نہ چل سکا۔ مجھے ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔

۱۴ر مارچ: میں واپس فوج میں آگیا ہوں۔ کپتان تھامس ہمارا نیا کمانڈر ہو کر آیا ہے۔ آدمی اچھا ہے لیکن امیر طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔

۲۱ر مارچ: ۱۵ر تاریخ سے میں پھر ہسپتال میں آگیا ہوں۔ ایکسرے سے پتہ چلا ہے کہ میرے دماغ کو نقصان نہیں پہنچا۔ جب مجھے ہسپتال لایا گیا تو ڈاکٹر نے ایک خون آلود چارپائی پر لٹا کر میرا معائنہ کیا اور کہنے لگا کہ آرام کرو اور اپنی یونٹ میں واپس چلے جاؤ۔ دوسرے دن زخم خراب ہو گیا۔ اور میں مزید دو یوم اسی غلیظ چارپائی پر پڑا رہا۔ ڈاکٹروں نے میری کوئی مدد نہ کی۔ میں نے کوشش کی کہ اٹھ کر باہر نکل جاؤں لیکن میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے متعدد بار شکایت کی، لیکن ہر مرتبہ بے سود ثابت ہوئی۔ چوتھے دن میں نے ایک ڈاکٹر کو بازو سے پکڑ لیا۔ اور اسے اپنا سر دکھایا۔ زخم سے پیپ بہہ رہی تھی۔ اس نے اُسے صاف کر دیا اور میں اس دوزخ کے باہر آگیا اور اپنی یونٹ میں شامل ہو گیا۔

۲۳ر مارچ: پیادہ فوج کے ایک ڈویژن نے ویت کانگ کے دستوں کو جنوب کی سمت ہمارے یونٹ کی طرف دھکیل دیا۔ ہم انتظار میں تھے۔ جونہی وہ ہماری زد میں آئے ـــــ ہم نے انھیں کاٹ کے رکھ دیا۔ اس کے بعد سپاہیوں نے خوب بیئر پی اور خوشیاں منائیں۔ میں نے ان میں حصہ نہ لیا۔ موت آخر موت ہے۔ خواہ وہ کسی کو آئے۔

شاید میرا تبادلہ دوسری کمپنی میں کر دیا جائے۔ میرا خیال

ایک سپاہی مر گیا تو دوسرا اس کی تلاشی لے کر اس کے سامان پر قبضہ کر رہا ہے۔



ہے کہ صدر جنٹ پال سن مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے، مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں پیدل چلنے سے اکتا گیا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ ہم کس قسم کی جنگ لڑ رہے ہیں؟ سپاہی کہتے ہیں کہ ہمارے پاس اتنا گولہ بارود اور سامانِ جنگ ہے جو پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں بھی موجود نہ تھا۔ تاہم یہ سیاہ پاجاموں والے ویت کانگ جوان مسلسل لڑ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ان میں سے ہر ایک چالیس چالیس جانیں لے چکا ہے۔

۴ اپریل: ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ ہماری کمپنی سے چند دنوں کے لئے کوئی کام نہیں لیا جائے۔ ہمیں یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ ہم پانچ ویت کانگ گوریلوں کی لاشیں اپنی گاڑیوں کے ساتھ باندھ کر چند قصبوں میں سے گزرے۔ میرے خیال میں یہ کارروائی ہمارے ان نوجوانوں کا انتقام لینے کے لئے کی گئی تھی جنھیں انھوں نے کل مار ا تھا۔ پھر ہمارے چند آدمیوں نے ان لاشوں کا حلیہ بگاڑ دیا۔ چنانچہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ہمارے آدمیوں میں سے بعض نے ان کے کان ایک رسی میں پرو کر گلے میں لٹکا رکھے ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا کہ دوسروں نے ان کے دیگر اعضا بھی کاٹ لئے تھے۔ دیہاتیوں نے ہماری لوٹ کھسوٹ اور دیہات جلانے کی شکایت بھی کی۔ اور اس معاملے میں وہ بڑی حد تک سچے تھے۔

۵ اپریل: ہیڈ کوارٹر کے ایک جرنیل نے کپتان ٹامس کو ہم سب کے سامنے سخت ذلیل کیا۔ وہ کہنے لگا: "تم چوروں کی جماعت اور وحشی کتے ہو"، جب اس کے جواب میں کپتان نے "جناب۔ ہاں، جناب آپ ٹھیک فرماتے ہیں" کہا، تو ہمیں یہ منظر بڑا دلچسپ معلوم ہوا۔

۶ اپریل: میری بائیں طرف ایک عجیب سی آواز آئی۔ میں تیزی سے مڑا۔ میں نے دیکھا کہ میرے ساتھی گرین فیلڈ کے آہنی خود کے ایک سوراخ میں سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ بیہوش



ویت نام میں زندگی جہنم بن چکی ہے۔

ہونے لگا تو اس کے دانتوں کے درمیان انگلی رکھ دی گئی۔ خون کا فوارہ اس کے منہ سے بہنے لگا۔ اسے ابتدائی طبی امداد بہم پہنچائی گئی۔ لیکن وہ مر چکا تھا۔ شاید اب میری باری آئے گی۔ کیا معلوم کون کس وقت موت سے ہم آغوش ہو جائے۔ ابھی کل تک گرین فیلڈ اس لڑکی کے متعلق باتیں کیا کرتا تھا جس سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ بڑا سیدھا سادہ جوان تھا اور بڑھئی بننا چاہتا تھا۔

۲۰ اپریل: ایک سپاہی کہ مین زمین پر پڑے ہوئے ویت کانگی گرینیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا: "بہتر ہے کہ اس لعنتی چیز کو یہیں پڑا رہنے دیا جائے!" اس نے اسے کسی نہ کسی طرح اٹھا لیا۔ اڑڑڑ دھم! بم پھٹا اور کہ مین زمین پر آ رہا۔ اس نے

اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ چلایا: "میرا ہاتھ! اوہ میرے اللہ میرا ہاتھ اڑ گیا ہے!" ہم اس کی مدد کے لئے بھاگے۔ خون بند کرنے کے لئے ابتدائی پٹی باندھی۔ اتنے میں ڈاکٹر پہنچ گیا۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا "میرا ہاتھ تلاش کرو۔ آہ! میرے اللہ میں اس طرح گھر نہ جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا۔" ہم نے اس پر یہی ظاہر کیا کہ ہم تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن ہمیں علم تھا کہ ہاتھ نہیں مل سکتا کیونکہ اس کے تو پرخچے اڑ گئے تھے۔ اس بے وقوف نے گرینیڈ اٹھایا ہی کیوں تھا۔

۲۴ اپریل: میں ڈاکٹر سے ملنے تین دنوں کیلئے سائیگان گیا۔ کیسا شہر ہے! عورتیں حسین ہیں اور سپاہی داد عیش دیتے تھے۔ میں چند شبینہ کلبوں میں گیا اور ویت نامی کھانے کھائے۔ جنگ اتنی دیر سے جاری ہے لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ افسر اور سپاہی اس طرز زندگی کو چھوڑنے پر ہرگز تیار نہیں ہیں جو انھوں نے اس شہر میں اختیار کر رکھی ہے۔ سائیگان میں نوجوان موٹروں، سائیکلوں پر دوڑتے پھرتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ وہ ہمارے ساتھ مل کر جنگ کیوں نہیں کرتے۔

۱۸ مئی: اب میری ساری کمپنی کی کمانڈ میرے ہاتھ میں ہے۔ بہت سے جوان اس سے ناخوش ہیں۔ ان کے خیال میں ایک حبشی کو یہ مرتبہ نہیں ملنا چاہئے۔ لیکن میں سخت جانفشانی سے کام کر رہا ہوں۔ اس لئے میں انھیں ڈانٹ کر رکھتا ہوں۔

۸ جون: کالج نے میرا داخلہ منظور کر لیا ہے۔ مجھے کالج سے خط موصول ہو گیا ہے۔ اس کی بدولت میں اسی دن بیشتر ہی سبکدوش ہو جاؤں گا۔ میں اس غلاظت میں رہنے اور اپنے افسروں کی دھمکیاں اور گالیاں سنتے سنتے تنگ آ گیا ہوں۔ پال سن حبشی سپاہیوں کی بے عزتی کرتا ہے اور کہتا ہے: "ایک دن کتیا کے بچے ایک حبشی پر مجھے ایک ویت کانگ کا شبہ ہو گیا تھا۔

جونز ایک حبشی نوجوان ہے اور ابھی ابھی ہم میں شامل ہوا ہے۔ اس نے اگلے دن ایک شہری کو اس کے تین بچوں کے سامنے بلاک کر دیا۔ ہم نے اس شہری کو حراست میں لے کر رکھا تھا۔ کیوں کہ اس کے پاس شناختی کارڈ نہ تھا۔ اس آدمی نے کئی بار کوٹھڑی سے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن ہر مرتبہ جونز نے اسے اندر چلے جانے کا حکم دیا۔ میں ذرا سستانے کے لئے باہر نکلا۔ یکایک میں نے ایک فائر کی آواز سنی۔ میں تیزی سے پلٹا۔ میں نے دیکھا کہ جونز اس شہری کے اوپر جھکا ہے جو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جونز نے بتایا کہ وہ دروازے کی طرف بھاگ رہا تھا، میں نے اس پر بندوق چلا دی۔ تھوڑی دیر بعد مقامی پولیس آ گئی اور کہنے لگی کہ وہ شہری بے گناہ تھا اور ویت کانگ نہ تھا۔ اگر ہم اسے باندھ کر رکھتے تو وہ بھاگ نہ سکتا اور موت کے منہ میں نہ جاتا۔ ہم نے اسے اس لئے نہ باندھا کہ اس کے گھر والے اس کے ساتھ تھے۔ اور ہم نے یہ سوچا تھا کہ اسے ان کے سامنے باندھ کر رکھنا معیوب لگے گا۔ مجھے رہ رہ کر اس کے بچوں کا خیال ستاتا ہے وہ زندگی بھر ہم سے نفرت کریں گے۔ اور ان کو کون قصور والا ٹھہرائے گا؟

۲۸ جون: کل ہماری گاڑی ۵۰۰ پونڈ وزنی بارودی سرنگ سے ٹکرا گئی تھی۔ وہ ایک کھلونے کی طرح ہوا میں اچھلی۔ جب ہم اس کے پاس پہنچے دو سپاہی اس کے نیچے کچلے پڑے تھے ہمیں ان کی لاشوں کے ٹکڑے جمع کرنے پڑے۔

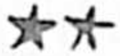
۳۰ جون: دونوں سپاہیوں کا خیال میرے دل سے نکلنے کا نام نہیں لیتا۔

یکم اگست: ہم ہیڈ کوارٹر سے نکل رہے تھے۔ یکایک مجھے معلوم ہوا کہ آج میں آخری مرتبہ لڑنے جا رہا ہوں۔ میں اپنے مردہ ساتھیوں کے متعلق سوچنے لگا۔ ٹامس ہمیں دلدل میں سے ایک نزدیکی راستے سے لئے جا رہا تھا۔ دلدل گہری تھی۔ ہم فائر کرتے بڑھ رہے تھے۔ یکایک میں دلدل میں پھنس گیا۔ میں جس قدر باہر نکلنے کی کوشش کرتا اتنا ہی نیچے چلا جاتا۔ میرے

بھی پیچھے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ انھیں اپنی مدد کے لئے پکارنا بے سود تھا۔ اس شور و غوغا میں میری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں تھک کر چور ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میں اب مرنے والا ہوں یکایک مجھے کسی کے دلدل میں چلنے کی آواز آئی۔ یہ ملعون سارجنٹ پال سن تھا۔ اس نے اپنی رائفل میری طرف بڑھائی اور مجھے کھینچ کر اس دوزخ کے عذاب سے بچا لیا۔ اس وقت وہ مجھے فرشتۂ رحمت معلوم ہو رہا تھا۔

۹ ستمبر: آخر میں وطن کو لوٹنے لگا ہوں۔ میں بالکل محسوس نہیں کر رہا کہ میں کسی خاص مقصد کے لئے جنگ کرتا رہا ہوں۔ میں نے جنگ اس لئے کی ہے کہ میں زندہ رہ سکوں۔ اور میں نے دشمنوں کو اس لئے مارا ہے کہ میں خود مرنے سے محفوظ رہوں۔ اب جبکہ مقصد پورا ہو چکا ہے۔ میرے جسم میں عجیب سی کپکپی دوڑ رہی ہے۔ جب کوئی شخص جنگ کرنے میں مشغول ہو تو وہ طاقت ور بن جاتا ہے۔ اور ناممکن باتوں کو ممکن بنا دیتا ہے اور بعد میں سوچتا ہے کہ میں نے یہ سب کچھ کیونکر کیا۔ میرے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ میں زندہ کس طرح ہوں۔

۱۱ ستمبر: میں طیارے میں سوار ہو کر امریکہ واپس جا رہا ہوں۔ ایک سفید چمڑی والا شخص، جس سے میں نے ٹکٹ خریدا، میری طرف نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے ٹکٹ یوں پکڑایا گویا میں اس کی نگاہوں میں ذلیل ترین انسان ہوں۔ اس کو دیکھ کر مجھے اپنے سفید فام افسروں کا رویّہ یاد آ رہا ہے۔ ٹھیک ہے، میں وحشی ہوں اور آج کل رنگ کی بڑی اہمیت ہے۔ میں طیارے میں سوار ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں اپنے کل مسائل پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ پیدا ہونے والے نئے مسائل کے متعلق پھر سوچا جائے گا۔ میں وطن پہنچ رہا ہوں۔ خوب عیش کروں گا، زندگی سے لطف اندوز ہوں گا۔ آرام کی نیند سویا کروں گا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اب کوئی ویت کانگ اچانک چھاپہ مار کر مجھے صبح سویرے بے آرام نہ کرے گا۔



"ممی! میں اندازہ کرنا چاہتا ہوں، ہمارا بھائی ہیری بڑا ہو کر کیا بنے گا، ذرا آپ بھی دیکھیں" ایک انگریز نوجوان نے اپنے چھوٹے بھائی کے بارے میں کہا۔

اُس نے میز پر پانچ پونڈ کے نوٹ رکھے جو سرمایہ پرستی کے غماز تھے، قریب ہی بائیبل رکھ دی، یہ مذہبی ذہن کی عکاسی کرتی تھی، اور بائیبل کے ساتھ پڑی ہوئی شراب کی بوتل اوباش اور آوارہ ذہنیت کی ترجمانی کر رہی تھی۔

اس کے بعد ماں بیٹا ایک ایسی جگہ چھپ گئے جہاں سے ساری چیزیں صاف دکھائی دیتی تھیں۔

ہیری سیٹی بجاتا ہوا خوشی خوشی کمرے میں داخل ہوا، اور میز پر پڑی ہوئی اشیاء کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹھکا، ادھر ادھر نظر دوڑائی اور جب مطمئن ہو گیا کہ کوئی اُسے دیکھ نہیں رہا، تو نوٹ اٹھا کر غور سے دیکھے اور دوبارہ میز پر رکھ دیے، پھر بائیبل کے چند اوراق پلٹے اور آخر میں بوتل کا ڈھکنا اُتار کر اُسے سونگھا۔ اس کی نگاہوں نے کمرے کا دوبارہ جائزہ لیا، پھر اس میں ایک خاص طرح کی تیزی آ گئی۔ اس نے نوٹ جیب میں ڈالے بائیبل بغل میں دبائی اور بوتل اٹھا کر سیٹی بجاتا ہوا باہر نکل گیا۔

فیکٹری کا مالک پہلے تو دیر تک ہنستا رہا —— پھر اپنے نائب سے کہنے لگا: "تم لوگوں نے اتنے جوہرِ قابل کو نظر انداز کیا ہے۔ اسے فوراً ترقی ملنی چاہئے کیونکہ یہ مستقبل میں بڑا اچھا سیاست دان بنے گا۔



قسمت کا لکھا

کتاب: THE WALL
مصنّف: جینیفر آندرے
تلخیص: گریش چند



وہ جنگی قیدی تھے اور تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کو بچ نکلنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی لیکن پھر ایک دن ....

جیفر آندرے کی یہ کتاب حیرتناک اور ناقابلِ یقین سچّے واقعات سے بھرپور ہے۔ کتاب پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری نے کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی بلکہ کوئی فلم دیکھی تھی ——— اس کتاب کی یہی خصوصیت ہے اور اسی لئے اس کی تلخیص شائع کی جا رہی ہے۔

اس کتاب کا ایک اور کارنامہ بھی ہے، اس کا مطالعہ قاری کو بہادر بناتا ہے، اس کی بزدلی کا خاتمہ کرتا ہے اور اس کو ایک نیا انسان بنا دیتا ہے۔ یہ کتاب ایک یہ درس بھی دیتی ہے کہ وطن اور ملّت کے لئے مر مٹنے والے کبھی نہیں مرتے ہیں ——— وہ لافانی ہو جاتے ہیں۔

سلامت علی مہدی

یہ کہانی ایک جری اور نڈر فرانسیسی نوجوان آندرے دیوینی کی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں جرمن فوجوں نے فرانس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اُن دنوں آندرے دیوینی شہر نانتیس میں تھا اور جوانوں کے ایک ایسے خفیہ گروہ کا سرگرم لیڈر جس نے جرمن خفیہ پولیس "گسٹاپو" کو پریشان کرنے اور زک پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ آندرے نے اپنے ساتھیوں کو "گوریلا جنگ" کے لئے تیار کیا، انھیں دست بدست لڑائی کے داؤ پیچ سکھائے اور اس حد تک تیار کر دیا کہ وہ جرمنوں کے لئے ایک مستقل عذاب بن گئے، لیکن گسٹاپو نے بھی آندرے اور اس کے گروہ کو ختم کرنے کے لئے ایسی چالیں چلیں کہ ایک ایک کر کے تمام فرانسیسی جوان نازیوں کے ہتّھے چڑھ کر موت کے گھاٹ اُترتے رہے۔ ۷ اپریل ۱۹۴۳ء کو آندرے پکڑا گیا، لیکن انتہائی جدوجہد کے بعد اور اُس وقت جب کہ اُس نے گسٹاپو کے تین آدمیوں کے جسم اپنی رائفل کی گولیوں سے چھلنی کر دئے۔ پکڑے جانے کے بعد گسٹاپو نے آندرے سے جو وحشیانہ سلوک کیا، اُس کی داستان بے حد لرزہ خیز ہے۔

ہلاک کرنے کے سوا کوئی عذاب ایسا نہ تھا جو بدنصیب آندرے پر نازل نہ کیا گیا ہو۔ دراصل گسٹاپو کو یہ شبہ تھا کہ ابھی آندرے کے کچھ اور ساتھی موجود ہیں جن کا پتہ آندرے ہی سے لگ سکتا ہے اس لئے وہ اُسے زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ کئی کئی دن اُسے بھوکا رکھا گیا، پھر مرغن غذائیں کھلا کر رات کو سونے نہیں دیا گیا، انتہائی طاقتور اور تیز روشنی کے بلب اُس کی کوٹھڑی میں لگائے گئے جو چوبیس گھنٹے مسلسل باری باری جلتے بجھتے رہتے، اُس کے بدن میں سوئیاں چبھوئی گئیں اور اُسے باندھ کر زہریلی چیونٹیاں آندرے کے برہنہ جسم پر چھوڑی جاتی رہیں، لاتوں، گھونسوں اور ہنٹروں سے اُس کی کھال اُدھیڑ دی گئی ——— لیکن وہ بھی ایسا سخت جان تھا کہ یہ تمام مصائب جھیل گیا اور کچھ بتا کر نہ دیا۔ آخر گسٹاپو کے سربراہِ اعلیٰ کے حکم سے آندرے پر "مقدمہ" چلایا گیا اور فوجی عدالت نے اُسے موت کی سزا دی۔ موت کی سزا کا حکم سنانے کے بعد آندرے کو جسمانی اور روحانی سزائیں دینی بند کر دیں اور پھر اُسے لاانسز کے فوجی قیدخانے کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا تاکہ اپنی موت کا انتظار کرتا رہے۔ اُسے یہ نہیں

بتایا گیا تھا کہ کب موت کا مزا چکھایا جائے گا۔

لائنز کے قید خانے کی یہ عمارت خاصی پرانی تھی، اور اس کا بڑا حصہ شاہ بلوط کی پرانی، لیکن بے حد مضبوط لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ کمروں میں فرش بھی لکڑی کا اور دروازے بھی لکڑی ہی کے تھے۔ آندرے کی طرح یہاں اور بھی بہت سے قیدی لا کر رکھے گئے جو اپنی اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی کوٹھڑیاں برابر برابر تھیں وہ آسانی سے ایک دوسرے سے بات چیت بھی کر سکتے تھے، مگر ایسا کرنے کی سختی سے ممانعت تھی۔ اگر کوئی قیدی دوسرے سے بات کرتے ہوئے دیکھ لیا جاتا، تو اس کی پشت برہنہ کر کے کوڑے برسائے جاتے۔ دن گزرتے رہے اور قیدی مسلسل آتے رہے۔ حتیٰ کہ اکثر کوٹھڑیوں میں ایک ایک کے بجائے دو دو اور تین تین قیدی جمع کیے جانے لگے۔ ایک معینہ وقت پر مسلح محافظوں کے کڑے پہرے میں انھیں پیشاب پاخانے کے لیے لے جایا جاتا؛ ورنہ چوبیس گھنٹے بند رہتے۔ کبھی کبھار ایک بڑی سی جیپ آتی اور چند قیدیوں کو اپنے ساتھ لے جاتی۔ ان کے بارے میں صرف یہی معلوم ہوتا کہ آج ان بدنصیبوں کو شوٹ کر دیا جائے گا۔ آندرے سوچتا کہ جلد ہی اس کی باری بھی آ جائے گی؛ تاہم وہ مایوس نہیں تھا اور ہر دم یہاں سے فرار ہونے کی تدبیریں سوچتا رہتا۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ وہ اب بھی اپنی کوٹھڑی میں تنہا تھا۔ کاش! کوئی اور شخص اس کا ساتھ دینے کے لیے یہاں بھیجا جاتا۔ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ اپنی اس فضول سی خواہش پر وہ خود ہی ہنس پڑتا۔ ایک روز عجیب معاملہ پیش آیا۔ معمول کے مطابق وہ سب ایک قطار کی صورت میں بیت الخلا کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔ سبھی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی تھیں۔ یہ ہتھکڑیاں کبھی نہ کھولی جاتیں، حتیٰ کہ کھانے پینے کے وقت بھی نہیں۔ گستاپو کے آدمی ان خطرناک قیدیوں کو بھاگ نکلنے کا

> صرف لوہے کی ایک باریک پن تھی، اور آندرے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں — لیکن یہی 'پن' اس کا سب سے بڑا ہتھیار بن گئی، اس نے اس پن سے اپنے ہاتھوں میں لگی ہتھکڑی کھول بھی لی اور پھر بند بھی کر دی ——۔

کوئی موقع دینے کو تیار نہ تھے۔ قطار میں چلتے ہوئے آندرے کے آگے جانے والا ایک لمبا فرانسیسی شخص دفعتہ لڑکھڑایا، اور یوں گرا جیسے اس کا پیر پھسل گیا ہو۔ آندرے اسے سنبھالنے کے لیے جھکا۔ ایک ثانیے کے اندر اندر گرنے والے نے کوئی باریک اور مضبوط سی شے آندرے کی مٹھی میں تھما دی۔ اسی لمحے جرمن محافظ نے ایک غلیظ گالی دونوں کو دی اور رائفل کا کندا مار کر آگے بڑھا دیا۔

آندرے نے بیت الخلا میں جا کر مٹھی کھولی۔ یہ لوہے کی بنی ہوئی ایک پتلی سی مڑی تڑی پن تھی۔ کوٹھڑی میں واپس آنے کے بعد آندرے نے اس پن کے ذریعے ہاتھوں میں پڑی ہوئی ہتھکڑی کا قفل کھولنے کی کوشش شروع کر دی اور چند لمحے بعد ہتھکڑی کھل گئی۔ ایک ثانیے کے لیے فرطِ مسرت سے آندرے کا دل دھڑک اٹھا، مگر فوراً ہی اس نے قفل کا کھٹکا دبایا اور ہتھکڑی دوبارہ لگ گئی۔ اس نے کئی بار ہتھکڑی کھولی اور بند کی۔ اب وہ پوری طرح مطمئن تھا کہ جب چاہے اپنے ہاتھوں کو ہتھکڑی سے آزاد کرا سکتا ہے۔

اس غیر متوقع امداد نے آندرے کے مرجھائے ہوئے حوصلے تازہ کر دیے۔ اس کے اندر جینے کی آس ابھرنے لگی اور زندگی کا ولولہ شدت سے بیدار ہو گیا۔ اب اس نے کوٹھڑی کا بھرپور جائزہ لیا۔ دروازہ بے حد مضبوط تھا اور اس کے باہر

دوسری جنگِ عظیم کے دوران نازیوں نے جو مظالم جنگی قیدیوں پر ڈھائے وہ رہتی دُنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔ نازیوں نے بعض ایسے قید خانے بنائے تھے کہ ان میں دن کی روشنی بھی نہیں پہنچنے پاتی تھی —— اس داستان کا ہیرو ایک ایسے ہی قید خانے میں بند تھا۔

لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ادھر سے بھاگ نکلنا ممکن نہ تھا۔ پھر اس نے لکڑی کے فرش کا جائزہ لیا اور تختے اکھاڑنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ اس کی کوٹھڑی عمارت کی دوسری منزل پر تھی۔ آندرے کو خیال آیا کہ اگر فرش اُکھاڑ بھی گیا تو نچلی منزل کی کوٹھڑی میں رہنے والے قیدی اُسے کوئی مدد نہیں دے سکیں گے۔ اس کی نگاہ روشندان کی طرف گئی۔ اس نے سوچا فرار ہونے کے لئے اس سے بہتر راستہ کوئی اور نہیں، روشندان سے نکل کر وہ عمارت کی چھت پر آسانی سے پہنچ سکتا ہے اور پھر اس کے ساتھ ملی ہوئی دوسری عمارت پر کود جائے گا، مگر سوال یہ تھا کہ آٹھ نو فٹ اونچے روشندان تک پہنچے کیونکر؟ اسی سوچ بچار میں گم تھا کہ دفعتہً اس کے ذہن میں ایک انوکھی تدبیر سرسرانے لگی۔ اس نے پٹ سن کے بنے ہوئے گدے کو جس پر وہ سویا کرتا تھا، اُلٹ دیا اور اس کے نیچے لگا ہوا موٹا کپڑا اُتار کر الگ کر دیا، پھر ساری رات وہ اس کپڑے کو اُدھیڑ اُدھیڑ کر پٹیاں بناتا اور اس کی رسّی بٹتا رہا۔ اس طرح اس نے بیس پچیس فٹ لمبی رسّی تیار کر لی، لیکن اب اُسے اپنی کمند مکمل کرنے کے لئے ایک اور چیز کی ضرورت تھی اور وہ تھا لوہے کا کوئی آنکڑا جسے رسّی کے ایک سرے پر باندھ کر روشندان میں اٹکایا جا سکے۔ تھک ہار کر وہ اپنے "بستر" پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔ دائیں ہاتھ پر روشندان سے کوئی تین فٹ نیچے بجلی کا بلب لگا ہوا تھا جو ساری رات جلتا تھا۔ آندرے اس روشنی کا ایسا عادی ہو چکا تھا کہ یہ جلتا ہوا بلب اُسے قطعاً ناگوار نہ گزرتا۔ یکایک اس کی نگاہ بلب پر پڑی اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ قدرت بلاشبہ اس کی مدد کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ بلب کی حفاظت کے لئے جرمن محافظوں نے اس کے گرد لوہے کی پتلی تاروں سے بنا ہوا ایک چوکھٹا لگا رکھا تھا اور اس کی ضرورت یوں پیش آئی تھی کہ اکثر قیدی بلب توڑ دیا کرتے تھے۔ دوسرے ہی لمحے آندرے نے بلب کے اُوپر سے یہ چوکھٹا اُتار لیا۔ اب اس کا مطلوبہ آنکڑا بالکل تیار تھا۔ رسّی کے ایک سرے پر یہ آنکڑا فٹ کر کے اس نے یہ سامان اپنے سرہانے چھپا لیا اور اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں، مگر ابھی وہ بمشکل پندرہ بیس منٹ ہی سویا تھا کہ اس کی کوٹھڑی کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور جرمن محافظوں نے ایک نئے قیدی کو اس کوٹھڑی میں دھکیل دیا۔

"میرا نام جیمز ہے" —— نووارد قیدی نے، جو سترہ اٹھارہ برس کا ایک خوبصورت اور قوی نوجوان تھا، بھرائی ہوئی آواز میں آندرے سے کہا۔ "انھوں نے مجھے بھی موت کی سزا دی ہے —— کیونکہ میں نے گسٹاپو کے چار آدمیوں کو موت کی نیند سلا دیا ہے۔" —— وہ مسکرایا "کوئی پرواہ نہیں —— میں خوش ہوں کہ زندگی کے ان آخری لمحوں میں آپ سے ملاقات ہوئی —— آپ کا نام آندرے دلوینی ہے نا؟"

"ہاں، میں ہی آندرے ہوں —— مگر" اس سے پیشتر کہ وہ کچھ اور کہے، دروازہ پھر کھلا اور اس مرتبہ جرمن محافظوں نے پٹ سن کا بنا ہوا ایک اور گدا کوٹھڑی میں پھینک دیا اور بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ یقیناً وہ ان

قیدیوں کو اپنی شرمناک گالیوں سے نواز رہے تھے۔" میرا خیال ہے تم سو جاؤ۔ اب صبح ہونے والی ہے ــــ میں بھی رات بھر کا جاگا ہوا ہوں ــــ کل بات کریں گے۔"

نوجوان جیمز واقعی تھکا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر جابجا گہرے زخم تھے اور چہرہ بھی سوجا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گسٹاپو کے آدمیوں نے اس کی خوب ٹھکائی کی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ خراٹے لے رہا تھا۔ آندرے چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ دل ہی دل میں بے حد پریشان تھا۔ اس نوجوان کے اچانک آجانے سے بھاگ نکلنے کا سارا پروگرام درہم برہم ہوتا نظر آرہا تھا۔ اس نے سوچا اگر میں اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تو یہ شانِ مردانگی کے خلاف ہوگا اور ویسے بھی وہ اس کو ایک لحظہ ضائع کئے بغیر شوٹ کر دیں گے، اس جرم میں کہ اس نے بھاگنے کی اطلاع محافظوں کو کیوں نہ دی ــــ آندرے نے اس نئی صورتِ حال سے نپٹنے کے لئے جو منصوبہ بنایا اس کی رُوداد اسی کی زبانی سُنئے۔

نوجوان جیمز کے آنے سے میرے ہاتھ پیر پھُول گئے تھے۔ دیر تک سوچتا رہا کہ اسے بھی فرار ہونے کی سازش میں شریک کرنا مفید رہے گا یا نہیں۔ چال ڈھال اور گفتگو سے تو یہی معلوم ہوا کہ وہ بے حد نڈر اور باحوصلہ جوان ہے ــــ اور ہر قیمت پر ساتھ دے گا، تاہم ان جرمن جاسوسوں کا بھی کوئی اعتبار نہ تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ اپنے ہی کسی آدمی کو "قیدی" بنا کر کوٹھڑیوں میں دھکیل دیتے تھے تاکہ وہ قیدیوں کے اندر رہ کر جاسوسی کرے اور اس طرح تمام خبریں جرمنوں تک پہنچائے۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی شخص دوسرے پر آسانی سے اعتبار نہ کرتا۔ اگلے روز ناشتے کے بعد میں نے جیمز سے گفتگو چھیڑی اور طویل جرح کے بعد اتنا اطمینان کر لیا کہ یہ گسٹاپو کا آدمی نہیں اور واقعی مصیبت کا مارا فرانسیسی ہی ہے۔ جرمنوں نے اس کے پُورے خاندان کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ غالباً اس بحث اور لمبی جرح سے وہ بھانپ گیا کہ میں اس پر شک کر رہا ہوں؛ چنانچہ وہ ہنس کر بولا:

"موسیو آندرے، آپ کا مجھ پر شک کرنا بالکل بجا ہے۔ میں اپنے مرحوم ماں باپ اور بہن بھائیوں کی عزت اور حرمت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرا کوئی تعلق گسٹاپو سے نہیں ہے۔ ممکن ہے میں آپ سے پہلے ہی موت کی آغوش میں پہنچا دیا جاؤں۔ لیکن یہ بات میرے لئے باعثِ ذلت ہے کہ آپ جیسا عظیم محبِ وطن آدمی مجھ پر شک کرے ــــ"

"نہیں میرے دوست، ایسی بات نہ کہو۔" میں نے اس کے ان جملوں سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم پر پُورا پُورا اعتماد اور بھروسہ ہے؛ تاہم احتیاط کا تقاضہ تھا کہ میں تم سے ساری تفصیلات معلوم کر لوں۔"

اس کے بعد میں نے اُسے بھاگ نکلنے کا پروگرام سمجھایا۔ وہ حیرت اور مسرت کی ملی جُلی نظروں سے میری طرف تکنے لگا آخر بولا:

"خدا رحم کرے ــــ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان موذیوں کے چُنگل سے ہم کیوں کر بچ سکیں گے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ چھت پر پہنچنے کے بعد ہم ان کی عقابی نگاہوں سے محفوظ رہ کر کسی دوسری عمارت میں داخل ہو جائیں گے۔ جب میں یہاں لایا گیا تو میں نے دیکھا کہ چپّے چپّے پر پہرے دار اور دوسرے مسلح سپاہی موجود ہیں اور ان کو حکم دیا گیا ہے کہ جو نہی کسی جانب سے مشتبہ حرکات دیکھیں، بلا تامّل گولی مار دیں۔"

"گولی تو بہر حال ہمارے لئے ہر طرف سے ہے، لیکن گیدڑوں کی طرح مرنے سے کہیں بہتر ہے کہ کچھ ہاتھ پیر ہلائیں؛ جان بچانے کی کوشش تو کرنی چاہیئے، اس کے بعد نتیجہ خدا کے

ہاتھ میں ہے۔ یہ حسرت تو نہ رہے گی کہ سعی و جہد کرتے، تو یوں کتے کی موت نہ مارے جاتے۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوں موسیو۔" نوجوان نے جوش سے کہا۔ "ویسے بھی آپ کے جانے کے بعد یہ بدمعاش مجھے زیادہ عرصے زندہ نہ رکھیں گے۔ اب یہ طے کرنا ہے کہ بھاگنے کا وقت کونسا مقرر کیا جائے۔ چونکہ آپ یہاں پہلے سے ہیں اور پہرے داروں کی نقل و حرکت اور ڈیوٹیاں بدلنے کے اوقات سے واقف ہیں، اس لئے یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔ میں بہرحال آپ کے حکم کی تعمیل میں فخر محسوس کروں گا۔"

میں نے اپنا گدا اٹھا کر اُسے وہ کمند دکھائی اور روشندان کے راستے باہر نکل کر چھت پر پہنچنے کے منصوبے سے آگاہ کیا۔

"آہ آپ نے کپڑا پھاڑ کر اس کی پٹیوں سے یہ رسی بٹی ہے، اور یہ کیا چیز ہے؟" اس نے ایک پہرے پر بندھے ہوئے آنکڑے کو ٹٹولا۔ میں نے بتایا یہ وہ چیز ہے جو بجلی کے اس قمقمے کی حفاظت کے لئے ان بدمعاشوں نے لگا رکھی تھی، مگر اب یہ ہمارے کام آئے گی۔" آپ کے ذہنِ رسا کی داد دیتا ہوں موسیو آندرے، لیکن یہ تنگ روشندان شاید ہمیں گزرنے کی اجازت نہ دے۔"

"میں نے وہاں تک جانے کے لئے یہ کمند بنائی تھی، مگر اب اس کی اتنی ضرورت نہیں رہی۔ تم دیکھتے ہو کہ روشندان زیادہ سے زیادہ نو دس فٹ اونچا ہے۔ ذرا اس دیوار کے نیچے کھڑے ہو جاؤ، میں تمہارے کندھوں پر چڑھتا ہوں، ابھی معلوم ہو جائے گا کہ پرلی طرف کیا ہے۔"

وہ فوراً دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور میں نے اُس کے کندھوں پر چڑھ کر روشندان کا جائزہ لیا۔ باہر ہولناک تاریکی تھی۔ پورے شہر پر جیسے سکوتِ مرگ طاری تھا۔ کہیں سے روشنی کی کوئی کرن پھوٹتی نظر نہ آتی تھی۔ آسمان پر آوارہ بادلوں کے ٹکڑے جمع ہو رہے تھے اور ان میں سے اِکّا دُکّا تارا جھانک رہا تھا۔ میں نے جونہی روشندان سے اپنا چہرہ باہر نکالا، سرد ہوا کا ایک زبردست تھپیڑا منہ پر لگا اور سارے بدن میں تھرتھری سی چھوٹ گئی۔ بہت دور کسی کتے کے بھونکنے کی مدھم آواز کانوں میں آ رہی تھی۔ روشندان تک پہنچنے میں جس مشقت کا مجھے سامنا کرنا پڑا، اس نے مجھے نڈھال کر دیا۔ میں نے ٹٹول ٹٹول کر اندازہ کیا کہ چھت کی لگر کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہے اور اگر میں روشندان سے اپنا پورا جسم باہر نکال کر لگر کو تھامنے کی کوشش کروں تو کامیاب ہو سکتا ہوں، لیکن روشندان سے نکلنا ہی تو کارے دارد تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی بمشکل ڈیڑھ فٹ تھی اور وہ تو خیریت ہوئی کہ اس کا ڈھکنا غائب تھا، ورنہ اس میں سے نکلنا ممکن نہ ہوتا یا ڈھکنا توڑنا پڑتا۔ ایک ایک انچ کر کے نہایت استقلال اور ہمت سے میں نے اپنے جسم کو اوپر اُٹھانا شروع کیا اور چند منٹ کی انتہائی اذیت و تکلیف کے بعد تقریباً آدھا دھڑ روشندان سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا، مگر اس کوشش میں میری انگلیاں، کہنیاں، بازو اور منہ جگہ جگہ سے چھل گیا تھا اور میں بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

دفعتاً ایک سرچ لائٹ آسمان پر گھومتی ہوئی گزر گئی اور میں اسی طرح آدھا دھڑ کمرے میں اور آدھا روشندان سے باہر لٹکے کا لٹکا رہ گیا۔ پھر تو روشنیوں کا تانتا بندھ گیا اور اس کے ساتھ ہی جرمن پہرے داروں کے ایک دوسرے کو آوازیں دینے اور اِدھر سے اُدھر چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"خدا کے لئے موسیو آندرے واپس آجاؤ —— اس وقت چھت پر جانا خطرناک ہے۔" جینیز ہلکی آواز میں بولا۔ اس کے لہجے سے بے پناہ اضطراب کا اظہار ہوتا تھا۔

"چپ رہو —— بالکل خاموش۔" میں نے منہ پھیر کر اس سے کہا۔ "غالباً ڈیوٹیاں تبدیل ہو رہی ہیں۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس عظیم الشان عمارت کی چھت پر بھی ایک دو پہرے دار موجود ہیں۔ چونکہ میں نے دھب دھب کی آواز قریب سے سنی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ چھت ابھی تک کچی ہے اور یہ آواز کسی سپاہی کے فوجی جوتوں کی ہے۔

روشندان میں ذبح کئے ہوئے بکرے کی طرح لٹکے لٹکے پندرہ منٹ گذر گئے، لیکن سرچ لائٹیں مسلسل گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں اور پھر یک لخت تاریکی چھا گئی۔

"میں اُوپر جاتا ہوں" ـــــــ میں نے اپنے ساتھی کو مدھم آواز میں بتایا۔ "تم بھی اس کمند کے ذریعے روشندان سے نکل آؤ۔ اگر چھت پر ایک آدھ موذی موجود ہوا تو ہم اس سے نپٹ لیں گے۔"

یہ کہہ کر میں نے پھر اپنے جسم کو آگے سرکانا شروع کیا اور مزید پانچ منٹ صرف کئے۔ اب میں بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ روشندان میں اپنے پیر ٹکا کر میں تقریباً دوہرا ہو گیا اور پھر میری انگلیاں چھت کی پتلی سی گلر کو چھونے لگیں۔ دوسرے ہی لمحے میں چھت پر چڑھ چکا تھا، لیکن توقع کے برعکس وہاں کوئی موجود نہ تھا؛ البتہ کچھ فاصلے پر دو زرد چمکیلی آنکھیں ضرور دکھائی دیں جو فوراً ہی غائب ہو گئیں۔ کوئی بدنصیب بلی چھت پر گھوم رہی تھی۔

چھت پر پہنچ کر میں اوندھے منہ لیٹ گیا اور خود ساختہ رسی کو ایک جھٹکا دیا، تاکہ جمینز بھی آنے کی تیاری کرے۔ اب ایک ایک لمحہ مجھ پر قیامت بن کر گذر رہا تھا۔ میں نے گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر جائزہ لیا، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرف سے راہِ فرار اختیار کی جا سکتی ہے۔ جس قریبی عمارت کا میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کی چھت جیل خانے کی عمارت سے ملی ہوئی ہے، وہ خاصے فاصلے پر تھی، لیکن اس کی نچلی منزل کے ایک کمرے سے روشنی کی ہلکی ہلکی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ اتنے میں نیچے کوٹھڑی سے کچھ کھڑ بڑ کی آواز سنائی دی۔ جمینز رسی کی مدد سے اُوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن بدحواسی ملاحظہ ہو کہ جوتے اُتارنا بھول گیا اور یہ آواز اسی کے جوتوں کی تھی جو لکڑی کی دیوار پر رگڑ کھا رہے تھے۔

"احمق ـــــــ اپنے جوتے اُتار دو۔" میں نے بمشکل غصہ ضبط کر کے کہا۔ جواب میں اس کی طرف سے خاموشی رہی، پھر اس نے شاید رسی پر لٹکے لٹکے یکے بعد دیگرے اپنے جوتے اُتار کے اور فرش پر پھینک دئے، لیکن خیر گذری کہ جوتے گدّے پر گرے اور زیادہ شور نہ اُٹھا؛ تاہم اتنی آواز تو ضرور آئی جو میں نے چھت پر لیٹے لیٹے سُن لی۔

فطری طور پر میں بھی بڑا جلد باز اور بے صبرا ہوں، لیکن جب دوسرا شخص زیادہ عجلت کا مظاہرہ کرے، تو میں جھنجھلا جاتا ہوں؛ چنانچہ میں نے روشندان کی طرف منہ کر کے کہا، "تم اپنے ساتھ مجھے بھی کسی مصیبت میں پھنسواؤ گے۔ ابھی ہمارے پاس بڑا وقت پڑا ہے۔ جلدی کی ضرورت نہیں، اطمینان اور سکون سے کام کرو۔"

میں کہہ نہیں سکتا کہ اس وقت بدنصیب جمینز پر کیا بیت رہی تھی اور میرا اُس پر یوں ناراض ہونا کہاں تک صحیح تھا؛ تاہم اس کے بے پناہ صبر اور استقلال کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے پلٹ کر جواب نہ دیا۔ میری آنکھیں روشندان پر جمی ہوئی تھیں اور اب میں جمینز کے ہانپنے کی آواز بخوبی سُن سکتا تھا۔ پھر دو ہاتھ روشندان سے چپکے ہوئے دکھائی دئے۔ اس کے بعد جمینز کا سفید چہرہ رات کی تاریکی میں چمکا۔ وہ گردن باہر نکالے اُوپر تک رہا تھا۔

"موسیو، میں اس میں سے باہر نہیں نکل سکوں گا یہ چھوٹا ہے اور میرا جسم ـــــــ"

"اُف۔ خدایا!" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "کیا بکواس

ہے۔ دیکھو بھائی میں تمھیں پانچ منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ اس دوران میں اگر تم چھت پر نہ پہنچے تو میں چل دوں گا، پھر میں اس کا ذمہ دار نہ ہوں گا کہ تمھارا کیا حشر ہوتا ہے۔"

میرے یہ الفاظ سُن کر نوجوان کا چہرہ یک لخت یوں زرد پڑ گیا جیسے اس کا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اگرچہ اندھیرے میں اُس کے نقوش اور چہرے پر پھیلے ہوئے تاثرات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ ہوتا تھا؛ تاہم اتنا تو میں نے دیکھ لیا کہ میرے ان جملوں سے اُسے انتہائی اذیت پہنچی ہے۔ میں دل ہی دل میں نادم ہوا؛ تاہم یہ موقع مزید بحث مباحثے کا نہ تھا۔ اب میں نے جھک کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

"کوشش تو کرو میرے یار ــــ اتنا مایوس ہونے کی کیا ضرورت ــــ آخر تم مجھ سے زیادہ تگڑے تو نہیں ہو۔"

میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی، اور واقعی چند منٹ بعد وہ چھت پر آ چکا تھا، لیکن اُس کوشش میں اس کا جسم بھی بُری طرح چِھل گیا اور خصوصاً کہنیوں پر تو گہری خراشیں آئی تھیں۔ میں نے کہا: "تم یہاں دل جمعی کے ساتھ لیٹے رہو اور جی چاہے تو سو بھی جاؤ۔ میں ذرا حالات کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں، چھت کے مشرقی حصّے میں چند چمنیاں سی دکھائی دیں جن میں سے ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ رہا تھا۔

"دیکھو، تم ان چمنیوں کی آڑ میں چھپ جاؤ۔" میں نے جینز کو ہدایت کی۔ "میں ایک گھنٹے تک واپس نہ آیا، تو پھر خُدا تمھارا حافظ و نگہبان ہو ــــ یہ خیال نہ کرنا کہ میں تمھیں تنہا چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا۔ اگر پکڑا گیا تو اور بات ہے۔"

نوجوان نے اثبات میں گردن ہلائی اور آہستہ آہستہ چمنیوں کی طرف رینگنے لگا۔

جیسا کہ ابتدا میں میرا خیال تھا اس عظیم الشان عمارت کی چھت کچّی ہے اور اس پر میں نے کچھ ایسی آواز بھی سُنی تھی جیسے کوئی شخص جوتے پہنے بھاگ رہا ہو، لیکن اب نظر آیا کہ یہ دونوں ہی باتیں غلط تھیں۔ چھت کچّی نہ تھی بلکہ لکڑی کے چوکور اور بڑے بڑے تختوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ میں زینے کی تلاش میں تھا اور چپکے چپکے اِدھر سے اُدھر رینگ رہا تھا۔ اِس دوران میں آسمان پر جمع ہونے والے بادلوں نے تاروں کی روشنی کا راستہ روک لیا اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان حالات میں یہ بارش ہمارے لئے فائدہ مند تھی، مگر اس تاریک اور سرد رات میں اگر ہم بھیگ کر اکڑ جاتے تو کچھ بعید نہ تھا۔ اب میں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

چھت کے بیچوں بیچ ایک ٹوٹے ہوئے تختے میں روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ دو جرمن سپاہی لالٹین کی مدھم روشنی میں بیٹھے بڑے بڑے مگ ہاتھ میں پکڑے قہوہ پی رہے تھے۔ اُن کے قریب ہی دو سب مشین گنیں پڑی تھیں؛ بارش اور تیز ہو گئی اور پانی کے ننھے ننھے قطرے میرے برہنہ جسم پر یوں پڑنے لگے جیسے سیسے کے بنے ہوئے چھرّے بدن میں پیوست ہوتے جا رہے ہوں۔ لکڑی کی چھت بُری طرح بج رہی تھی۔ یکایک ایک سپاہی نے سر اُوپر اٹھایا اور اپنے ساتھی سے جرمن زبان میں کچھ کہا۔ چونکہ میں کچھ کچھ جرمن زبان سمجھنے لگا تھا اس لئے یہ سمجھ میں آیا کہ وہ اپنے ساتھی کو بتا رہا ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔ جواب میں دوسرے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور قریب رکھی ہوئی کیتلی میں سے مزید قہوہ اپنے مگ میں اُنڈیلنے لگا۔

دفعتہً میں نے شمال کی جانب سے آتی ہوئی ٹرین کی آواز سنی ــــ اُف خدایا، تو گیا ریلوے لائن اس قید خانے کے نزدیک سے گزرتی ہے۔ چشم زدن میں ایک مسافر ٹرین جس کے انجن کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں، دندناتی ہوئی آئی اور حشر برپا کرتی ہوئی گزر گئی۔ پھر ڈیڑھ منٹ تک ٹرین کے پہیوں کی دھمر

دھڑ سے عمارت کانپتی رہی۔ اب میری حماقت دیکھئے کہ میں نے اس سنہری موقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا؛ تاہم دل کو اطمینان تھا کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے کئی ریلیں ادھر سے گذریں گی اور یقیناً ہمیں ان میں سے کسی ایک پر چڑھنے کا موقع مل جائے گا۔

اب ہلکی ہلکی بُوندا باندی موسلادھار بارش میں بدل چکی تھی اور بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ کئی مرتبہ تو یوں معلوم ہوا جیسے بجلی اسی چھت پر گر کر ہم دونوں کو کوئلہ کر دے گی۔ میں نے چھت کا ایک ایک چپہ دیکھا، مگر نیچے اُترنے کا کوئی راستہ نہ ملا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ میں نے دل میں سوچا۔ راستہ تو ضرور ہونا چاہئے پھر یاد آیا کہ اس قسم کی عمارتوں میں چھت پر جانے کے لئے زینہ نہیں بنایا جاتا، بلکہ چھت میں نیچے کی طرف ایک ڈھکنا بنا دیا جاتا ہے، جو نیچے ہی سے کھلتا اور بند ہوتا ہے۔

اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ خود ساختہ کمند کو کام میں لایا جائے۔ یہ عمارت دو منزلہ تھی اور اس کی اونچائی زیادہ سے زیادہ پچاس فٹ ہو گی، لیکن کمند بہرحال چھوٹی تھی۔ اس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ انیس فٹ نیچے تک اُترا جا سکتا تھا، بقیہ فاصلہ ظاہر ہے چھلانگ لگا کر ہی طے کرنا پڑتا اور اس کام میں ہڈی پسلی ٹوٹنے کا خدشہ بھی نظر آ رہا تھا۔

میں واپس رینگتا ہوا چمنیوں کی طرف گیا۔ کیا دیکھتا ہوں نوجوان جمیز طوفانِ باد و باراں اور انتہائی سرد موسم میں بھی دنیا و مافیہا سے بےخبر پڑا خراٹے لیتا ہے۔ سچ پوچھئے تو اس کی حالت پر مجھے بڑا رشک آیا۔ میں نے آہستہ سے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا، وہ چونک اٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔

"کہئے موسیو آندرے، کامیابی کی کوئی راہ ملی؟ آپ تو بُری طرح بھیگے ہوئے ہیں۔ میں نے تو اس چمنی کی آڑ میں کسی حد تک اپنا بچاؤ کر لیا۔"

"راستہ تو نظر نہیں آتا۔ غالباً اس چھت میں اندرونی طور پر کوئی دروازہ بنا ہوا ہے جو نیچے سے کھلتا ہو گا۔ بہرحال آؤ، ہم اس کمند کے ذریعے شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ اُتریں گے۔ کیا تم بائیس فٹ کی اونچائی سے زمین پر کود سکو گے؟"

"آپ کے ساتھ تو تحت الثریٰ میں بھی کودنے کے لئے تیار ہوں موسیو۔" جمیز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر ہم دونوں گھٹنوں کے بل چپکے چپکے شمالی دیوار کی طرف بڑھے۔ یک لخت نہ جانے کیا ہوا، شاید جمیز کا پیر پھسلا اور وہ دھڑام سے فرش پر گرا۔ اس کے گرنے سے چھت لرز گئی اور فوراً ہی میں نے نیچے سے ایک جرمن سپاہی کو بولتے سُنا۔ وہ کہہ رہا تھا:

"آج چھت پر بلیاں پھر رہی ہیں ـــــ ان کم بختوں نے تنگ کر دیا ہے۔"

ہم دونوں چوہوں کی طرح چمنیوں کی آڑ میں دُبکے ہوئے تھے، غالباً ایک یا دو منٹ گذرے، لیکن یوں محسوس ہوا جیسے صدیاں بیت گئی ہیں۔ معاً چھت درمیان سے شق ہوئی اور چار فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ایک ڈھکنا سا اوپر اٹھا۔ پھر ایک جرمن سپاہی نے چھت پر قدم رکھا۔ اس نے ٹارچ روشن کی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سب مشین گن اس کے کندھے پر لٹک رہی تھی۔ ہمارا اور اس کا فاصلہ بمشکل پانچ فٹ رہا ہو گا۔ میرا کلیجہ جیسے حلق میں آ گیا اور بدن گویا پتھر ـــــ تاہم میں نے اپنے عقب میں دبکے ہوئے جمیز کا ہاتھ دبایا۔

یکایک ٹارچ کی روشنی ہماری آنکھوں پر پڑی اور دوسرے ہی لمحے جرمن سپاہی ہمارے سر پر کھڑا تھا۔ ہمیں وہاں پا کر وہ حیرت سے دم بخود تھا۔ ایک ثانیہ یا اس سے بھی کم عرصے میں ہم فریقین بُت بنے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، پھر دفعتاً جمیز نے چیتے کی مانند جست کی اور جرمن سپاہی کا گلا پکڑ لیا۔ اتنے میں میں اپنے ساتھی کی مدد کو پہنچ چکا تھا۔

جیمز نے اس کا گلا اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک بدنصیب سپاہی کا دم نہ نکل گیا۔ خدا کی پناہ ــــ اس کی آنکھیں اور زبان باہر کو نکل آئی تھی اور چہرے پر کرب اور اذیت کے ایسے آثار نمایاں تھے کہ بیان سے باہر ــــ

"بدمعاش ــــ سور ــــ" جیمز نے ہانپتے ہوئے کہا اور انگلی سے پیشانی پر آیا ہوا پسینہ سونتنے لگا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ اس سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان کے فولادی بازوؤں اور آہنی انگلیوں میں کیسی قوت چھپی ہوئی ہے۔

ہم نے جلد جلد مرے ہوئے جرمن سپاہی کے کپڑوں کی تلاشی لی۔ چند کرنسی نوٹ، ایک سگریٹ لائٹر، سگریٹوں کا بھیگا اور تڑا مڑا پیکٹ، چار انچ لمبے پھل کا ایک چاقو برآمد ہوا۔ اس کے علاوہ شناختی کارڈ بھی ملا۔ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ہم نے یہ سارا کام کس اطمینان اور خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا، حالانکہ چھت کا دروازہ ابھی تک کھلا تھا اور کسی بھی لمحے کوئی اور جرمن سپاہی اوپر آسکتا تھا۔ مرنے والے کی ٹارچ قابو میں کر کے میں نے وہ کھٹکا تلاش کر لیا جس کے ذریعے باہر سے یہ دروازہ بند کیا اور کھولا جا سکتا تھا۔ یہ لوہے کی ایک موٹی سی میخ تھی جسے دبایا تو دروازہ آہستہ آہستہ بند ہو گیا۔

لاش کو وہیں چھوڑ کر ہم شمالی دیوار کے قریب پہنچے۔ عین اسی لمحے دور سے کسی اور ٹرین کے آنے کی آواز سنائی دی۔

"جلدی کرو دوست ــــ تم پہلے اتر جاؤ، دیکھتے ہو اس طرف خاصا گھنا باغ ہے۔ یہ بہترین جگہ ہے پناہ لینے کی۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ کوئی دم میں اس جرمن سپاہی کے ساتھی چھت پر آجائیں گے۔"

میں نے چھت کے ایک تختے میں بڑی مشکل سے آنکڑا پھنسایا اور پھر جیمز آہستہ آہستہ رسی کے سہارے اترنے لگا۔ چند لمحوں بعد جب کہ ٹرین عمارت کے قریب سے گزر رہی تھی، وہ غالباً رسی چھوڑ کر تاریکی میں کود گیا۔ کیوں کہ رسی یکایک ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

میں نے خدا کا نام لیا اور اترا، لیکن چند فٹ نیچے ہی اترا ہوں گا کہ رسی جیسے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور میں نیچے ہی نیچے گرتا چلا گیا۔ اتنا یاد ہے کہ پرشور آواز کے ساتھ کسی درخت یا جھاڑی پر گرا تھا۔ ہوش آیا تو جیمز مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو خودرو اونچی گھاس کے ایک وسیع قطعے میں پڑے پایا۔ بارش تھم چکی تھی اور صبح صادق کے آثار مشرق کی طرف سے نمودار ہو رہے تھے۔ عمارت کے اندر ہل چل ہو رہی تھی اور جرمن سپاہی ادھر ادھر چیختے چلاتے پھر رہے تھے۔

"انھیں پتہ چل گیا ہے موسیو" ــــ جیمز نے میرے کان میں کہا۔ "خدا کا شکر ہے آپ کو ہوش آگیا، ورنہ میں پیٹھ پر لاد کر لے جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔"

"رسی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔" میں نے بمشکل کہا:

کیسا عجیب اتفاق تھا اور خدا کی قدرت کہ اتنی بلندی سے گرنے کے باوجود میری ہڈی پسلی سلامت رہی۔ اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا تھا کہ ابھی مرنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ قدرت کا دستِ غیب خود ہر ہر لمحے میری حفاظت کا سامان کر رہا تھا۔ یاد آیا کہ میں کچھ عرصے قبل اس عمارت اور باغ میں ایک مرتبہ آیا تھا، لیکن ان دنوں اس کی صورت کچھ اور تھی؛ تاہم ذہن پر زور دیا تو یاد آگیا کہ یہ خاصا وسیع و عریض جنگل نما باغ ہے؛ چنانچہ میں نے جیمز سے کہا کہ جس قدر تیز بھاگ سکتے ہو، باغ کے مشرقی حصے کی طرف بھاگ نکلو۔ یہ ہدایت دے کر میں خود بھی اٹھا اور اس وقت محسوس ہوا

کہ بائیں ٹخنے میں درد کی ہلکی ہلکی ٹیس اُٹھ رہی ہے۔

بہت جلد ہم ایک محفوظ اور کسی قدر آرام دہ علاقے میں پہنچ گئے۔ آرام دہ میں نے اس لئے کہا کہ یہاں گھنے درختوں کے باعث زمین پر وہ پھسلن نہ تھی جو باغ میں ہو رہی تھی اور جس کے باعث ہم کئی مرتبہ منہ کے بل گرے اور اٹھے تھے۔

"مجھے یاد ہے کہ ریلوے سٹیشن یہاں سے قریب ہی ہے۔ وہاں پہنچنا چاہئے۔ سٹیشن ماسٹر میرے شناساؤں میں سے ہے۔ وہ ہمیں پناہ دے سکتا ہے۔" میں نے کہا

"لیکن موسیو، میں بہت تھک گیا ہوں۔ بالکل نہیں چلا جاتا" جیمز نے جواب دیا اور نڈھال ہو کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ واقعی اس بیچارے کی حالت خراب تھی۔ سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا اور سانس کی کیفیت یہ کہ پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ ظاہر ہے اس وقت میں کچھ زیادہ زور بھی نہ دے سکتا تھا؛ تاہم دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی لمحہ جاتا ہے گسٹاپو کے خونخوار کھوجی اپنے کتوں سمیت ہماری تلاش میں نکلیں گے اور پھر ہم دونوں کا کتے کی موت مارے جانا یقینی تھا۔

"خدا کے لئے ہمت کرو جیمز ——— یہ وقت ستانے کا نہیں" میں نے کہا

"صرف دو منٹ ——— دو منٹ ———" اس نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ دفعتہً پرلی جانب سے کسی شخص نے کرخت جرمن لہجے میں کہا:

"کون ہے؟ ادھر کون آیا ہے ——— بولو، جواب دو ———" پھر یوں سنائی دیا جیسے پکارنے والا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اسی طرف آرہا ہے۔ غالباً یہاں جرمن چوکی ہے۔ ہم دونوں ایک درخت کے تنے سے لگ گئے۔ چند لمحے بعد ٹارچ کی روشنی ارد گرد پھیلتی ہوئی نظر آئی۔ یہ واقعی ایک جرمن سپاہی تھا۔ رائفل اس کے شانے پر لٹک رہی تھی لیکن چال ڈھال سے تھکن کا اندازہ ہوتا تھا۔ ادھر اُدھر دیکھنے بھالنے کے بعد وہ بڑبڑایا اور جدھر سے آیا تھا، اسی طرف چلا گیا۔ ممکن ہے وہ اور قریب آجاتا، تو اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو پہلے ایک سپاہی کا ہو چکا تھا۔

"بچ کر نکل گیا بدمعاش" جیمز نے آہستہ سے کہا۔

"وہ تو نکل گیا، مگر سوال یہ ہے کہ اب ہم کیسے بچ کر نکلیں، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جرمنوں کی متعدد چوکیاں اس علاقے میں قائم ہیں۔ بہرحال قسمت آزمانے میں ہرج کیا ہے۔ اسی طرف کو چلتے ہیں۔ غالباً یہ سپاہی اکیلا ہے اور ویسے ہی اس کی حالت سے تھکن اور بیزاری کا احساس مجھے ہوا ہے۔ ہم اسے آسانی سے زیر کرلیں گے۔ ممکن ہے ہم دوسری جانب جائیں، تو زیادہ خطرہ ہو۔"

اب دن کا اُجالا اتنا نمودار ہو گیا تھا کہ ارد گرد کا منظر اور آس پاس کی اشیا بخوبی دکھائی دیتی تھیں۔ بائیں ہاتھ پر تقریباً ایک فرلانگ دور ایک مکان بنا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ یہی سٹیشن ہے۔

"ہمیں کسی نہ کسی طرح سٹیشن جانا ہے۔ اس کے بعد کوئی فکر نہیں ہوگا" میں نے کہا اور ہم دبے پاؤں اس طرف بڑھنے لگے۔

ایک ڈیڑھ فرلانگ کا یہ فاصلہ طے کرنا قیامت ہو گیا۔ ہماری حالت ان گیدڑوں کی سی تھی جن کے تعاقب میں نازی کتے لگے ہوئے ہوں اور بچاؤ کی کوئی صورت دکھائی نہ دیتی ہو۔ نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد یکایک ہمیں رُک جانا پڑا، چونکہ واقعی ہمارے عقب میں کوئی شخص چلا آرہا تھا۔ ہم پھرتی سے دائیں بائیں ہٹ گئے اور درختوں کے پیچھے پناہ لی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چھوٹی سی کچی پگڈنڈی پر ایک جرمن سپاہی سائیکل پر سوار مزے مزے میں ہماری جانب آرہا ہے۔ رائفل اس کے

کندھوں پر سجی تھی۔ یہ شخص غالباً اپنی ڈیوٹی پر جا رہا تھا تاکہ رات کو پہرہ دینے والا سپاہی آرام کر سکے۔

میں نے سیٹی بجا کر جیمنز کو خبردار کر دیا کہ جانے نہ پائے۔ اُدھر وہ بھی یہی سوچ رہا تھا۔ جونہی جرمن سپاہی ہمارے قریب سے گزرا، ہم دونوں بیک وقت اس کی طرف دوڑے۔ اور چشم زدن میں وہ بدنصیب ہمارے بازوؤں کی گرفت میں آ کر پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ ہوا کیا اور ہم لوگ آخر کون ہیں۔ باری باری ہم پر حیرت اور خوف کی نظریں ڈالتا ہوا جرمن زبان میں چلایا:

"کون ہو تم اور یہ حرکت کرنے کا مقصد کیا ہے۔ جانتے نہیں کہ اس مذاق کی سزا کیسی بھیانک مل سکتی ہے؟"

ہم سمجھ گئے کہ وہ ہماری شخصیتوں سے بے خبر ہے اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کا تعلق لائنز کے قید خانے سے نہیں؛ تاہم اسے چھوڑنا ممکن نہ تھا۔ جیمنز نے اس کی کنپٹی پر اس زور کا ہاتھ مارا کہ بدنصیب جرمن مزید کوئی آواز نکالے بغیر بے ہوش ہو گیا۔ ہم اسے اطمینان سے ڈنڈا ڈولی کر کے ایک طرف لے گئے۔ اب ایک اور انوکھی تدبیر میرے ذہن میں جنم لے چکی تھی۔

آدھ گھنٹے بعد اسی جرمن سپاہی کو ہم نے دوبارہ دیکھا جو بے چینی سے اس جنگل کی آخری سرحد پر ٹہل رہا تھا۔ بار بار وہ گھڑی کی طرف دیکھتا، لیکن جونہی اس نے ہم دونوں کو آتے دیکھا، رک گیا اور حیرت سے دیکھنے لگا۔

میں جرمن سپاہی کی وردی پہنے، ایک ہاتھ میں رائفل تھامے اور دوسرے ہاتھ میں سائیکل لیے چل رہا تھا اور میرے آگے آگے جیمنز یوں جا رہا تھا جیسے میں اسے گرفتار کر کے لایا ہوں۔

جرمن سپاہی نے ایک نظر جیمنز کو دیکھا، پھر میری طرف نگاہ کی اور جھلا کر بولا:

"یہ کون شخص ہے اور تم اتنی دیر کہاں رہے، ڈیوٹی پر آنے کا یہی وقت ہے؟"

میں نے حتی الامکان اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کی تھی، اس ڈر سے کہ کہیں وہ پہلے سے پہچانتا نہ ہو کہ فلاں شخص ڈیوٹی پر آئے گا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے اشارے سے بتایا کہ اس نوجوان کی تلاشی لو۔ اب وہ جیمنز کی طرف بڑھا۔ میں نے اپنی رائفل جیمنز پر تان لی۔ جرمن سپاہی نے جیمنز کے ہاتھ اوپر اٹھائے اور اس کی پتلون کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ ابھی اس کا ہاتھ جیمنز کی جیب سے باہر نہ نکلا تھا کہ جیمنز نے اس زور کی ٹکر سپاہی کی ناک پر ماری کہ وہ لڑکھڑا کر پرے گرا، مگر تھا آدمی جاندار، فوراً اٹھا اور جیمنز کی طرف اشارہ کر کے چلایا:

"شوٹ کر دو اسے"

لیکن میں نے اپنی رائفل کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ اتنے میں جیمنز کا گھونسا جرمن سپاہی کی ٹھوڑی پر پڑا اور پھر تو اس نے اس کی ایسی مرمت کی کہ خون میں نہلا دیا۔ اسے بے ہوش چھوڑ کر ہم جلدی سے سٹیشن کی طرف لپکے عین اسی وقت ایک مال گاڑی دندناتی ہوئی آئی اور سٹیشن پر رک گئی۔

جب ہم یارڈ میں پہنچے، تو یہ دیکھ کر سٹی گم ہو گئی کہ دس بارہ جرمن مسلح سپاہی بے تحاشا بھاگتے ہوئے ہماری طرف آ رہے ہیں اور اس سے پیشتر کہ ہم ان کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کرتے، انھوں نے اپنی رائفلوں اور سب مشین گنوں کا منھ کھول دیا۔ فائرنگ کے دھماکوں سے سٹیشن کی فضا گونج اٹھی اور بہت سے لوگ جو ادھر ادھر گھوم رہے تھے آناً فاناً دہشت زدہ ہو کر بھاگ اٹھے۔ رائفلیں ہمارے پاس بھی تھیں؛ چنانچہ ہم نے جرمنوں کو وہیں روک دیا۔ جرمنوں نے ہمیں

گھیرے میں لینے کی کوشش کی، لیکن جب اُن کے تین چار آدمی ہماری گولیوں کا نشانہ بن گئے، تو وہ ڈر گئے۔ اب میں نے جیمز سے کہا کہ وہ سٹیشن کے پچھلے حصے میں پہنچنے کی کوشش کرے۔

مجھے معلوم تھا کہ گاؤں کے آدمیوں میں ایک گارڈ کا مکان آخری سرے پر ہے اور وہیں پناہ مل سکتی ہے۔ آدھ گھنٹے تک جرمنوں کو میں نے روکے رکھا اور پھر میں بھی انھیں مغالطہ دے کر سٹیشن کی پچھلی طرف دوڑا۔ یہاں اور بھی بہت سے درمیانہ درجے کے چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے تھے۔ میں نے جرمنوں کے قدموں کی آوازیں سنیں اور پھر کئی گولیاں میرے دائیں بائیں سنسناتی ہوئی نکل گئیں۔

مکانوں کی کھڑکیوں میں سے فرانسیسی عورتیں جھانک رہی تھیں، لیکن کسی نے دروازہ نہ کھولا، کیونکہ وہ مجھے وردی کی وجہ سے جرمن سمجھ رہی تھیں۔ خدا جانے جیمز کہاں چھپا ہوا تھا۔ میں نے گارڈ کے مکان پر جا کر دستک دی، لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ مکان خالی پڑا تھا۔ پچھلے دروازے سے نکل کر میں ایک اور تنگ سی گلی میں داخل ہوا۔ اب جرمن بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ بائیں ہاتھ پر پہلے ہی مکان کا دروازہ کھلا ہوا دکھائی دیا۔ میں بے دھڑک اندر گھس گیا۔ وہاں ایک موٹی تازی فرانسیسی عورت کے سوا کوئی نہ تھا جو باورچی خانے میں برتن صاف کر رہی تھی۔ میرے پاؤں کی آہٹ پا کر وہ مڑی اور ایک دم اس کے ہاتھ سے چائے دانی گر کر ٹوٹ گئی۔ اس نے مجھے جرمن سپاہی سمجھا۔

"مجھے مت مارو ـــــ مجھے مت مارو ـــــ" وہ دہشت سے چیخنے لگی اور میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"چپ رہو ـــــ میں جرمن نہیں ہوں ـــــ فرانسیسی ہوں ـــــ وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔"

عورت ایک ثانیے تک پتھر کے بُت کی مانند میری جانب تکتی رہی، پھر کچھ کہے بغیر بھاگی اور مکان کا بیرونی دروازہ بند کر کے اندر سے قفل ڈال دیا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "جب تک وہ دروازہ توڑیں گے، میں تمھیں ایک محفوظ جگہ پہنچا دیتی ہوں۔"

"لیکن ـــــ" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"زیادہ بات مت کرو ـــــ انھوں نے میرے تین جوان بیٹوں کو مار ڈالا ہے، اب وہ مجھے بھی مار ڈالیں، تو کوئی پروا نہیں۔"

اس نے مجھے اپنے مکان کی ایک چھوٹی سی تاریک کوٹھڑی میں دھکیل دیا اور مجھ سے کہا کہ دروازہ اندر سے بند کر لو، پھر سرگوشی کے انداز میں بولی:

"تم اطمینان سے چھپے رہو، وہ تمھیں ڈھونڈ نہ سکیں گے۔"

بس یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے اس فرشتہ صفت عورت کے منہ سے سُنے۔ اس کے بعد وہ چلی گئی۔ اس کوٹھڑی میں برسوں پرانا کاٹھ کباڑ بھرا تھا۔ میں نے احتیاطاً اس کے عقب میں پناہ لی اور نتائج کا انتظار کرنے لگا۔ دفعتہً کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے بہت سے آدمی چیخ رہے ہوں۔ ان میں عورتوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ پھر فائروں کی تڑتڑ..... اس کے بعد دروازہ ٹوٹا اور یوں محسوس ہوا جیسے بہت سے آدمی اس مکان میں داخل ہو گئے ہیں۔ وہ ہر ایک شے تلپٹ کر رہے تھے۔ دیر تک توڑ پھوڑ کرنے کے بعد آخر وہ چلے گئے۔ اور ہر طرف ہیبت ناک سناٹا چھا گیا۔

میں تین روز تک بھوکا پیاسا اسی تاریک کوٹھڑی میں بند رہا۔ چوتھے روز رات کے وقت یہاں سے نکلا۔ جرمن سپاہی کی وردی اس وقت بھی میرے تن پر تھی اور رائفل ہاتھ میں،

اُسی گلی کے نکڑ پر ایک سپاہی کھڑا تھا، لیکن میں بے پروائی سے ٹہلتا ہوا اس کے قریب سے ہو کر گذر گیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر صرف سلیوٹ کرنا کافی سمجھا اور منہ پھیر کر سیٹی بجانے لگا۔

آندرے دیویٰ واقعی قسمت کا دھنی تھا کہ موت کے مُنہ سے بچ نکلا، لیکن اس کا ساتھی جیمز پکڑا گیا اور جرمنوں نے اسے اسی دن گولی مار دی۔ وہ فرانسیسی عورت بھی جس نے آندرے کو بچایا، گرفتار ہوئی اور گسٹاپو نے اُسے اتنی اذیتیں دیں کہ بے چاری قید خانے ہی میں ہلاک ہو گئی۔ ڈیڑھ ہفتے تک فرانس کے مختلف قصبوں اور دیہاتوں میں "زیرِ زمین" چھپے رہنے کے بعد آندرے دیویٰ سرحد پار کر کے سوئٹزرلینڈ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں سے وہ سپین اور پھر الجیریا چلا گیا۔

تاہم اس کی شخصیت جرمن جاسوسوں کے نزدیک اتنی اہم تھی کہ وہ برابر اس کا پیچھا کرتے رہے، مگر آندرے دوبارہ ان کے ہاتھ نہ آیا۔ الجیریا میں اس نے بہت سے مفرور فرانسیسی جوانوں کا گروہ بنایا اور پھر اتحادیوں کو اپنی خدمات پیش کر دیں؛ چنانچہ آندرے کو لیفٹیننٹ کرنل کا عہدہ دے کر دوبارہ فرانس بھیجا گیا اور اس نے اپنے ملک کو نازیوں سے آزاد کرانے کے لئے جان کی بازی لگا دی۔

آج کل وہ پیرس کے ایک نواحی گاؤں میں آرام اور سکون کی زندگی بسر کر رہا ہے اور جب کبھی فوجی تقریب منعقد ہوتی ہے، تو لوگ اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور یوں بھی پورے فرانس میں وہ واحد شخص ہے جس کے پاس بہادری اور شجاعت کے تمغے سب سے زیادہ ہیں۔ ★★

● وحشی جانور جس طرح لوگوں سے اور پالتو جانوروں سے بھاگتا رہتا ہے اسی طرح بداخلاق آدمی سے سب لوگ ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں اور تنہائی کی وحشت کے سوا اس کا کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا سبھی کو چاہئے کہ بداخلاقی کی بُری صفت کو چھوڑ کر حُسنِ اخلاق کی اچھی صفت کو اختیار کریں، تاکہ انسان کا معنیٰ اس میں جلوہ گر ہو۔ بداخلاق آدمی انسان کا معنیٰ کھو بیٹھتا ہے۔

● انسان کا دل جتنا پاک و صاف اور عمدہ ہوگا۔ اس کی خصلت و سیرت بھی اتنی پاکیزہ اور بہتر ہو گی۔ اور جس کا دل گندہ اور خراب ہوگا، اس کی عادتیں بیہودہ اور بدتر ہوں گی۔ غرضکہ انسان کی عادتیں ان کے دل کا عکس ہوتی ہیں۔ جیسا دل ویسی عادتیں۔ پس ہر انسان کی خصلتوں کو دیکھ کر اس کے دل کی پاکیزگی یا ناپاکیزگی کا پتہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

● وہ انسان جو ہوا و حرص کا شکار ہو، وہ ہلاک ہو جاتا ہے، خواہ دنیا میں، خواہ عقبیٰ میں اور جو انسان خواہشاتِ نفسانیہ کو روکے رکھے اور اس سے باز رہے، وہ دونوں جہاں میں سلامت رہتا ہے۔

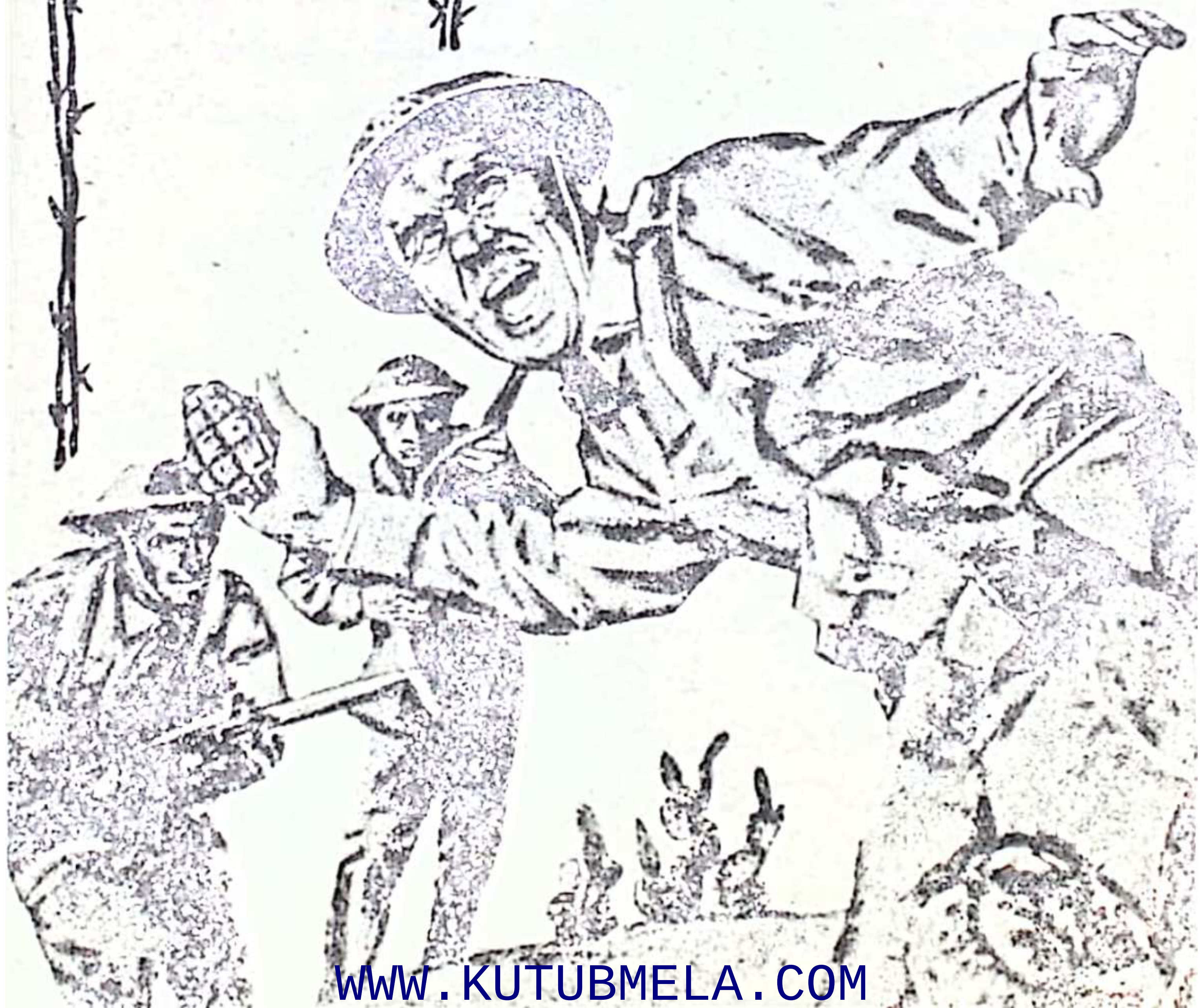
● قوم کا سردار ہوتا ہے جو ان کے سارے معاملات کا حل نکالتا ہو۔ فقیہہ آدمی چونکہ لوگوں کے مسائل دینیہ کا حل نکالتے ہیں اور اُمت کو صحیح راستہ بتلاتے ہیں۔ حرام سے بچا کر حلال کی طرف لاتے ہیں۔ اس لئے اُمت کے سردار فقیہہ لوگ ہی ہیں جو اُن کو اپنا سردار نہ مانے وہ خسران و نقصان میں ہے۔

● جو آدمی جتنا انکسار اور فروتنی کرے گا اتنا ہی وہ بڑا مرتبے والا ہو گا۔ جو شخص بڑے مرتبے کا خواہشمند ہو وہ انکساری اور فروتنی کی محمود صفت کو اختیار کرے، خود بخود عظیم المرتبت ہو جائے گا۔

کتاب: HEAVEN PAYS NO DIVIDENDS

تصنیف: رچرڈ کالمان

تلخیص: ستار طاہر



HEAVEN PAYS NO DIVIDENDS کا مصنف رچرڈ کا فمان دوسری جنگ عظیم کا عینی شاہد ہے۔ اس کی تباہ کاریوں کو اس نے ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ ناول کا ہیرو آفاقی قدروں کا مالک ہے۔ یہ آدمی اس ملک میں پیدا ہوا ہے جو جنگی جنون میں مبتلا ہے اور جو ساری دُنیا کو جنگ کے جہنم میں جھونک چکا ہے۔ یہ آدمی اپنے آقاؤں کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا۔ اس کی حیثیت ہی کیا ہے؟ وہ اتنا ضرور سمجھتا ہے کہ اس کا ملک دوسرے ملکوں کو فتح کر کے، ایک غلط راستے پر چل رہا ہے۔ وہ اس خونی ڈرامے کا خاموش تماشائی ہے۔ اور یہی اس کا جرم ہے کہ وہ مملکت کا ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اپنے آقاؤں کی ہوسِ ملک گیری، ظلم، اور جنگ پسندی کا مویّد کیوں نہیں ہے۔ اس جرم کی اُسے کتنی کڑی سزا بھگتنا پڑتی ہے —— یہ روتیداد المناک ہے۔ اور رچرڈ کا فمان نے اسی المیہ کو لکھا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا اور ابھی تک لکھا جا رہا ہے۔ رچرڈ کا فمان نے اس جنگ کو عام آدمی کے حوالے سے دیکھا اور لکھا ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر یہ ناول موجودہ دور کے ممتاز اور شہکار ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

شہر خاموش ہے۔ چند لمحے پہلے شہر سنسناتی بموں، بموں کے دھماکوں اور مرنے والوں کی چیخوں سے گونج اور لرز رہا تھا۔ یہ سب آوازیں مر گئی ہیں یا شاید میں بہرہ ہو گیا ہوں؟ گہری تاریکی میں ہاتھ پھیلا کر میں نے اپنے سامنے لیٹے ہوئے انسان کو چھوا ہے۔ میرے ہاتھ گاڑھے خون سے بھر گئے ہیں۔ خون، میں نے محسوس کیا ہے اگرچہ اس کی رنگت دکھائی نہیں دیتی، ہو سکتا ہے کیچڑ ہو —— میں نے کیچڑ اور خون کے وہم کو دل سے نکال کر بے حس اور مردہ انسان کی جیبوں میں ہاتھ ڈال دیئے ہیں۔ مجھے کھانے کو کچھ چاہیے۔ میں کئی دنوں سے بھوکا ہوں —— روٹی کے ایک نوالے کو ترس گیا ہوں ——

"ماریا —— ماریا ——" میں چیخنے لگا ہوں

ماریا ——

مجھے روٹی کا ٹکڑا مل گیا ہے۔ کاش تم چند گھنٹے اور زندہ رہ سکتیں ——"

میری چیخ کے ساتھ ہی ایک بار پھر دھماکوں، گولیوں اور چیخوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ میرے جسم پر ملبہ گرنے لگا۔ میں جان بچانے کے لئے تاریکی میں بھاگا۔ ٹھوکریں کھاتا، گرتا پڑتا، اس کھنڈر سے باہر نکلا۔ روٹی کا وہ ٹکڑا جو میں نے لاش کی جیب سے نکالا تھا، اسی افراتفری میں کہیں گر گیا ——

میں نے گھپ اندھیرے میں کان کے پردوں کو پھاڑتی ہوئی آوازوں میں سوچا، مجھے زندہ رہنا ہے یا مر جانا چاہیے۔ زندہ رہنے کے لئے جدّوجہد کی ضرورت تھی۔ اور برلن میں یہ رات موت بن کر آئی تھی۔ شہر کا کونہ کونہ دھماکوں سے گونج رہا تھا۔ وہ دارالحکومت جو دنیا کا دارالخلافہ بننے والا تھا اب راکھ کے ڈھیر کی طرح نظر آ رہا تھا۔ عمارتوں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے، کبھی کبھی کسی عمارت سے آگ کے شعلے یوں اپنے سر اٹھاتے، جیسے عفریت بموں اور سارے شہر کو جلا کر راکھ کر دیں گے۔

شہر مر چکا ہے ـــــ شہر زندہ ہو رہا ہے ــــ برلن فتح
کیا جا چکا ہے ـــــ صبح کی دھندلی روشنی میں ہر طرف بربادی اور تباہی کے نشان نظر آ رہے ہیں "ہٹلر اس وقت کیا کر رہا ہوگا؟" میرے ذہن میں ایک خیال آیا ـــــ ہاں ـــــ جرمنی کا آقا ہٹلر اس وقت کس حال میں ہوگا؟

میں پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا ہوں ـــــ میرے قہقہوں کی آواز میں میری بھوک کی انتڑیوں کی نقاہت واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔

"ماریا ـــــ ماریا ـــــ" میں ایک گرے ہوئے دروازے کے قریب بیٹھ گیا ہوں، چاروں طرف دھواں ہے آگ ہے، اور انسانوں کی لاشیں ہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔ میلے آنسو۔ میں ماریا کو یاد کر رہا ہوں ماریا ـــــ ماریا ـــــ"

ہم ایک پرسکون چھوٹے سے محلے میں رہتے تھے میں اور ماریا، میری بیوی ـــــ ہم امیر تھے نہ غریب، بس دو وقت اچھا خاصا کھانے کو مل جاتا تھا۔ مہینے میں ایک بار تھیٹر دیکھنے کے لئے بھی چلے جایا کرتے تھے۔ مجھے اپنے دفتر میں کم گو، اور محنتی کلرک سمجھا جاتا تھا۔ دفتر میں جب ہٹلر کی فتوحات کا ذکر بلند آواز اور فخریہ لہجے میں کیا جاتا تو میں سر جھکائے اپنے کام میں مگن رہتا۔ مجھے ہٹلر سے ہمدردی تھی نہ نفرت، میں تو ایک عام آدمی تھا جو بڑے آدمیوں کے بڑے بڑے کارناموں اور فیصلوں کو سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا۔ صبح گھر سے نکلتے وقت میں ہر روز سوچا کرتا کہ میں شام کو واپس گھر لوٹوں گا تو ماریا میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ مجھے ہر روز کے جلسوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مجھے اپنی بیوی سے پیار تھا جو میرے بچے کی ماں بننے والی تھی جس کے سرخ اور کھلے ہوئے چہرے کی مسکراہٹ میرے لئے دنیا کی سب سے بڑی خوشی اور نعمت تھی ـــــ

جب میرے افسر اعلیٰ نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا تو میں بالکل خالی الذہن تھا۔ سال میں ایک دو بار کسی وضاحت یا غلطی کے سلسلے میں بڑے صاحب کے دفتر میں پیشی ہو جایا کرتی تھی۔ اس لئے میں پورے سکون کے ساتھ نپے تلے قدموں سے اپنے بڑے صاحب کے دفتر میں داخل ہوا۔

خلافِ معمول بڑے صاحب نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ نہیں کیا۔ میں ادب سے کھڑا ہو گیا۔

"ہمیں تمہاری خدمات کی مزید ضرورت نہیں ہے خزانچی سے اپنا حساب لے لو اور دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کو چارج دے دو۔" بڑے صاحب نے خشک لہجے میں کہا۔ میں گم سم اپنے بڑے صاحب کو دیکھتا رہا۔

"جناب ـــــ میرا قصور؟"

"قصور ـــــ" صاحب طنز سے مسکرایا۔ "میں نہیں جانتا مجھے ذاتی طور پر تم سے کوئی شکایت نہیں ہے مگر سرکاری احکام ـــــ" اس نے اپنے الفاظ چبا لئے۔ "تم جا سکتے ہو۔"

برآمدے میں دفتر کا سپرنٹنڈنٹ میرا انتظار کر رہا تھا چند منٹوں میں میرا حساب بیباق کر دیا گیا۔ اور میں، جس نے پچھلے آٹھ سال سے اس دفتر میں بڑی محنت سے اپنے فرائض انجام دئے تھے، اسے دفتر سے نکال دیا گیا ـــــ میرا قصور کیا تھا؟ مجھے کسی نے نہ بتایا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟

میں شام تک گلیوں اور بازاروں میں گھومتا رہا۔ اور اس "کیوں" کا جواب تلاش کرتا رہا۔ میں محنتی تھا۔ کام میں کبھی غفلت نہ کی تھی۔ پھر مجھے کیوں نکالا گیا۔ بڑے صاحب کا نامکمل جملہ میرے کانوں میں گونجنے لگتا "مگر سرکاری احکام ـــــ"

گھر کے دروازے کے اندر داخل ہونے سے پہلے میں ایک لمحے کو ٹھٹکا۔ میں نے معمول کی طرح اپنے چہرے کو پرسکون

بنانے کی کوشش کی۔ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ گھر سنسان پڑا تھا ــــ ماریا غائب تھی ــــ "کسی کام سے باہر چلی گئی ہوگی۔" میں نے اپنے آپ کو تسلی دی مگر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ شام گہری ہوگئی ــــ رات آگئی اور میں چپ بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ بے حس، گم صُم، ماریا کہاں گئی؟

آدھی رات گذر گئی ــــ ماریا کمرے میں داخل ہوئی، لباس پھٹا ہوا، رخساروں پر انگلیوں کے نشان، ہونٹ کٹے ہوئے، بال بکھرے ہوئے ــــ آنکھیں سوجی ہوئیں اور سرخ ــــ میں لپکا "ماریا ــــ تمہیں کیا ہوا؟ تم کہاں گئی تھیں؟" اس وقت یہ بھول چکا تھا کہ مجھے آج کسی قصور کے بغیر ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ ماریا بے جان ممی کی طرح مجھے گھورتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور دہشت تھی۔ میں نے اسے جھنجوڑ دیا۔ "ماریا، مجھے بتاؤ، تمہیں کس نے پریشان کیا ہے؟ ــــ میں خوفناک انتقام لوں گا۔"

وہ ہنسی ــــ وحشت ناک ہنسی۔ "انتقام ــــ خوفناک انتقام؟ تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ــــ تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ــــ" وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی۔ میں نے اسے سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔ اس کے زخم صاف کئے اور پھر اُسے خلا میں گھورتے ہوئے چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اس وقت جب میرا بڑا صاحب مجھے نوکری سے جواب دے رہا تھا، ہٹلر کی خفیہ پولیس کے کارکن ماریا کو اپنے ساتھ لئے جا رہے تھے۔ خفیہ پولیس کے ہیڈ کوارٹر میں اسے زدوکوب کیا گیا۔ اس کی بے عزتی کی گئی۔ خفیہ پولیس کو میرے "سیاسی کردار" پر شک تھا۔ میں اُن کے نزدیک ہٹلر اور جرمنی کا وفادار نہیں تھا۔ کیونکہ میں نے جلسوں اور جلوسوں میں "ہٹلر زندہ باد" کے نعرے کبھی نہیں لگائے تھے۔ میرے دفتر کے ایک ساتھی کلرک نے میرے "سیاسی کردار" کے بارے میں خفیہ پولیس کو اطلاع دی تھی۔ جب انھوں نے ماریا کو بے دردی سے اذیتیں دے کر رہا کیا تو اسے حکم دیا گیا کہ وہ مجھے یعنی اپنے شوہر کو چھوڑ دے۔ اور سرگرم نازی عورتوں کی تنظیم میں دن رات کام کرے۔ ماریا کو بتایا گیا تھا کہ مجھے ملازمت سے نکال دیا گیا ہے اور چند دنوں میں میرے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔

صبح کے ملگجے اُجالوں میں ماریا میرے کمرے میں آ کر مجھے سب کچھ بتا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مار پیٹ کے سارے نشان ابھرے ہوئے تھے۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں خون تھا ــــ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بیچارگی سے دیکھا۔ ہم دونوں ایک بڑی مشین کے دو حقیر پرزے تھے، جنھیں یہ مشین پیلنے والی تھی۔ اس مشین کے شکنجے سے بچ نکلنا آسان نہ تھا۔ میں نے آنسو پیتے ہوئے ماریا کا سرد ہاتھ تھام لیا۔ ماریا کانپنے لگی۔ اس کی وفا کا امتحان اور آزمائش کی گھڑی آ چکی تھی۔ وہ میری آنکھوں میں سب کچھ پڑھ چکی تھی۔ ایک طرف میں تھا۔ اس کے ہونے والے بچے کا باپ ــــ حکومت کی نظر میں معتوب ــــ اور دوسری طرف وہ تھی ــــ ایک مجبور عورت ــــ جسے اس کے شوہر سے جدا کیا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ماریا کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ سرد ہاتھ حرارت سے گرم ہونے لگا۔ اور خوف زدہ آنکھوں میں عزم کی چمک نظر آنے لگی ــــ

میں ایک دروازے کے سامنے کھڑا ہوں۔ ماریا میرے ساتھ لگی ہوئی کانپ رہی ہے۔ یہ کپکپاہٹ سردی کی نہیں خوف سے پیدا ہوئی ہے۔ میں پُرامید ہوں۔ ہم برلن سے

سو میل دور چھوٹے سے قصبے میں بچتے بچاتے پہنچ گئے ہیں۔ میں فرٹز سے کبھی مایوس نہیں ہوا ـــــ اور جب گھر کے مالک فرٹز نے دروازہ کھولا تو میری شکل دیکھتے ہی مجھے سینے سے لگا لیا۔ ماریا کے ہاتھ کو بوسہ دے کر وہ ہمیں گھر کے اندر لے گیا۔ ہمیں دیکھ کر اس کا چہرہ کھلا جا رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کافی تیار کی اور پھر کافی کے پیالے سامنے رکھ کر ہم بیٹھ گئے ـــــ

فرٹز کا کھلا ہوا چہرہ آہستہ آہستہ سیاہ پڑنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا ایک ایک لفظ سیاہی کا ایک دھبہ ہو، جو فرٹز کے چہرے کو سیاہ کئے جا رہا ہو۔ جب میں اپنی بپتا سنا چکا تو فرٹز چند منٹوں تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر گلا صاف کر کے بولا " مارک ـــــ حالات بہت نازک ہیں "

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا " ہاں ـــــ حالات بہت نازک ہیں " میں نے اس کی بات دہرائی " مگر دوستی، رفاقت ..... !" میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

" میں سمجھتا ہوں " وہ تیزی سے بولا " مگر اپنے آپ کو خطرے میں نہیں ڈالا جا سکتا " ماریا نے میری طرف مایوس نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے والے تھے۔ میں نے منہ پھیر لیا ـــــ

" بہرحال ـــــ تم لوگ ـــــ آرام کرو، میں سوچتا ہوں۔ صبح تک کے لئے خدا حافظ "

فرٹز کے ساتھ کتنی امیدیں وابستہ تھیں، اس سے تو میں ہمدردی حاصل کرنے کے لئے آیا تھا مگر فرٹز ـــــ مجھے شش و پنج میں چھوڑ کر چلا گیا ـــــ

یہ رات میں نے اور ماریا نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ میں جب بھی اس کی طرف دیکھتا، اسے جاگتے ہوئے پایا۔ ہر لمحہ میرے دل میں یہ خیال آ رہا تھا کہ فرٹز کا فیصلہ میرے حق میں ہو گا۔ وہ جب کوئی فیصلہ کرنے لگے گا تو میری محبت، میری دوستی اس کے دل کو نرم کر دے گی۔ وہ نوجوانی اور طالب علمی کے دنوں کو کیسے بھلا سکتا ہے۔ جو ہم دونوں نے ایک ساتھ گذارے تھے۔

دن نکل آیا۔ فرٹز اپنا فیصلہ سنانے نہ آیا مجھ پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ میرا سر چکرانے لگا تھا۔ دس بجے کے قریب گھر کی ملازمہ ناشتے کی ٹرے اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ ٹرے میں ایک لفافہ پڑا ہوا تھا ـــــ میں نے جلدی سے لفافہ اٹھایا۔ کاغذ پر پنسل سے ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔

" مارک، میں مجبور ہوں۔ یہی مدد کر سکتا ہوں ـــــ "

کاغذ کے ساتھ ایک ہزار روپے کا نوٹ منسلک تھا۔ میں نے بے بسی کے ساتھ رقعہ ماریا کی طرف بڑھا دیا۔ اور اپنے چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپ کر اپنے آنسو چھپانے لگا۔ فرٹز نے میری دوستی، رفاقت اور محبت کی قیمت ایک ہزار روپے مقرر کی تھی۔ میں نے اس قیمت کو ٹھکرایا نہیں۔ مجھ میں اتنی ہمت ہی کہاں تھی۔ ایک ایک پائی کی ضرورت تھی، اور ہم اپنے گھر سے اس افراتفری سے بھاگے تھے کہ اپنا کچھ سامان بھی فروخت نہ کر سکے تھے ـــــ

ہزاروں، لاکھوں گھروں میں کمرے خالی تھے۔ ان گنت ماؤں کے بیٹے میدانِ جنگ میں لڑ رہے تھے اور ہٹلر کے اشارے پر اپنی جانیں قربان کر رہے تھے مگر اتنے بڑے ملک میں ہم دو انسانوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی محفوظ اور پُرامن جگہ، جہاں میری بیوی اس بچے کو جنم دے سکتی جسے وہ مصیبت کے عالم میں اٹھائے اٹھائے پھر رہی تھی

بیس میل آگے ـــــ ایک اور قصبہ ـــــ جان نہ پہچان ـــــ ہوٹلوں میں شناختی کاغذات کی جانچ پڑتال، ہر شخص شک و شبہے سے دیکھ رہا تھا۔ رات بھر ٹھہرنے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ریلوے سٹیشنوں پر خفیہ پولیس اور

باوردی پولیس کے آدمی ہر شخص کو گھورتے ـــــ ہم نے کئی راتیں کھُلے کھیتوں میں گزاریں۔ ماریا کی حالت خراب ہوتی جارہی تھی۔ ہر روز ہمیں نیا ٹھکانا تلاش کرنا پڑتا۔ میں پاگل ہورہا تھا۔ خودکشی کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔

خشک نالے میں میں نے دیاسلائی کے آگے ہاتھ رکھ کر ماچس جلائی اور سگریٹ سُلگایا۔ آسمان پر گدلے بادل جمع ہورہے تھے اور دُور دُور تک بارش سے بچنے کے لئے کوئی جگہ نظر نہ آرہی تھی۔ ماریا درد سے کراہ رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتی ـــــ میں پیار سے اس کا سر سہلانے لگا۔ اس کے خوبصورت سنہرے بالوں کی رنگت اُڑ رہی تھی۔ نرم اور ریشمیں بال کھُردرے اور سخت ہورہے تھے۔ میں نے دل میں سوچا ـــــ "اس زندگی سے موت اچھی ہے" گہری تاریکی میں بھی شاید ماریا میرے خیالات کو بھانپ گئی۔ اور عورت کی فطری رجائیت کے جذبے سے کہنے لگی "مارک ـــــ انسان کو ہمت نہیں ہارنا چاہیئے"

"انسان ـــــ ہمت ـــــ" میں کانپ اُٹھا "ماریا ـــــ جہاں جنگل کا قانون نافذ ہو، جہاں کوئی انسان نہ ہو، اور چاروں طرف بھیڑئیے نظر آرہے ہوں وہاں انسان کب تک خالی خولی ہمت سے کام چلا سکتا ہے"

ماریا نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ گہری خاموشی میں صرف جھینگر میرے سوال کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے پوچھا "ماریا، سو گئی ہو؟"

"نہیں تو" وہ نرمی سے بولی "مارک میں سوچ رہی ہوں کہ اس دنیا میں انسان کو امن اور چین سے جینے کیوں نہیں دیا جاتا؟ میں سوچ رہی ہوں، میرے پیٹ میں جو انسان پل رہا ہے وہ کس دُنیا میں آنکھ کھولے گا؟ کیا اُسے بھی یہی دنیا دیکھنا پڑے گی، جہاں انسان، انسان کا خون بہا رہا ہے؟

چند لمحوں کے لئے میں صبر اور ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھا۔

"ماریا، یہ سوال ہٹلر سے پوچھو جس نے دُنیا کو جنگ کے جہنم میں جھونک دیا ہے۔ جس نے بستیاں ویران کردی ہیں اور ماؤں کی گودیں اُجاڑ دی ہیں۔ ہمارا بچّہ اس دنیا میں آنکھ کھولے گا۔ وہ اس بدصورت دنیا کا ایک حصّہ بنے گا، جہاں جنگ پسند قوم کا کوئی امن پسند شہری زندہ نہیں رہ سکتا"

ماریا نے سختی سے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس وقت میں چیخ رہا تھا۔ میرے منہ سے جھاگ نکلنے لگا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا "مارک ـــــ ہمارا بچّہ اس دنیا میں جنم نہیں لے گا ـــــ تم نے سُنا نہیں کہ جرمنی کو ہر میدان میں شکست ہورہی ہے جس دن ہمارا بچّہ جنم لے گا، دنیا سے جنگ کے بادل چھٹ چکے ہوں گے"

ماریا چپ ہوگئی۔ جیسے گہرے خیالوں میں کھو گئی ہو۔ طویل خاموشی کے بعد ماریا نے مجھ سے پوچھا "مارک ـــــ سو گئے؟"

میں چپ رہا ـــــ ماریا اپنے آپ سے کہنے لگی "کاش میں اس زمانے میں پیدا نہ ہوتی ـــــ" میرے دل سے ایک آواز اُبھری "کاش ہم ہٹلر کے عہد میں پیدا نہ ہوتے ـــــ"

زندگی کتنی پیاری ہے ـــــ اس کا اندازہ مجھے انہی دنوں میں ہُوا۔ موت کے خوف سے میں کسی کے پاس ملازمت کے لئے نہ جاتا تھا۔ اور ہماری پونجی آہستہ آہستہ ختم ہوتی جارہی تھی۔ کھانے پینے کی معمولی چیزوں کے نرخ آسمان کو چھو رہے تھے۔ ہر چیز کی قلّت تھی اور انسان بھوک سے مر رہے تھے کیونکہ ساری خوراک اُن فوجیوں کو بھیجی جارہی تھی جو اتحادیوں سے ہر میدان میں شکست کھا رہے تھے۔ کبھی کبھی میں ان لوگوں کے بارے میں سوچتا جو ایک جنگ پسند ڈکٹیٹر کے اشارے پر اپنی جانیں ضائع کر رہے تھے تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میرا دُکھ کم ہوگیا ہے۔ انسان کتنا خودغرض ہے۔ اپنے سے زیادہ

دکھی انسان کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

ماریا گھل گھل کر ہڈیوں کا پنجر نظر آنے لگی۔ پیٹ کے لئے ہم اب دن میں ایک بار کھانا کھاتے تھے۔ ایک ایک لقمہ چبا کر نگلا جاتا۔ مٹ میلی اور سڑی باسی روٹی کا بھورا زمین پر گر جاتا تو اُسے اٹھا کر پیٹ کے دوزخ میں ڈال لیا جاتا۔ مجھے ہر وقت بھوک لگی رہتی۔ میں ان دنوں کے تصور سے لرز جاتا اور دکھ کی زندگی لمبی ہوتی چلی جا رہی تھی۔

چند دنوں کے بعد ہمارے پاس ایک پائی تک نہ رہی۔ ماریا سے اب دو قدم بھی چلا نہ جاتا تھا۔ ادھر اس کے دن قریب آ رہے تھے اور ہم آوارہ گردوں اور بے ٹھکانا لوگوں کی طرح دربدر ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ فاقے کا دوسرا دن آیا تو میں جھنجھلا اٹھا۔ اب مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ رہی تھی کہ ماریا کی آنکھوں سے آنکھیں چار کر سکوں۔ اس کی آنکھوں کی روشنی دھندلا رہی تھی۔ گہری، شفاف آنکھیں میلی ہو رہی تھیں اور ان آنکھوں میں ایک سوال ہوتا۔ ایسا سوال جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا ــــــ

ہم برلن سے صرف دس میل دور تھے۔ ایک ویران سے کھیت میں گھاس کے کچھ تنکے بچھا کر میں نے ماریا کے لئے "بستر" تیار کیا۔ اُسے لٹا کر نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا "ماریا ــــــ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں ــــــ جلدی لوٹ آؤں گا ــــــ یہاں سے قریب ہی ــــــ" ماریا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑایا ــــــ اور شہر کی طرف چل پڑا

یہ کیسی رات تھی ــــــ برلن جو رات کو روشنیوں سے جگمگایا کرتا تھا، اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دھماکوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بازار سنسان تھے، اور گلیاں ویران۔ پولیس کے آدمی اِدھر اُدھر کتوں کی طرح پھر رہے تھے جیسے شکار کی بُو سونگھ رہے ہوں ــــــ

میں ایک گھر کے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ میں دبے قدموں اندر داخل ہوا۔ مکان کے اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چند منٹوں میں مجھے یقین ہو گیا کہ اس مکان کے مکین یہاں سے جا چکے ہیں۔ میں جلدی سے باورچی خانے کی طرف دوڑا۔ ایک ایک الماری کی تلاشی لی۔ گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا جب میں خالی مکان سے باہر نکلا، تو ایک قدم بھی چلنا محال ہو رہا تھا۔ میں سستانے کے لئے اندھیرے میں رک گیا۔ پولیس کے دو آدمی میرے قریب سے گزرے۔ "روسی شہر کے قریب پہنچ چکے ہیں ــــــ" ایک نے کہا۔

"چپ ــــــ کوئی سن لے گا"۔ دوسرا بولا۔

میرے کانوں میں ماریا کے الفاظ گونجنے لگے۔ "جب ہمارا بچہ جنم لے گا تو یہ دنیا بدل چکی ہوگی"۔ میرے جسم کی تھکان ختم ہو گئی۔ میں تازہ دم، تیز طرار اور چست، ہو گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور ایک دوسرے مکان میں داخل ہو گیا۔ ایک کمرے میں مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے ہمت کی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ مدھم روشنی میں ایک بوڑھی عورت دو بچوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ دونوں بچے اس کے گھٹنوں سے لگے ہوئے تھے۔ آواز سن کر بوڑھی عورت چونکی اور خوف سے بولی "کون ہو تم؟"

چند لمحوں کے لئے میرے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔ "کون ہو تم، یہاں کیوں آئے ہو؟" اس کا لہجہ قدرے نرم پڑ چکا تھا۔ شاید اُسے میری ہیئت کذائی پر رحم آ گیا تھا۔ "میں بھوکا ہوں ــــــ میری بیوی بیمار ہے۔ بھوکی ہے ــــــ" میری آواز رندھ گئی۔ بوڑھی عورت آہستہ سے اُٹھی۔ ایک

الماری کو کھولا۔ اور چند نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ "یہ لو ـــــ ان سے روٹی خرید لو۔"

میری آنکھوں کے سامنے سنسان اور ویران بازار گھوم گئے۔ اس وقت کہاں سے روٹی مل سکتی تھی؟ "مجھے پیسے نہیں چاہئیں۔ روٹی چاہیے ـــــ خدا کے لئے۔" وہ بوڑھی عورت نے میری طرف غور سے دیکھا۔ الماری کی طرف بڑھی، ایک خانے سے روٹی کا پاؤ بھر ٹکڑا اٹھا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "ان بچوں کی طرف دیکھو، یہ میرے پوتے ہیں۔ ان کے باپ جنگ میں مارے گئے ہیں ـــــ وہ اب کبھی واپس نہیں آئیں گے، گھر میں زیادہ روٹی نہیں ہے اور جانے کل کیا ہونے والا ہے۔ میں اپنے اُن بیٹوں کی نشانیوں کو زندہ رکھنا چاہتی ہوں جو ہٹلر کے پاگل پن کا شکار ہو گئے ـــــ جاؤ ـــــ اب جاؤ۔"

مجھے ماریا کا خیال آیا جسے میں بھلا بیٹھا تھا۔ اور اس بچے کے تصور سے میری رُوح لرز اٹھی جسے ماریا جنم دینے والی تھی۔ میں باہر کی طرف بھاگا۔

"رک جاؤ ـــــ" کسی نے مجھے کندھے سے پکڑ لیا۔ "یہ کیا لئے جا رہے ہو؟" سپاہی نے میرے ہاتھوں سے روٹی چھین لی اور مجھے دھکا دے کر گرا دیا۔ میں اُٹھا اور بھاگ کر اُسے پکڑ لیا۔ "خدا کے لئے مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔ دو دن کے بعد مجھے روٹی کا یہ ٹکڑا نصیب ہوا ہے۔ میری بیوی بھوک سے مر رہی ہے۔ خدا کے لئے ـــــ روٹی واپس دے دو۔"

"کون سی روٹی؟" وہ ہنس کر بولا۔ "کیسی روٹی؟"

"کمینے، ظالم، بدمعاش، ہٹلر کے غلام۔" میں کہنے لگا۔ "وہی روٹی جو تم نے مجھ سے چھینی ہے۔" سپاہی نے میری کنپٹی پر دو ہاتھ مارے۔ اور میں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ "الو، پاجی، احمق، عقل کے اندھے، تم نے روٹی کو چھپایا کیوں نہیں لیا تھا۔ روٹی ہاتھ میں لے کر کیوں نکل آئے تھے۔ پاجی ـــــ"

میں گرتا پڑتا اٹھا ـــــ اور ٹھوکریں کھاتا ہوا واپس چل نکلا۔ دھماکوں اور گولیوں کی آوازوں سے بے خبر، تیزی سے چلتا رہا۔ مجھے ماریا کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی۔ جب میں کھیت کے قریب پہنچا تو رات کا آخری پہر تھا۔ چند گھنٹوں میں صبح ہونے والی تھی۔ میں نڈھال اور تھکا ہوا کھیت میں گر پڑا۔ جانے کب تک بے ہوش پڑا رہا۔ ہوش آیا تو پھر اپنے آپ کو کوستا ہوا بھاگا۔ میں نے اندھیرے میں کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا ـــــ

میرے ہاتھ کسی گیلی چیز سے بھر گئے ـــــ خون کی بُو سے جی متلی کرنے لگا ـــــ میں ہوش کھونے والا تھا۔ اس رات کی ذلتوں اور صعوبتوں نے مجھے نیم جاں کر دیا تھا۔ میں نے ہاتھوں سے ماریا کو ٹٹولا ـــــ سرد جسم ـــــ سرد، ٹھٹھرا ہوا مردہ جسم ـــــ اور اس کے پیروں میں وہ بچہ پڑا ہوا تھا جسے نئی اور خوبصورت دنیا دیکھنی تھی ـــــ ننھا سا بچہ ـــــ چند گھنٹوں کا مُردہ ـــــ بے جان ـــــ ٹھٹھرا ہوا گوشت کا بے جان ٹکڑا۔ میں نے گوشت کے اس ٹکڑے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ میرے ہاتھ خون سے بھر گئے۔ ٹھنڈے، جمے ہوئے خون سے ـــــ میرے اپنے خون سے ـــــ ماریا کے خون سے ـــــ

ماریا نے کہا تھا۔ "جب ہمارا بچہ جنم لے گا تو یہ دُنیا بدل چکی ہو گی۔" وہ کتنی سچی، کتنی کھری تھی۔ یہ دنیا نہیں بدلی تھی۔ وہ روٹی کے چند لقموں کے لئے ترس کر مر گئی تھی۔ اور اس کے بچے کے سر پر چھت نہ تھی، کھلا آسمان تھا۔ اس کے بچے نے اس دُنیا میں آنکھ کھول کر سب سے پہلے دھماکوں

کی آواز سنی تھی ــــــ اور شاید وہ دھماکوں کے خوف سے ہی ڈر کر مر گیا تھا۔ اس ننھی سی معصوم روح نے اس دنیا میں تو زندہ رہنا گوارا نہیں کیا تھا جہاں ہٹلر جیسے لوگ حکومت کرتے ہیں ــــــ

یہ میرا بیٹا تھا ــــــ میرا بیٹا ــــــ میں نے اپنے بیٹے کو سینے سے لگایا اور اس کی مردہ ماں کے قریب بیٹھ گیا اور بے ہوش ہو گیا۔

بموں کے دھماکوں، برستی ہوئی گولیوں کی سنسناتی ہوئی آوازوں نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ میں نے اپنے بیٹے کو سینے سے اُتار کر اس کی ماں کے پہلو میں لٹا دیا اور برلن کی طرف چل پڑا ــــــ شہر فتح ہو چکا ہے۔ جنگ یہیں سے شروع ہوئی تھی اور یہیں پہ ختم ہو گئی ہے اور روٹی کا ٹکڑا مجھ سے پھر چھن گیا ہے۔

میں ہنس رہا تھا ــــــ میں ہنس رہا ہوں۔ برستی گولیوں اور گرتے ہوئے مکانوں کی آوازوں میں ــــــ دھڑام ــــــ دھڑام ــــــ ہاہاہا ــــــ میں ہنس رہا ہوں، ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں ــــــ

کسی نے میرا بازو پکڑ لیا ہے ــــــ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ یہ آدمی کیا کہہ رہا ہے ــــــ میں سن رہا ہوں ــــــ الفاظ میرے کانوں سے گزر کر دل تک پہنچ رہے ہیں۔

" میں قسم کھاتا ہوں۔ میں نے اپنے مکان کی ایک ایک اینٹ اپنے ہاتھ سے رکھی تھی۔ میں نے بارہ سالوں میں اپنے مکان کو مکمل کیا تھا۔ میں ہر روز کارخانے کی چھٹی کر کے اپنا مکان بنانے چلا جاتا تھا۔ لوگ مجھ پر ہنستے تھے کہ بھلا اکیلا آدمی مکان بنا سکتا ہے۔ بھائی میں نے بارہ سال میں اپنا مکان بنا لیا ــــــ پورے بارہ سال میں ــــــ اور وہ مکان چند منٹوں میں بم گرنے سے گر پڑا ہے ــــــ بارہ سال ــــــ چند منٹ ــــــ ذرا سوچو تو ــــــ "

پاگل ــــــ بے وقوف ــــــ احمق ــــــ اپنے مکان کو رو رہا ہے ــــــ ہاہاہا ــــــ دنیا میں کیسے کیسے احمق بستے ہیں ــــــ مارا ــــــ یہ آدمی مکان کو رو رہا ہے، اور ــــــ میں اس روٹی کے ٹکڑے کو ــــــ جو اب پھر مجھ سے چھن گیا ہے ــــــ مارا ــــــ میں بھی بھوکا مروں گا۔ اگر تمہیں روٹی نہیں ملی تو میں بھی بھوکا مر رہا ہوں ــــــ ہاہاہا ــــــ روٹی ــــــ موت ــــــ ہمارا بچہ ــــــ نئی دنیا ــــــ ہاہاہا!!

جب آدمی پر حکومت و سلطنت کرنے کا نشہ طاری ہو جاتا ہے، تو یہ اس کے دماغ کو اتنا بگاڑ دیتا ہے کہ شراب کا نشہ بھی اتنا نہیں بگاڑ سکتا۔ شراب کی مستی سے سرشار انسان اپنوں اور بیگانوں کی تمیز کھو دیتا ہے۔ حکومت و سلطنت کے نشے سے چور ہونے والا آدمی اپنوں اور بیگانوں کی تمیز کھو دینے کے ساتھ خدا اور رسول کو بھی بھول جاتا ہے۔ اپنی کرسی کی حفاظت میں حق کا دامن چھوڑ کر ناحق کی رعایت کرنے لگتا ہے۔ عوام کے مفاد پہ ہتھوڑا مار مار کر اپنا اور صرف اپنا مفاد چاہتا ہے۔

قیدیوں کے قیدی

نام کتاب : THE PRISONERS OF PRISONERS

مصنف : رچرڈ ہاک

تلخیص : سلطان غازی



یہ دو اکتوبر ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ دشمن کا دس ہزار ٹن وزنی جہاز آہستہ آہستہ ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کی رفتار دس ناٹ (ناٹ = ۶۰۸۰ فٹ) سے زیادہ نہ تھی اور وہ غالباً ابھی ابھی بلجین کانگو کی بندرگاہ "بانانا" سے روانہ ہوا تھا۔ میں اگرچہ خود جہاز نہ دیکھ سکتا تھا کیونکہ یو بوٹ ۸۰۵ میں میری ڈیوٹی اس مقام پر تھی جہاں آبدوز کو گہرائی میں لے جانے یا سطح پر لانے کے لئے اندرونی دباؤ کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ لیکن انٹرکوم پر گربیر کی آواز اور بولنے کے انداز سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ پیری سکوپ سے اس نے کیا منظر دیکھا ہو گا۔

"یہ تو امریکی ٹینکر ہے" لیفٹیننٹ کی آواز ایسے سنائی دی جیسے کسی موٹے شکار کو دیکھ کر اس کی رال ٹپک رہی ہو۔

"گہرائی، ۵۰ فٹ"، میں نے انٹرکوم پر فوراً لیفٹیننٹ گربیر کو آبدوز کی گہرائی سے مطلع کیا۔ اور اس کے بعد چیف کوارٹر ماسٹر کارل وودزر کو دشمن ٹینکر کے بارے میں بتایا۔ وودزر پورے ایک سال تک ایک ایسی ہی آبدوز کشتی پر متعین رہ چکا تھا اور دشمن کے جہازوں پر چھاپے مارتا رہا تھا لیکن میرے لئے یہ پہلا تجربہ تھا۔ میری طبیعت کے تجسس اور ہیجان کو بھانپتے ہوئے وودزر نے کہا "تم دیکھتے جاؤ کہ یہ جہاز کبھی کیسے سمندر کی تہہ تک پہنچتا ہے۔"

ہماری یو بوٹ نے چند لمحے زیر آب پینترے بدلے اور پھر امریکی ٹینکر کی جانب صرف چھ سو گز کے فاصلے سے تین تارپیڈو چھوڑ دیئے گئے۔ چند لمحے بعد مجھے انٹرکوم پر اوپر کی منزل کا شور سنائی دیا۔ جہاں عملے کے چوالیس ارکان مارے خوشی کے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ پھر ہیڈ فون پر لیفٹیننٹ گربیر کی آواز سنائی دی۔ "تینوں تارپیڈو نشانے پر لگے۔" اس کامیابی پر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں خاموش رہا اور منتظر کہ دشمن کی توپیں کب دہانے کھولتی ہیں لیکن اُدھر سے کوئی جوابی کارروائی نہ ہوئی میں نے اپنی دانست میں یہی جانا کہ دشمن کا کام تمام ہو چکا۔ ادھر وودزر نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ "تمہارا یہ پہلا تجربہ خاصا دلچسپ رہا ہو گا"۔ میں جواب میں مسکرا دیا لیکن تجربہ ابھی جاری تھا۔ انٹرکوم پر گربیر کے مختلف احکام سنائی دے رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہماری آبدوز نے ایک سو اسی درجے کے زاویے پر آہستہ آہستہ گھومنا شروع کیا۔ تاکہ عقب کی تارپیڈو ٹیوب کا رخ دشمن کی طرف ہو جائے۔

"کیا تین تارپیڈو اُسے ڈبونے کے لئے کافی نہ تھے" وودزر زیر لب بڑبڑایا لیکن میں اپنی جگہ خوش تھا۔ کونگزبرگ میں آبدوز کے تربیتی مرکز سے فارغ ہونے کے بعد میرے لئے سچ مچ کی لڑائی کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اور اسی طرح گربیر بھی سرنگیں صاف کرنے والے جہاز پر عرصے تک خدمات انجام دینے کے بعد پہلی بار ایک آبدوز کو کمان کر رہا تھا۔ ہم دونوں کی یہ خواہش تھی کہ اس لڑائی میں دشمن کا جہاز مکمل طور پر تباہ ہوتے ہوئے دیکھیں۔

امریکی ٹینکر نے ہمارے مقابلے کی ناکام سی کوشش بھی کی لیکن اوپر سمندر کی سطح پر تین گولے چھینٹے اڑا کر ڈوب گئے۔ اب ہماری باری تھی۔ آبدوز نے پینترا بدل کر نشانہ باندھ لیا تھا۔ فوراً ہی عقب کی ٹیوب سے دو تارپیڈو سنسناتے ہوئے نکلے اور دونوں ہی ٹھیک نشانے پر جا لگے۔ نئے تجربے کا ہیجان ختم ہو چکا تھا اور اب میری طبیعت پُرسکون تھی۔ عین اس وقت مجھے شدید بھوک کا احساس ہوا۔ میں نے بڑی دیر سے کچھ نہ کھایا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اب کام ختم ہو چکا ہو گا، میں نے اپنی جگہ سے قدم اٹھایا ہی تھا کہ وودزر نے ڈانٹ بتائی "کریب، اپنی ڈیوٹی سے مت ہلو۔ مجھے خطرہ ہے کہ ہمارے اس نئے کمانڈر کی طرف سے ابھی مزید احکام موصول ہوں گے۔"

وودزر کی آواز میں طنز بھی تھی اور غصّہ بھی۔

یو بوٹ آبدوزوں کے لئے عام احکام یہی تھے کہ وہ دشمن کا جہاز ڈبونے کے بعد فوراً اس مقام سے روانہ ہو جائیں اور سطح آب پر ہرگز نہ آئیں۔ مبادا دشمن کے جہاز سے بچ نکلنے والے یو بوٹ کو

پہچان لیں۔ لیکن لیفٹیننٹ گریبر کے بارے میں وہ وزر کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔

"حضرات: اب ہم سطح پر آنے والے ہیں۔"

انٹرکوم پر گریبر کی آواز گونجی۔ اس آواز میں اگرچہ اعتماد تھا لیکن دشمن کے ڈوبتے جہاز کو ایک نظر دیکھ لینے کے شوق اور تجسس کی جھلک بھی نمایاں تھی۔ وہ وزر سے اب صبر نہ ہوسکا۔ دانت پیستا ہوا آگے بڑھا۔ اور انٹرکوم کی ٹیوب سے گریبر کو مخاطب کرکے بولا۔

"سر لیفٹیننٹ! ہم کسی کو قیدی نہیں بنا سکتے۔ میں رسد کے انچارج کوارٹر ماسٹر کی حیثیت سے آپ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ آبدوز میں قیدی رکھنے کے لئے فالتو خوراک ہے نہ جگہ۔"

"میں قیدیوں کے لئے سطح پر نہیں جارہا۔" لیفٹیننٹ گریبر نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں تو صرف دشمن کے جہاز پر اپنے حملے کے اثرات دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا خیال ہے تمہارا، کیا امریکی جہاز میں بہت بڑے بڑے سوراخ ہوں گے؟" اس کے بعد گریبر نے مجھے گہرائی کا میٹر پڑھنے کا حکم دیا۔

"پچھتر فٹ..... پچاس فٹ...... پچیس فٹ"

آبدوز اوپر اٹھ رہی تھی اور میں میٹر پڑھ رہا تھا۔ آبدوز ایک جھٹکے سے سطح پر آن رکی۔ اندر ایک عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ ہر شخص ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہا تھا۔ اور سبھی ڈیک پر پہنچ کر دشمن کی تباہی کا نظارہ کرنے کے لئے بے تاب تھے۔ انجینئرنگ آفیسر شمی اور تارپیڈو مین ہیملٹ رو ہمر اپنے عملے کے ساتھ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے کنٹرول روم میں سے گزرے۔

یہ دوپہر کا وقت تھا۔ دن کی روشنی میں پہلے تو میری آنکھیں اس طرح چندھیائیں کہ کچھ نظر ہی نہ آیا۔ سمندر کی سطح پر اس قدر دھند تھی کہ چھ سو گز کے فاصلے پر دشمن کا جہاز بھی صاف طور پر دکھائی نہ دیتا تھا۔

"وہ دیکھو وہ!" تارپیڈو مین رو ہمر نے ہنستے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ امریکی ٹینکر کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ اس کی ایک سمت میں پانچ بڑے بڑے غار منہ کھولے ہوئے تھے۔ ڈیک پر جا بجا آگ لگ چکی تھی۔ اور فضا میں دھوئیں کا ایک دبیز بادل بلند ہو رہا تھا۔ ربڑ کی دس کشتیاں جہاز کے قریب سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھیں۔ لیکن ایک کے سوا سبھی خالی تھیں اور اس ایک رافٹ میں بھی صرف تین افراد بیٹھے دکھائی دیئے۔ جو ہماری طرف رخ کئے ہمیں گھورتے دکھا رہے تھے۔

آبدوز کا تمام عملہ اوپر پہنچ چکا تھا اور سب ہی دشمن کے ڈوبتے ہوئے جہاز کو دیکھنے میں محو تھے۔ اس طرح تقریباً دس منٹ گزرے ہوں گے کہ دفعتہً ہمیں اپنے سروں پر ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ لیفٹیننٹ گریبر نے فوراً پلٹ کر دوربین آنکھوں سے لگالی۔ کچھ لوگ آبدوز کو زیر آب لے جانے کے لئے نیچے اتر گئے۔ کچھ ڈیک پر مشین گنوں کی جانب لپکے۔ لیفٹیننٹ گریبر بُت کی طرح ساکن اور خاموش کھڑا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ امریکی ٹینکر نے حملہ شروع ہوتے ہی امداد کے لیے ریڈیو سگنل دے دیا ہوگا اور آبدوز کو سطح پر لانے سے پہلے گریبر کو اس ممکن صورت حال کا احساس کرلینا چاہئے تھا۔

ایک لمحے کے اس تعطل اور ہڑبونگ کے بعد آخر دوزر چلا اٹھا: "غوطہ لگانے کے لیے نیچے چلو" لیکن لیفٹیننٹ گریبر نے اس سے زیادہ شدت سے انکار کرتے ہوئے جواب دیا: "ہرگز نہیں، صرف دو طیارے ہیں، سب لوگ مقابلے کے لیے تیار ہوجائیں!"

عملے میں خاصی تعداد مجھ جیسے کم تجربہ رکھنے والے نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے اپنی اپنی ڈیوٹی سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں آبدوز کی اگلی مشین گن کی طرف بڑھا اور جلدی میں رو ہمر سے ٹکرا گیا۔ وہ بے چارہ لوہے کے فرش پر اس زور سے گرا کہ وہیں بے ہوش ہوگیا۔

دونوں طیارے امریکہ کے اے-۲۰ قسم کے ہلکے بمبار تھے۔

جو غالباً افریقہ میں متعین فرانسیسی افواج کو امریکہ نے عاریتاً دے رکھے تھے۔ دونوں طیاروں نے پہلے ڈوبتے ہوئے ٹینکر پر پرواز کی۔ پھر وہ بہت نیچی اڑان پر بچ جانے والے امریکیوں کی رافٹ پر سے گزرے۔ میں نے اس موقع پر طیاروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن مشین گن ایک خاص بلندی سے نہ تو زیادہ نیچے آسکتی تھی، اور نہ قریبی فاصلے پر اس سے نشانہ لیا جاسکتا تھا۔ دونوں طیارے کوئی نقصان اٹھائے بغیر ہمارے سروں پر سے گزر گئے۔ اور اسی لمحے ایک زبردست دھماکے نے آبدوز کو اچھال دیا۔ ڈیک کے پچھلے حصے پر پانچ سو پونڈ وزنی بم نے تباہی مچا دی تھی۔ ہمارے ساتھیوں کے جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں اُڑے، بہت سے افراد محض دھماکے کے جھٹکے سے اچھل کر سمندر میں جا پڑے اور انجینئرنگ آفیسر لمّی کا بے جان جسم میری آنکھوں کے سامنے راکٹ کی طرح ڈیک سے اُچھلا اور پچاس فٹ دور سمندر میں جا گرا۔ اس کی لائف بیلٹ میں ہوا بھری ہوئی تھی اور وہ پانی کی سطح پر چت پڑا تھا۔

ابھی ہم اس دھماکے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ ایک طیارہ چکر کاٹ کر پھر ہماری طرف جھپٹا۔ اس دفعہ ہم طیارے کی مشین گنوں کی زد میں تھے، میں فوراً جھک کر آوٹ میں ہوگیا۔ طیارہ گزر گیا اور ڈیک پر زخمیوں کی چیخیں اور آہیں رہ گئیں۔ البتہ لیفٹیننٹ گریبر کے احکام ابھی تک گونج رہے تھے۔ ادھر دوزر بیس ملی میٹر دہانے کی توپ سے مسلسل فائر کر رہا تھا۔ میں نے اس طیارے کو نشانہ بنانے کی ایک بار اور کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ طیارے نے پٹ کر غوطہ لگایا اور مشین گنوں کے دہانے ہمارے ان بچے کھچے ساتھیوں پر کھول دیے جو جان بچانے کے لیے سمندر میں کود گئے تھے اور تیر کر آبدوز سے دور دور ہٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پانچ منٹ سے بھی کم مدت میں دو طیاروں نے یُو بوٹ ۵۰۸ اور عملے کے بیشتر افراد ہلاک کر دیے تھے۔ دونوں طیارے جب واپس جا رہے تھے، تو لیفٹیننٹ گریبر کی آواز سنائی دی: "کریب، آبدوز کو خیرباد کہنے کے لیے تیار ہو جاؤ!" ظاہر ہے ان حالات میں اس کے سوا کوئی اور صورت بھی نہ تھی۔ دوزر اور گریبر بھی میرے ساتھ ڈیک کے جنگلے سے بندھی ہوئی رافٹ کھولنے میں مصروف تھے۔

اس وقت ہمیں ایک عجیب سے سناٹے کا احساس ہوا۔ آبدوز کے عملے میں ہم صرف تین آدمی زندہ باقی رہ گئے تھے، آبدوز ہچکولے کھا رہی تھی اور چاروں طرف خاموشی تھی۔ ہمارے باورچی کی لاش ڈیک پر سے پھسل کر یوں پانی میں جا پڑی جیسے کوئی بھیگی ہوئی مچھلی ہو۔ ڈیک کے عقبی حصے میں ہمارے ساتھیوں میں سے بارہ کی لاشیں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ دور فاصلے پر جہاں امریکی جہاز ڈوب رہا تھا اور ایک رافٹ پانی میں ڈول رہی تھی ٹینکر سے بچ جانے والے تینوں امریکی چپ چاپ اس میں بیٹھے ہوئے مدد کا انتظار کر رہے تھے۔ اس رافٹ کے ساتھ غالباً چپّو نہیں تھے۔

"ان کے بارے میں کیا سوچا ہے"؟ میں نے امریکیوں کی رافٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ گریبر اور دوزر نے گردن گھما کر ادھر دیکھا۔ دوزر تو صرف کندھے جھٹک کر خاموش رہا، لیکن گریبر نے فیصلہ کن انداز میں مجھ سے کہا: "ابھی جنگ جاری ہے کریب، جاؤ نیچے کیبن سے ریوالور نکال لاؤ۔" میں جانے کو مڑا، تو دوزر نے یاد دلایا: "اور راشن وغیرہ کے ڈبے بھی ضرور نکال لانا۔"

آبدوز میں پانی بھر رہا تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ میں نے جلدی جلدی چار ریوالور کمر سے باندھے، راشن کے ڈبے جتنے بھی اٹھا سکتا تھا، اٹھا لیے اور فوراً واپس ڈیک پر آ گیا۔ اوپر پہنچ جانے کے بعد مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ ہماری تعداد تین سے چار ہو گئی ہے یہ چوتھا آدمی تار وپیڈ مین ہیلٹ رد ہمر تھا جو مجھ سے دھکا لگنے

کے باعث بے ہوش ہوگیا تھا۔ اس کا کندھا مشین گن کی گولیوں سے شدید زخمی تھا اور اوسان پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے۔

کوارٹر ماسٹر دوزر کی نظروں میں اس سارے المیے کا ذمے دار کمانڈر تھا۔ اس نے ترچھی نظروں سے زخمی رودہمر کو دیکھتے ہوئے گربیر سے کہا "اب تو ہم تعداد میں امریکیوں سے زیادہ ہیں، اور انہیں یقیناً ختم کرسکیں گے۔"

گربیر نے اس طنز کا کوئی جواب نہ دیا اور میں حیران تھا کہ آخر اس وقت یہ دونوں کیا منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔

ہم نے خاموشی سے اپنا سامانِ رسد رافٹ میں لادا، آبدوز کو خیرباد کہا اور اپنے امریکی دشمنوں کی جانب آہستہ آہستہ رافٹ کو کھینے لگے۔ اچانک مجھے سمندر کے پانی کے رنگ میں کچھ غیر معمولی بات نظر آئی۔ یہ پانی بحرِ اوقیانوس کے شفاف پانی سے مختلف، خاصا گدلا تھا اور سورج کی روشنی میں اس کی لہریں چمکتی بھی نہیں تھیں۔ میں نے جھک کر چلو میں تھوڑا سا پانی لیا، اسے چکھا، تو اس کا ذائقہ تازہ پانی کی مانند پایا۔ میں نے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا، ساحل نظروں سے اوجھل تھا، لیکن ہوا میں استوائی خطے کے گھنے جنگلوں کی خوشبو بسی تھی۔ میرے ذہن میں خیالات اور نتائج کی کڑیاں ایک دم ملتی چلی گئیں۔ مارے حیرت کے مجھے زبان پر بھی قابو نہ رہا اور میرے منہ سے بس اتنا نکلا: "یہ دریا ہے دوزر، گربیر، ہم سمندر میں ہیں نا، لیکن یہ تو دریا ہے دریا۔"

ہم یوبوٹ سے بمشکل بیس گز دور پہنچے ہوں گے کہ میری بے تکی باتیں سن کر لیفٹیننٹ گربیر اور دوزر نے چپو چلانے بند کر دیے اور عجیب نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لینے لگے۔ میں نے پہلی بار لیفٹیننٹ گربیر کو اس عہدے کے تحت اس کے نام سے مخاطب کیا تھا اور ان دونوں کو میری دماغی صحت پر شک ہو رہا تھا۔ ان کی نظروں کا مفہوم بھانپ کر میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا:

"نہیں، نہیں، میں بالکل تندرست اور ہوش و حواس میں ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ ہم نباتا کی بندرگاہ میں نہیں ہیں۔ یہ بندرگاہ دریائے کانگو کے دہانے پر واقع ہے اور ہماری رافٹ کے نیچے سمندر کا پانی نہیں بلکہ دریائے کانگو کا پانی ہے۔ یہ پانی بالکل میٹھا اور تازہ ہے۔ اب اگر ہم بلجین حکام کی نظروں سے بچ کر نباتا کے شمال میں کسی جگہ ساحل پر اُتر جائیں، تو آسانی سے دریا کے کنارے پہنچ کر اس کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف چل سکتے ہیں۔"

میں نے اپنے ساتھیوں کو پورا منصوبہ سمجھاتے ہوئے بتایا کہ اس جانب گھنے جنگلوں میں یقیناً راستہ مل جائے گا۔ یہ پورا علاقہ جنگلی قبائل سے آباد ہے، وسطی افریقہ کا فرانسیسی علاقہ جنرل رومیل نے محصور کر رکھا ہے اور اس کی فوج تک پہنچنے کے لیے ہمیں نو سو میل خشکی کا سفر طے کرنا ہوگا۔

میں نے اپنی یہ تقریر ختم کر کے دونوں افسروں کی طرف دادطلب نظروں سے دیکھا، انھوں نے چند لمحے سوچنے کے بعد مجھ سے پوچھا:

"مڈشپ مین کریب، ان امریکیوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"ہم انہیں قلی بنا کر ان سے اپنا سامانِ رسد اٹھوائیں گے۔" میں نے فوراً جواب دیا۔ "اور جب سامان ختم ہو جائے گا، تو انہیں گولی مار دیں گے۔"

دوزر کی مسکراہٹ سے میں سمجھ گیا کہ اسے میرا منصوبہ پسند آگیا ہے۔ اس عرصے میں رودہمر اپنے زخموں کے باعث مسلسل کراہ رہا تھا۔ دوزر نے تشویش کی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اچانک کسی خیال سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا "زخمی سمیت ان پانچ لاشوں کو بھی رافٹ میں ڈال لو۔" اس نے رافٹ کے قریب ہمارے ساتھیوں کی بہتی ہوئی لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اب ہم ان امریکیوں سے تعداد میں واقعی زیادہ ہو جائیں گے۔"

ہم سب نے جلدی جلدی پانی سے لاشیں سمیٹ کر رافٹ میں ڈال لیں اور لاشیں اٹھاتے ہوئے کچھ ایسا انداز اختیار کیا کہ دور فاصلے سے امریکیوں نے یہی جانا ہوگا کہ سمندر میں تیرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی جانیں بچا رہے ہیں۔ رو ہم بے چارے کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس پر نیم غنودگی طاری تھی اور اس نے ایک بار آنکھیں کھول کر پوچھا بھی: "یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" لیکن ہم اتنے مصروف تھے کہ کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔

ہم نے تمام لاشوں کو رافٹ کے کنارے کے ساتھ ساتھ اس طرح بٹھا دیا گویا وہ زندہ انسان ہوں۔ اس کے بعد ان چار ریوالوروں میں تین ریوالور جو میں کیبن سے نکال لایا تھا، مُردوں کے ہاتھوں میں تھما کر ان کا رخ امریکی رافٹ کی جانب کر دیا۔ ان لاشوں کے زخموں سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا، لیکن فاصلے سے اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اب دوزر ایک ریوالور تھام کر تیار ہو گیا۔ اور ہم نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنی رافٹ کو امریکیوں کی جانب کھینا شروع کر دیا۔

ہم جب امریکیوں سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر پہنچ گئے تو گریبر نے مجھے حکم دیا: "ان سے بات کرو۔" میں چپو چھوڑ کر کھڑا ہوا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ کے گرد پیالہ سا بنا کر پوری قوت سے چیخا:

"امریکیو، ہاتھ اوپر اٹھاؤ"

دوسری طرف سے جب کوئی جواب نہ آیا، تو میں نے پلٹ کر گریبر کی طرف دیکھا، لیکن اس نے ہمیں مزید ہدایت دینے کے بجائے دوزر کو چپو چلانے کا اشارہ کیا تاہم امریکی رافٹ کے اور قریب ہو جائیں۔

پچاس گز کے فاصلے سے مجھے امریکیوں کے چہرے صاف دکھائی دینے لگے۔ ان میں سے ایک سرخ و سفید اور نہایت محتمند تھا، دوسرا گریبر کی طرح پتلا اور گہرے رنگ کا، اور تیسرا بحریہ کی وردی میں ملبوس تھا۔ تینوں امریکی خاموشی سے ہماری طرف تک رہے تھے، میں نے ایک بار پھر بلند آواز سے انہیں خبردار کیا:

"ہم تعداد میں تم سے زیادہ ہیں!"

میری اس تنبیہ کے جواب میں موٹے امریکی نے فوراً گالی دی اور ریوالور اٹھا کر ہماری طرف فائر کر دیا۔ گولی سنسناتی ہوئی ہمارے سروں پر سے گزر گئی۔ میں بچاؤ کے لیے فوراً دبک کر نیچے ہو گیا۔ اس نے دوسرا فائر کیا اور اس بار شمی کی لاش نشانہ بنی، گولی اس کے ماتھے پر لگی اور جھٹکے سے لاش پیچھے کو لڑھک گئی۔ موٹے امریکی نے خوشی سے ایک نعرہ بلند کیا اور ادھر گریبر نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی، لیکن اس کی کوئی گولی نشانے پر نہ لگی۔

اس مضحکہ خیز جنگ کا نہ جانے کتنا خوف ناک انجام ہوتا، لیکن اسی لمحے پستول چلانے والے امریکی کو اس کے دونوں ساتھیوں نے ٹانگوں سے پکڑ کر زبردستی بٹھا دیا۔ ہم تک اب ان کی آواز صاف پہنچ رہی تھی۔ دُبلا امریکی اس موٹے امریکی کو سمجھا رہا تھا: "دیکھتے نہیں، موران! کمبختوں کی تعداد ہم سے بہت زیادہ ہے؟"

اس دوران میں ہماری رافٹ اور قریب پہنچ چکی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ امریکیوں کے پاس صرف ایک ریوالور ہے۔ گریبر نے اس موٹے امریکی سے جس کا نام موران تھا کہا کہ وہ اپنا ریوالور سمندر میں پھینک دے۔ موران نے پھینک دیا، تو پھر ہم اپنی رافٹ کو آگے کھینے لگے اور جس وقت ہم اپنی "مُردہ فوج" کو واپس سمندر میں پھینک رہے تھے تو تینوں امریکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ موران نے اس امریکی کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا جس نے ہماری تعداد کا خوف دلا کر لڑائی بند کرنے کا مشورہ دیا تھا اور ان نے بڑبڑاتے ہوئے جو گالیاں دیں وہ بھی ہم نے سنیں اور ہمیں بڑا لطف آیا۔ ہم اپنے کام سے فارغ ہو چکے تھے اور تینوں امریکی، جو اب ہمارے قیدی تھے ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے اپنی رافٹ میں کھڑے تھے۔ بحریہ کی وردی میں ملبوس امریکی مسلسل تمباکو چبا رہا تھا۔

سب سے پہلے وہی ہم سے مخاطب ہوا: "میرا نام کولی کولٹن ہے اور تم سب کون ہو؟"

لیفٹیننٹ گریر اس قیدی کی بدتمیزی پر ابھی غصے کا اظہار بھی نہ کر پایا تھا کہ ایک بڑی عجیب سی آواز سنائی دی، ہم سب نے پلٹ کر دیکھا۔ تقریباً پچھتر گز کے فاصلے پر بھاری بھرکم امریکی ٹینکر آخری سانس لے رہا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ پانی میں ڈوب چکا تھا اور ٹینکر کا پچھلا حصہ اب آہستہ آہستہ پانی میں غائب ہو رہا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پورا ٹینکر اور اس کے شعلے پانی کی آغوش میں گم ہو گئے۔

سطح آب پر ایک چھوٹا سا بھنور بنا اور ٹینکر کے چند ٹوٹے پھوٹے حصے اور کچھ خالی کشتیاں، وہاں ہچکولے کھانے لگیں۔ امریکی ٹینکر کے ڈوب جانے کے صرف تیس سیکنڈ بعد دوسری جانب ہماری یُو بوٹ بھی غرق ہو گئی، وہاں پانی کی سطح پر صرف بلبلے تھے۔

"چلو خاتمہ بالخیر ہوا!" امریکی قیدی کولٹن نے تمباکو کی پیک سمندر میں تھوکتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کا خیال غلط تھا۔ یہ خاتمہ نہیں تھا بلکہ اس مقام پر موجود ہم ساتوں افراد کی زندگی میں ایک انتہائی عجیب و غریب تجربے کی ابتدا تھی۔

اسی دن، دو اکتوبر ۱۹۴۲ء شام کو پانچ بجے افریقہ کے جنگلوں میں ہمارے اس عجیب و غریب سفر کا آغاز ہوا جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بلجیئن کانگو کی بندرگاہ نبانا سے دس میل شمال کی جانب ساحل تک ہم اپنی رافٹ میں گئے۔ قیدیوں کی رافٹ ہم سے بیس فٹ آگے تھی۔ رافٹ کھینے کے لیے ہم نے ان قیدیوں کو اپنے چپوؤں میں سے دو چپو دے دیے تھے۔ دوزر اور میں باری باری پستول تھام کر قیدیوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ گریر نے اس دوران میں قیدیوں سے چھینے ہوئے کاغذات کا مطالعہ کیا۔ ان کاغذات سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ تینوں امریکی ٹینکر پر ملاحوں میں شامل تھے۔ اور امریکہ کی مختلف ریاستوں کے باشندے تھے۔ موران اور کولٹن کا نام ہمیں پہلے معلوم ہو گیا تھا۔ تیسرے قیدی ایڈورڈ گرنفلڈ کے بارے میں اس کے کاغذات سے یہ بھی پتا چلا کہ وہ یہودی ہے۔

گریر کا خیال تھا کہ ساحل پر پہنچتے ہی اس یہودی کو گولی مار دی جائے لیکن میں نے اس کی رائے سے اختلاف کیا: "یہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے یقیناً کمزور نہیں اور ہمارے لیے خاصا وزن اٹھائے گا۔" گریر کی سمجھ میں بات آگئی اور اس نے یہ کہہ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا: "بہرحال جب بھی ان تینوں کو ہلاک کرنے کا وقت آیا، یہ یہودی سب سے پہلے گولی کا نشانہ بنایا جائے گا۔"

ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہمیں ایک اور سنگین مسئلے کا حل سوچنا تھا، اور وہ مسئلہ تھا، تارپیڈو مین روہمر کا جو رافٹ میں بے ہوش پڑا تھا۔ رافٹ کو لاشوں سے خالی کرتے ہوئے دوزر نے اسے ایک بار دیکھا اور کہا: "کیا اسے بھی پھینک دیں؟"

یہ بڑا عجیب وقت تھا، ہمیں اس بات کا احساس تھا کہ جنگل میں قیدیوں پر پہرہ دینے کے ساتھ ساتھ ایک زخمی کو سنبھالنا کس قدر مشکل ہوگا، لیکن دوسری طرف یہ بھی احساس تھا کہ روہمر ابھی زندہ ہے اور ہمارا ساتھی ہے۔ وہ میرے ساتھ اکیڈمی میں بھی رہ چکا تھا اور میں کسی قیمت پر اسے سمندر کی لہروں کے حوالے کرنے کو تیار نہ تھا۔ بالآخر ہم سب نے اسے اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ امریکی ٹینکر کی مدد کے لیے کوئی جہاز فوری طور پر وہاں نہ پہنچا اور جب ہماری رافٹ ساحل پہ جا لگی، تو اس وقت بھی ہمیں کسی نے وہاں اترتے نہیں دیکھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ سفید بھربھری ریت پر کہیں کہیں ہم نے قدموں کے نشان دیکھے، تاہم کسی آدمی کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ اور ساحل سے پچاس گز دور گھنے جنگلوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔

ہم لوگ ریوالور سنبھالے ابھی تک اپنے قیدیوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ موٹے امریکی موران نے گردن گھما کر ہماری جانب

دیکھا اور اُکتا کر کہنے لگا: "ٹھیک ہے اب ہم تمہارے قیدی ہیں، لیکن آخر تم ہمیں لے کر کہاں جا رہے ہو؟"

چونکہ اپنے ساتھیوں میں انگریزی صرف میں ہی بول سکتا تھا، اس لیے گریبر نے مجھے اشارہ کیا کہ میں موران کو سمجھا دوں ؛ چنانچہ میں نے اسے بتایا کہ ہم ملک کے اندرونی حصے تک پہنچنا چاہتے ہیں اور پھر جنگل کی طرف اشارہ کر کے قیدیوں سے کہا: "تمہیں ہمارا سامان اٹھا کر ساتھ ساتھ چلنا ہوگا۔"

کولٹن اس بات پر ہنسنے لگا، لیکن تیسرے قیدی گرنفلڈ کی نظریں میرے ریوالور پر تھیں، وہ غالباً بھانپ گیا تھا کہ ہم ان سے کیا سلوک کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

پہلے ہم نے اپنی اور قیدیوں کی رافٹ کو ساحل سے پرے جنگل میں چھپانے کا بندوبست کیا۔ اس کے بعد قیدیوں سے اپنا سامان اٹھوایا اور جنگل میں گھس گئے۔ خشکی پر پہنچنے کے بعد روہمر کو کچھ ہوش آگیا تھا۔ ہم اسے سہارا دیکر اپنے ساتھ لے چلے۔ اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہماری شکلیں پہچان کر اس نے ہمارے نام بھی لیے اور حیرت سے سامنے دیکھکر بولا: "یہ کیا، جنگل"؟

یہ افریقہ کا جنگل تھا جس میں سفر تو کیا ہم اپنے آپ کو گھسیٹ رہے تھے۔ دس دن تک ہم نے کوئی کھلی جگہ نہ دیکھی، ہر طرف اونچے اونچے درخت تھے۔ جھاڑ جھنکار، عجیب وغریب کیڑے مکوڑے اور شور مچانے والے پرندے ــــ اس دس دن کے سفر میں ہم تشیلا، نوری، لیوپولڈ ویل اور برازیل کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور مسلسل دریائے کانگو کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ جب تمام بندرگاہیں اور آبادیاں پیچھے رہ جائیں تو دریا کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا جائے، تاکہ ہم پکڑے نہ جائیں، کبھی کبھی ہمیں جنگل میں پگڈنڈیاں بھی مل جاتی تھیں، ہم نے انہیں استعمال نہیں کیا، بلکہ گھنی جھاڑیوں میں خود راستہ بنا کر آگے بڑھے۔ جب جھاڑیوں کی خاردار شاخیں کپڑوں میں الجھتیں اور زخمی کرتیں تو قیدی ہمیں کوسنے لگتے، قیدیوں کا غصہ ہمارے لیے خطرے کا الارم ہوتا اور ہم مزید چوکنے ہو جاتے۔ درختوں پر پھدکتے اور شور مچاتے ہوئے طوطوں، ہمارے جسموں پر رینگنے والے کیڑے مکوڑوں اور مچھروں کے باعث نہ دن میں آرام ملتا اور نہ ہم رات کو پوری نیند سو سکتے تھے۔

ایسی ہی ایک رات کو جب میں روہمر کو ٹین کے ایک ڈبے سے پانی پلا رہا تھا اور گریبر اور روزر امریکی قیدیوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ پاؤں باندھنے پر مجبور کر رہے تھے، تو موران نے جھلا کر کہا:

"اس علاقہ میں کہیں غیر جانب دار بلجیم کی حکومت کی عملداری بھی ہے؟ آخر تم لوگ ہمیں اس حکومت کے حوالے کیوں نہیں کر دیتے"؟

لیکن مصیبت یہ تھی کہ ہمیں ان قیدیوں کی ضرورت نہ ہوتی، تب بھی ہم انہیں اس ڈر سے نہیں چھوڑ سکتے تھے کہ مبادا دشمن ہمارا پیچھا شروع کر دے۔ جرمنی میں ہمیں یہ اطلاعات بھی مل چکی تھیں کہ بلجیین کانگو کی سیاسی صورتِ حال بڑی پیچیدہ ہے۔ چنانچہ ہم امریکی قیدیوں کے غصے اور جھنجھلاہٹ کے جواب میں خاموش ہی رہے۔

● اکتوبر ۱۹۴۲ء میں کانگو میں بلجیم کی فوجیں پوری طرح اتحادیوں کے ساتھ تھیں ــــ اگر جرمن اپنے امریکی قیدیوں کو رہا کر دیتے تو بلجیین کانگو کی حکومت آسانی سے ان جرمنوں کو گرفتار کر لیتی اور پھر جرمنوں کو اس بات کا قطعی علم نہ تھا کہ جنرل رومیل کی شکست کے بعد اکتوبر ۱۹۴۲ء کے آخر تک افریقہ میں نازی مزاحمت بالکل ختم ہو چکی تھی۔

۱۲ اکتوبر کو بولیوبو کی بندرگاہ سے تقریباً ۸ میل آگے نکل کر

ہم نے راستہ تبدیل کیا۔ بے خوابی، تھکن اور زخموں سے ہماری حالت خراب تھی، تازہ اور ٹھوس غذا کے لیے ہم ترس گئے تھے۔

بالآخر اگلے روز ہم درختوں اور جھاڑیوں میں سے راستہ بناتے ہوئے ذرا کھلی جگہ پر نکل آئے۔ گہرے سبز رنگ کی خودرو گھاس اور پیچ در پیچ پودوں کو سامنے سے ہٹاتے ہوئے جب ہم اور آگے بڑھے، تو دریائے کانگو ہمارے سامنے تھا۔ یہ دریا اس دریا کی مانند نہ تھا جو ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ یہاں اس کی چوڑائی پچاس فٹ کے لگ بھگ تھی، پانی بھی چند فٹ سے زیادہ گہرا نہ تھا۔ آہستہ خرام گدلے پانی، سیاہ کیچڑ اور سطحِ آب پر بے شمار کنول کے پتے اور جھاڑ جھنکاڑ سے یہ دریا یوں لگتا تھا جیسے کسی برساتی جوہڑ کا پانی گزشتہ چھ مہینے سے سڑ رہا ہو۔

"اسے اچھی طرح دیکھ لو کریسی، کیا یہی وہ جگہ ہے جس کی تمہیں اتنے دن سے تلاش تھی؟" کولٹن نے اس سارے منظر کا جائزہ لیتے ہوئے حقارت سے کہا اور اپنے کندھے پر لدا ہوا سامان نیچے پٹخ کر گھاس پر بیٹھ گیا۔ گریبر نے اپنا ریوالور اس جانب گھما کر اسے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا، لیکن کولٹن گھاس کا ایک ٹکڑا منہ میں دبائے اسے یوں تکتا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اس مقام پر دریا سے مچھلی وغیرہ پکڑنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اپنے سفر کے منصوبے کے مطابق، جیسا میں نے سوچا تھا، دریا اس کے لیے عام مناسب تھا۔ ہم اس کے کنارے کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بآسانی ۳۰۰ میل سفر کر سکتے تھے۔

شام کے چار بج چکے تھے۔ ڈھلتے سورج کی پیلی پیلی دھوپ میں سائے طویل ہوتے جا رہے تھے اور جنگل کی نمی سے بوجھل ہوا بالکل ساکن تھی۔ مجھے اس وقت سخت بھوک لگ رہی تھی، لیکن یوبوٹ سے لائی ہوئی باسی غذا کے تصور ہی سے جی گھبراتا تھا۔ آخر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دریا کے کنارے کنارے ٹہلنے لگا۔ اچانک میری نظر عین کنارے پر پانی کی سطح پر سے صرف چند انچ نیچے ایک مچھلی پر پڑی اور مچھلی بھی کوئی چھوٹی سی نہیں، پورے پانچ فٹ لمبی تھی۔ میرے منہ میں پانی بھر آیا اور فوراً پکارا: "ووزرا، گریبر، آج مچھلی کا ڈنر ہوگا، بہت بڑی مچھلی ہے کہو تو گولی مار دوں؟"

ووزرا اور گریبر دونوں اپنے ریوالور سنبھالے گھاس پر لیٹے ہوئے امریکیوں پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ دونوں نے بیک آواز جواب دیا: "ہاں، ہاں کیوں نہیں، مچھلی ہے تو مار لو۔"

میں نے چپکے سے ریوالور نکال کر پانی کی سطح پر مچھلی کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ جب تک مچھلی تڑپتی پھڑکتی رہی، گولی کی آواز جنگل میں گونجتی رہی۔

ووزرا اور گریبر تینوں امریکیوں کو دریا کے کنارے تک لائے اور ہم نے ان سے دو سو پونڈ وزنی مچھلی پانی سے نکلوائی۔ یوبوٹ سے لائے ہوئے سامان میں ایک چاقو بھی تھا۔ میں نے وہ چاقو کولٹن کے حوالے کیا اور مچھلی صاف کرنے کا حکم دیا۔

سب کو بھوک نے ستایا ہوا تھا۔ جلدی جلدی مچھلی صاف کی گئی اور ساڑھے پانچ بجے تک ہم نے اسے خشک پتوں اور ٹہنیوں کے الاؤ پر بھون کر کھانا بھی شروع کر دیا۔ مچھلی کے کچے پکے گوشت کو ہاتھوں سے نوچتے ہوئے گریبر نے کہا: "میرا خیال ہے کہ یہ مچھلی بہت عمدہ ہے اور ہمیں اس دریا سے آئندہ بھی ایسی ہی مچھلیاں ملتی رہیں گی۔ اس صورت میں ہمیں سفر کے دوران میں اس قدر سامانِ خوراک ساتھ ساتھ اٹھا کر چلنے کی ضرورت بھی نہ رہے گی، لہٰذا اب اس یہودی کو گولی مار دینی چاہیے۔"

امریکی قیدی ہم سے کوئی تیس فٹ کے فاصلے پر بیٹھے تھے، گرنفلڈ کے کان میں لفظِ یہودی پڑا، تو اس نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔

میں نے اس بار گریبر کی مخالفت نہیں کی، ایک مچھلی کو میں گولی مار چکا تھا۔ میں نے سوچا ایک یہودی کو بھی اسی طرح گولی ماری

جا سکتی ہے۔ میں نے ریوالور اٹھایا اور قیدیوں کی طرف بڑھا۔ لیکن کولٹن کی مسکراہٹ دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا، وہ مجھ پر نہیں، بلکہ میرے عقب میں کسی کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور اسی طرح مجھ سے آنکھ ملائے بغیر اس نے بڑے سکون سے مجھے مخاطب کیا:

"مسٹر کربیبسی، میرا خیال ہے اب تم یہ ریوالور استعمال نہیں کر سکو گے ذرا پلٹ کر دیکھو۔" کولٹن نے یہ کہتے ہوئے چاقو سے میرے پیچھے اشارہ کیا۔

مجھے معلوم تھا کہ گریر اور دوزر میرے پیچھے کھڑے ہیں اور اگر کولٹن مجھے دھوکہ دے کر حملہ کرنے کی کوشش کرے، تو وہ دونوں صورتِ حال سے نمٹ سکتے ہیں، چنانچہ میں نے کولٹن کے کہنے پر پیچھے پلٹ کر دیکھا، کولٹن نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ دوزر اور گریر کے عقب میں جنگل کے کنارے پر ایک چار فٹ کا افریقی بونا کھڑا تھا۔ اس نے اپنی کمان کے چلّے پر تیر چڑھا رکھا تھا اور تیر کا رُخ ہماری جانب تھا۔ میں نے فوراً گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا، تو معلوم ہوا کہ ہم پوری طرح گھیرے میں آچکے ہیں تقریباً دو سو بونے کمانوں پر تیر چڑھائے ہماری طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔

دوزر اور گریر نے بھی بونوں کو دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے فوراً پلٹ کر آگے بڑھنے والے بونوں کی جانب ریوالور تان لیے۔ بجھے ہوئے الاؤ کے قریب بیٹھے ہوئے موران نے یہ صورتِ حال دیکھی، تو چلّا اٹھا: "خدا کے لیے اب تو مجھے ایک ریوالور دے دو۔" اس کی آواز میں غصہ بھی تھا اور عاجزی بھی۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر لپک کر چوتھا ریوالور اٹھا کر اس کی طرف اچھال دیا۔

موران نے سب سے پہلے اس بونے کو گولی کا نشانہ بنایا جو ہم سے قریب پہنچ چکا تھا وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا، تو ایک اور بونا اسے پھلانگ کر آگے آگیا۔

دوزر، گریر اور میں نے تڑاتڑ گولیاں چلانی شروع کر دیں، وہ گولیاں کھا کھا کر گرتے تھے، تو ان کی جگہ اور بونے پہنچ جاتے، لیکن ان میں سے کسی نے ہم پر تیر نہیں چلایا، غالباً وہ سب ہمیں چاروں طرف سے گھیر کر زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ کولٹن سے کئی بونے لپٹے ہوئے تھے اور وہ انہیں بھاری بھاری بھرکم جسم پر سے جھٹک جھٹک کر دور پھینک رہا تھا۔ پھر ایک بونے نے اچک کر اس کا گلا دبانے کی کوشش کی اور کولٹن نے اسی چاقو سے اس کا پیٹ چیر ڈالا جس سے تھوڑی دیر پہلے اس نے دوسری یونڈوزنی مچھلی کے ٹکڑے کئے تھے۔

ہمارے چاروں طرف بونوں کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا تھا تین بونے لپک کر آگے بڑھے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ میں نے تینوں کو باری باری پکڑ کر دور پھینک دیا، لیکن چوتھے بونے نے آگے بڑھ کر میری کنپٹی پر اتنی زور سے پتھر مارا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ذرا ہوش آیا، تو محسوس ہوا کہ میں اس وقت جنگل میں چل رہا ہوں، میرے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور پیٹھ پر کبھی کبھی بھالے کی انی محسوس ہوتی تھی۔ میں نیم بے ہوشی کی حالت میں جانے کب سے یونہی چل رہا تھا۔ اب میں پوری طرح ہوش میں آچکا تھا۔ میرے چاروں طرف تقریباً دو درجن بونے تھے جن کی مسلسل باتوں اور بار بار ہنسنے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بے حد خوش ہیں، تھوڑی دیر اسی طرح جنگل میں چلنے کے بعد ہم پھر دریا کے قریب نکل آئے اور کنارے کنارے چلنے لگے۔ ایک موڑ پر پہنچ کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ میرے سب ساتھی زندہ ہیں اور قیدی بنا لیے گئے تھے حتیٰ کہ روہم کو بھی چار بونے گھسیٹتے اور سہارا دیتے ہوئے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ ایک مقام پر دریا کچھ چوڑا تھا اور پانی بھی وہاں کچھ زیادہ تھا۔ دریا کے کنارے درخت کے کھوکھلے تنوں سے بنائی ہوئی چند کشتیاں پڑی تھیں۔ ہمیں ان کشتیوں میں لاد کر دریا پار کیا گیا اور اس کے بعد پھر گھنے جنگلوں میں سفر شروع ہو گیا۔ سورج ڈوب گیا تھا اور اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

کئی میل پیدل چلنے کے بعد ہم افریقیوں کے ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ گاؤں تقریباً بیس جھونپڑیوں پر مشتمل تھا لیکن یہاں کی خاص چیز جس نے ہمیں متوجہ کیا، وہ گاؤں سے باہر احاطہ تھا۔ اس احاطے کے چاروں طرف درختوں کی لمبی لمبی شاخیں گاڑ کر انہیں جنگلی پودوں اور رسّی کی مانند بیلوں کے ذریعے آپس میں مضبوطی سے باندھ دیا گیا تھا۔ احاطے میں ایک جانب سات چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں تھیں اور ان کے سامنے ایک بھاری سی میز اور درخت کے تنوں سے بنائی ہوئی کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ بونوں نے ہمیں جانوروں کی طرح اس احاطے میں دھکیل دیا۔ وہ بار بار گردن گھما کر ہماری جانب دیکھ رہے تھے اور سب نے اچانک دھیمی آواز میں بولنا شروع کر دیا تھا۔ غالباً وہ اپنی بلند آوازوں سے سوئے ہوئے گاؤں کو جگانا نہیں چاہتے تھے۔

میں نے سوچا کہ شاید ہمارے شور مچانے پر گاؤں سے ہماری مدد کو کوئی پہنچ جائے، دماغ میں یہ خیال آتے ہی پہلے میں نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو رسّی کی گرہ سے آزاد کرنے کی ناکام کوشش کی اور اس کے بعد چلّانا شروع کیا، لیکن میری آواز حلق ہی میں اٹک کر رہ گئی۔ عین اسی وقت ایک بونے نے آگے بڑھ کر میرے سر پر کوئی چیز ماری اور میں پھر بے ہوش ہو گیا۔

صبح افریقی طوطوں کے شور سے میری آنکھ کھلی، تو میں نے اپنے آپ کو جھونپڑی میں ایک موٹی سی چٹائی پر پڑے پایا۔ میرے ہاتھ ابھی تک بندھے ہوئے تھے اور پیاس کی وجہ سے منہ خشک تھا۔ چند لمحے بعد تین بونے میری جھونپڑی میں داخل ہوئے اور مجھے وہاں سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ میں خوف سے لڑکھڑاتا ہوا احاطے میں داخل ہوا۔ دوزررا، گریبرا موران، کولسن اور گرنفلڈ پہلے ہی میز کے چاروں طرف کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ گاؤں کی جھونپڑیوں سے عام قد و قامت کے نیگرو نکل نکل کر احاطے کے گرد جمع ہو رہے تھے۔

"آخر یہ کیا مصیبت ہے؟" موران زیر لب بڑبڑایا۔ عین اسی لمحے ہم سب کی نظریں اس نیگرو کی طرف اٹھ گئیں جو گاؤں کی سب سے بڑی جھونپڑی سے نکل کر احاطے کی طرف آ رہا تھا۔ اس زبردست قامت کا نیگرو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس سیاہ فام دیو کا قد چھ فٹ چار انچ کے قریب تھا اور وزن ڈھائی سو پونڈ سے کم نہ ہوگا۔ اس کے پیٹ پر چاقو کے زخموں کے نشانوں سے ڈھال کی تصویر بنی ہوئی تھی اور جسم پر ایک لنگوٹی اور گلے میں کسی جانور کے دانتوں کی لڑی کے سوا کوئی لباس نہ تھا، لیکن جس چیز پر ہمیں حیرت ہوئی وہ اس کی روپہلی فریم کی عینک اور دانتوں میں دبا ہوا ایک لمبا سنہری رنگ کا منقش سگریٹ ہولڈر تھا۔

وہ اپنی جھونپڑی سے نکل کر سیدھا احاطے کی طرف آیا اور باہر کے دروازے پر پہنچ کر اس نے خاموشی سے ایک ہاتھ بلند کیا۔ یہ ایک اشارہ تھا جسے دیکھتے ہی احاطے کے ارد گرد جمع ہونے والے لوگ فوراً وہاں سے کھسک گئے۔ اس کے بعد وہ نیگرو احاطے میں داخل ہوا اور ہماری میز کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

"گڈ مارننگ سار، کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟"

نیگرو نے انگریزی میں ہمیں مخاطب کیا، لیکن ہم میں سے کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا، چنانچہ نیگرو کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی اور اس نے بلجیمی سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا: "بیٹھوں گا تو میں ضرور۔" اور یہ کہہ کر وہ دھم سے ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد پہلے اس نے ایک لمبا سا سانس لیا، ہمارے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے مسکرایا: "سار! میرے خیال میں یہ کوئی اچھی جگہ نہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

دوزررا انگریزی بالکل نہیں سمجھتا تھا۔ وہ چڑ کر جرمن میں کچھ کہنے لگا، تو میں نے میز کے نیچے سے اس کے پاؤں پر ٹھوکر مار کر اسے بولنے سے منع کر دیا۔

نیگرو، جو وزر سے کچھ سننے کے لیے بڑی مشتاق نظروں سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس کی خاموشی پر جھنجھلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد جب اس کا غصہ کم ہوا، تو پھر وہ مسکرا کر بولا: "میرا نام انٹوئن ایم رنا ہے۔ میں انگریزی زبان بڑی اچھی طرح بول سکتا ہوں اور عوام کی زبان لنگالا بھی بول لیتا ہوں لیکن افسوس کہ آپ لوگ وہ زبان نہیں سمجھتے۔" امریکیوں نے مجھے میز کے نیچے سے وزر کو ٹھوکر مارتے دیکھ لیا تھا اور وہ میرے اشارے کا مطلب سمجھنے کے بعد بالکل خاموش تھے۔ ایم رنا اس صورت حال سے کچھ پریشان سا تھا، وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا: "رات جب میرے بونے آپ لوگوں کو پکڑ کر لا رہے تھے، تو میں نے آپ سب کو دیکھ لیا تھا لیکن میں اپنی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

ہم نے اس بار بھی جب اس کی بات کا جواب نہ دیا تو اس نے جھلا کر زور سے میز پر ہاتھ مارا اور پھر اپنا غصہ بڑی مشکل سے ضبط کرتے ہوئے بولا "معلوم ہوتا ہے آپ لوگ مجھے پاگل کر کے چھوڑیں گے۔ اچھا تو یونہی سہی، میں ہی بولتا ہوں۔" اس کے بعد وہ کچھ سوچ کر کہنے لگا: "میری عمر اٹھائیس سال ہے۔" ہم اب بھی چپ رہے۔

"تو کیا تم نہیں بولو گے؟" ایم رنا گرج کر بولا، اور ایک دم کھڑے ہو کر خوفناک چیخ ماری کہ سارا جنگل گونج اٹھا۔ اسی لمحے احاطے کے چاروں طرف بونوں کے سر ابھرنے لگے۔ سب کے ہاتھوں میں کمانیں تھیں اور تیروں کا رخ ہماری جانب تھا۔ ان بونوں کے علاوہ گاؤں کی تمام جھونپڑیوں سے چیونٹیوں کی طرح نیگرو نکل نکل کر احاطے کی طرف بڑھنے لگے، سب کے ہاتھوں میں بھالے تھے اور تیز تیز بڑی خاموشی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی تعداد چار سو کے لگ بھگ تھی اور سب کے سب ہم سے صرف بیس فٹ کے فاصلے پر احاطے کے چاروں طرف آ کر خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔

میں نے یہ منظر دیکھ کر کچھ سوچا اور کھنکار کر بولا: "میری عمر اکیس سال ہے۔" اس کے بعد باری باری ہم سب نے اپنی عمر بتائی۔ وزر ہم سب میں بڑا تھا، اس کی عمر تیس سال تھی، گریبر، موران اور رکولٹن انتیس سال کے تھے اور گرنفلڈ کی عمر چھبیس سال تھی۔

ہمیں بولتا دیکھ کر ایم رنا کی باچھیں کھل گئیں: "خوب، خوب، اس کا مطلب ہے کہ ہم سب ایک ہی عمر اور تقریباً ایک ہی نسل کے لوگ ہیں اور ہم سب کے سوچنے کا انداز بھی یقیناً ایک جیسا ہو گا۔"

اس کے بعد وہ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ایک ایک لفظ پر رکا اور میز پر مکا مارتے ہوئے بولا: "اگر میں آپ کو یہ بتا دوں کہ افریقی نوجوانوں میں بلجیم، فرانس اور دوسری سامراجی طاقتوں سے آزادی حاصل کرنے کی تحریک ابھر رہی ہے، تو آپ میری اس بات کا مفہوم بخوبی سمجھ لیں گے، ہم ان تمام لوگوں کے خلاف ہیں جو ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں۔ میرا اشارہ بولیبا کے مشنری فادر، انٹوئن کی جانب ہے۔ جس کی تعلیمات ایک بوڑھے کی تعلیمات ہیں۔ فادر انٹوئن اور اس کے شیطانی اسکول کی ہمیں مذمت کرنی چاہیے اسلئے کہ ۔ ۔ ۔ ۔"

یہاں گریبر نے اس کی بات کاٹ دی، گریبر انگریزی کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکتا تھا، لیکن وہ چاروں طرف جمع نیگروں اور بونوں کے تیور دیکھ کر پریشان تھا اور اپنی جرمن زبان میں بڑبڑا رہا تھا۔ "ہمیں یہاں سے نکل بھاگنا چاہیے۔" ادھر موران اور وزر بھی یہی کچھ سوچ رہے تھے۔ ان دونوں نے لپک کر میز کے نیچے ہونے کی کوشش کی، تاکہ میز کو ایم رنا پر الٹ دیں لیکن اسی وقت بونوں نے تیر اور نیزے اپنے اوپر بلند کیے۔ حصار بڑا سخت تھا۔ اور ہم سب کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، چنانچہ وزر اور موران نے ارادہ بدل

دیا اور پھر سیدھے ہو کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

ایم رنا ہماری ان حرکتوں کو نظر انداز کر کے مسلسل تقریر کر رہا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں، اس کے قبیلے کا نام بوجا تھا، اور بلو نے اس کے غلام تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ بوجا قبیلے کے لوگ بلجین حکّام کے خلاف بغاوت کر دیں، لیکن ذہین اور تعلیم یافتہ لیڈروں کی رہنمائی کے بغیر بغاوت کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ایم رنا نے خود بلو لیو با میں فادر اینٹونی کے سکول میں تعلیم حاصل کی تھی، لیکن فادر اینٹونی تو بلجین تھا، اس لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ بوجا قبائل کو بلجیم کی حکومت کے خلاف بغاوت کی تعلیم دیتا۔

ایم رنا نے یہ بھی بتایا کہ جس دن ہم جنگل میں داخل ہوئے تھے اسی دن اسے ہماری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ اگرچہ اس نے یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی، لیکن یہ بتاتے ہوئے اس کا سینہ فخر سے پھول گیا کہ مچھلی کو مارنے کے لیے جب ریوالور استعمال کیا گیا، تو اس کی آواز پر بلونوں نے ہمیں عین اسی مقام پر جا پکڑا۔ فادر اینٹونی ہمیں یہ فن کبھی نہیں سکھا سکتا۔

میں سوچ رہا تھا کہ ایم رنا آخر ہم سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ کیا ہم ہی وہ "ذہین اور تعلیم یافتہ لیڈر" ہوں گے جنہیں حکومت کے خلاف بغاوت میں بوجا قبائل کی رہنمائی کرنا پڑے گی۔

"تم جرمن ہو اور وہ تینوں امریکی ہیں"، ایم رنا نے غور سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے پھر بولنا شروع کیا۔ "لیکن یہ جنگ جو تم لڑ رہے ہو، آئندہ چار سال میں ختم ہو جائے گی اور پھر بس میری جنگ باقی رہ جائے گی۔ میری جنگ یعنی بوجا کی جنگ۔"

ایم رنا کی آنکھیں ایک آزاد اور شاندار مستقبل کے تصوّر سے چمک رہی تھیں، اچانک وہ پلٹا اور احاطے کے باہر کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف منہ کر کے لنگالا زبان میں بلند آواز سے کچھ کہا۔ چند لمحے انتظار کے بعد پچھلی صفوں سے بوجا قبیلے کی سات جوان لڑکیاں شرماتی اور ہنستی ہوئی آگے بڑھیں اور احاطے میں داخل ہو کر ہمارے قریب آ کھڑی ہوئیں۔

ایم رنا نے ہم سے نظریں ملائے بغیر مسکرا کر کہا:

"مجھے مجرّد لوگ پسند نہیں، میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ جوڑے بن کر رہیں۔"

یہ بات گرنفلڈ کی برداشت سے باہر تھی۔ اس نے باآوازِ بلند فریاد شروع کر دی: "او خدا، او میرے خدا!"

ایم رنا کو گرنفلڈ کا یہ احتجاج ناگوار گزرا، وہ تیزی سے پلٹا اور میز پر گھونسا مار کر گرجا: "سارا اب تو آپ لوگ میرا مقصد سمجھ گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کی اولاد اس قسم کی ہو کہ اسے بولیو با میں فادر اینٹونی کے سکول کی ضرورت نہ پڑے، ہم ان بچوں کو لندن، پیرس اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کے لیے بھیجیں گے۔ وہ بچے بڑے ہو کر آزادی پسند، ذہین اور پڑھے لکھے ہوں گے اور ہمارے قبیلے کے لوگوں کی رہنمائی کر سکیں گے۔"

ہم سب ایم رنا کے اس اچھوتے اور دور رازکار منصوبے پر ششدر رہ گئے، لیکن اس شخص سے بحث کر کے اسے قائل کرنا ناممکن تھا۔ پھر بھی مسلسل دو ہفتے تک ہم اسے مختلف دلائل سے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ اس کا منصوبہ قبیلے کے لیے مفید نہ ہوگا۔

روزانہ شام کو چھ بجے ایم رنا ہم سے ملاقات کے لیے آیا کرتا تھا۔ ایک دن ہم نے اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر افریقی بچے ہی پڑھ لکھ کر قیادت کے قابل ہو جائیں، تو وہ سفید یا دوغلی نسل کے بچوں سے یقیناً بہتر ثابت ہوں گے، ہو سکتا ہے قبیلے کے قدامت پسند لوگ ایسے لیڈروں کو قبول ہی نہ کریں جن کے خون میں سفید نسل کے خون کی آمیزش ہو، لیکن ایم رنا نے یہ دلیل بھی یہ کہہ کر رد کر دی کہ فادر اینٹونی بھی یہی کہتا تھا، لیکن وہ اکثر جھوٹ بولتا ہے، اس لیے اس کی بات کا کوئی اعتبار نہیں۔"

اس دوران میں وہ ساتوں لڑکیاں شام کو ٹوکریوں میں ہمارے کھانے کے لیے ہاتھی کا بھنا ہوا گوشت، کیلے اور افریقی سبزیاں لے کر پہنچ جاتیں۔ ہمارے ہاتھ ہر وقت بندھے رہتے تھے، اس لیے وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتیں۔ اگرچہ ساٹھ فٹ مربع کے احاطے میں ہمیں چہل قدمی کی اجازت مل گئی تھی، تاہم جان کے خوف سے ذہن کو اتنا سکون ہی نہ ملتا تھا کہ کچھ سوچ سکیں۔
ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ ایم رنا اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد ہم سب کو ہلاک کر دے گا۔ اور ہم میں سے کوئی بھی یہاں سے بچ کر نہ جا سکے گا۔ رودہمر کی بیماری سے ہم الگ پریشان تھے۔ امریکی قیدیوں سے دشمنی کا احساس ختم ہو گیا تھا اور اب ہم سب رودہمر کے بارے میں فکر مند تھے۔ وہ اپنی جھونپڑی میں صبح و شام نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہتا۔ اس کے زخم اگرچہ اتنی بُری حالت میں نہ تھے، تاہم جنگل میں سفر کرتے ہوئے وہ نیند کی ایسی بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اس پر ہر وقت غنودگی طاری رہنے لگی۔ ہم اپنے ایک ساتھی کو اس حالت میں چھوڑ کر فرار کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتے تھے۔
لیکن ایک دن جب ایم رنا نے دوسرے چوکیداروں کے علاوہ دن رات کے پہرے کے لیے چھ مزید چوکیدار احاطے کے چاروں طرف متعین کر دیے، تو فرار کی رہی سہی امیدیں بھی ختم ہو گئیں۔ یہ چھ چوکیدار دراصل چھ مخبوط الحواس بونے تھے جن کے پیروں میں لمبی رسیاں باندھ کر احاطے کے باہر اس طرح پابند کر دیا گیا تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر جا نہ سکیں، بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ جنگل کی کوئی نشہ آور گھاس کھلا کھلا کر ان کی ذہنی صلاحیتیں ختم کر دی گئیں تھیں۔ اور وہ ہم پر پہرہ دینے کے لیے اتنے سدھے ہوئے تھے جتنا کہ اچھی قسم کے پالتو کتے کو سدھایا جا سکتا ہے۔
اس مصوبت خانے میں وقت اور دن گزرنے کا احساس تقریباً ختم ہو چکا تھا، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اکتوبر کی تیس تاریخ تھی جب ایم رنا نے اپنے گھناؤنے منصوبہ کا ذکر کرنے کا فیصلہ کیا۔
اس دن شام کو نوجا لڑکیاں ہمیں کھانا کھلا کر واپس نہیں گئیں۔ اور ہمارے ہاتھ بھی رسیوں سے آزاد کر دیے گئے، ہمیں معلوم تھا کہ ایم رنا سے اس کے منصوبے میں تعاون کا مطلب کچھ عرصے بعد ہماری اپنی موت ہو گا، لیکن مکمل انکار اور فرار کے راستے بھی مسدود تھے۔ ادھر ایم رنا کو اپنے مقصد کی سچائی پر اس قدر یقین تھا کہ ہمارے ساتھ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے وہ کئی بار رو بھی پڑا۔ اس نے ایک مرتبہ ہمیں اپنے سینے سے لگا کر کہا:
"میری عمر اٹھائیس سال ہے۔ تمہاری سوچ، میری سوچ سے مختلف نہیں ہو سکتی، ہم سب ایک ہی نسل کے لوگ ہیں۔"
کچھ عرصے بعد ایک عجیب واقعہ ہوا جس سے ہمیں پتہ چلا کہ بونے ایم رنا کے غلام نہیں بلکہ ایم رنا سے اتنی ہی نفرت کرتے تھے، جتنی ـــ ہمیں اس سے نفرت ہو سکتی تھی، البتہ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کو ہم سے کیا دشمنی تھی۔ ہوا یوں کہ ایک روز لولے قبیلے کی ایک عورت ہمارے احاطے کے سامنے پہنچی اور اس نے وہاں ایک ڈرم میں کچھ جڑی بوٹیوں کو کوٹنا پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ عورت دن بھر اس کام میں مصروف رہی اور اس دوران میں ہمیں متوجہ کر کے اشاروں میں بار بار سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ جڑی بوٹیاں کھانے کے لیے ہیں اور بے حد لذیذ ہیں۔
شام کو جب ایم رنا ہم سے ملنے کے لیے آیا تو وہ کچھ پریشان سا تھا۔ اس نے اچٹتی نظر سے احاطے کے آس پاس کا جائزہ لیا اور ہم سے کہنے لگا:
"سارے بونے اگر کھانے کی کوئی چیز لے کر آئیں، تو آپ لوگ ہرگز نہ کھائیں۔ ایسی چیزوں سے معدہ خراب ہو جاتا ہے۔"
ہم لوگ ایم رنا کی اس بات سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکے تھے، ہم نے جب اس سے پوچھا کہ بونے ہمارے دشمن کیوں ہو گئے۔ تو وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ اس طرح ایم رنا کے پاس اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ تھا کہ جب بونے اس کے

—— غلام ہیں تو وہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی کام کرنے کی کیسے جرأت کر سکتے ہیں۔

تاہم اس رات، جیسا کہ ایم رنا نے کہا تھا، کچھ بونے واقعی چند پیالے ہاتھوں میں اٹھائے احاطے تک آئے، اور بڑے ادب سے جھک کر اور مسکراتے ہوئے ہمیں وہ پیالے پیش کر کے چلے گئے۔ ان پیالوں میں لئی کی طرح کوئی چیز گھوٹ پیس کر بھری گئی تھی۔ خوشبو اگرچہ اچھی تھی، لیکن ہم نے احتیاطاً اسے چکھے بغیر ایک طرف رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد اتفاق سے گاؤں کا ایک آوارہ کتا احاطے کے قریب آنکلا۔ میں نے جنگلے سے ہاتھ نکال کر اس کتے کو پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ ہمارے تھپکنے اور چمکارنے سے کتے کا خوف دور ہوا، تو ہم نے بونوں کے لائے ہوئے پیالوں میں سے ایک پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ کتے نے وہ غذا بڑی رغبت سے کھائی، لیکن چند منٹ بعد کتا لڑکھڑاتا ہوا گاؤں کی طرف چلا، تو چاند کی روشنی میں دیکھتے دیکھتے اس نے دو قلابازیاں کھائیں اور ٹھنڈا ہو گیا۔ ہمارا یہ تجربہ وہ بُوجا عورتیں نہ دیکھ سکیں جو اس وقت ہماری جھونپڑیوں میں —— چٹائیاں درست کرنے میں مصروف تھیں، چنانچہ ہم نے جلدی جلدی ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر تمام پیالوں کی زہریلی غذا اس میں ڈال کر دفن کر دی۔

ہمیں حیرت اس بات کی تھی کہ اس ایک واقعہ کے بعد بھی بونے روزانہ شام کو ہمارے لیے پیالوں میں وہی زہریلی غذا لاتے رہے اور ہمارے روز کے فرائض میں یہ کام بھی شامل ہو گیا کہ ہم وہ پیالے لے لیا کریں اور چپکے سے گڑھا کھود کر زہریلی غذا دفن کر دیا کریں۔ اس صورتِ حال سے ہمیں کم از کم یہ یقین تو ہو گیا کہ بونوں پر ایم رنا کا اتنا زبردست کنٹرول ہرگز نہیں جس کا وہ دعویٰ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ قریب ہی کوئی اور قبیلہ ہو جو ایم رنا کے قبیلے سے زیادہ طاقت ور ہو۔ اور ایم رنا کو یہ خطرہ ہو کہ اگر بونوں کو ناراض کر دیا، تو وہ اس قبیلے سے جا کر شکایت کر دیں گے۔

اکتوبر ختم ہو چکا تھا، جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے ہماری تکلیفوں اور خوف میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بوجا لڑکیوں سے جو ہم پر مسلط کر دی گئی تھیں، بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ ادھر ایم رنا ہماری سرگرمیوں سے پوری طرح واقف رہتا، اور روزانہ شام کو آ کر ہم سے بحث کیا کرتا۔ ایک دن اس نے ہمیں مقامی شراب پیش کی۔ ہم لوگ اپنی تکلیفیں بھول جانا چاہتے تھے، چنانچہ سب نے جی بھر کر پیاس بجھائی۔ نشے میں بدمست ہونے کے بعد ہم لوگ آپس ہی میں لڑ پڑے۔ میں اور یہودی گرنفلڈ جانے کس بات پر الجھے تھے، لیکن ہماری لڑائی کے دوران میں موران مجھے شاباش دے رہا تھا جب کہ گریر جو کبھی یہودی سے سخت نفرت کرتا تھا، میرے مقابلے میں گرنفلڈ کی مدد کر رہا تھا۔ ادھر احاطے میں ایم رنا یہ منظر دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ آخر ہمیں اپنی اس تذلیل کا احساس ہوا اور ہم نے فوراً لڑائی بند کر دی۔

بیمار اور مرتے ہوئے رو ہم سے قطع نظر ہم تینوں میں سب سے خراب حالت ووزر کی تھی۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنستی جا رہی تھیں، خوف نے اس کا ذہن ماؤف کر دیا تھا اور ایک دن جب اس نے بڑی لجاجت اور درد کے ساتھ مجھ سے اپنے ان سخت الفاظ کی معافی چاہی جو اس نے کبھی یُوٹ پر میرے لیے استعمال کیے تھے، تو مجھے اس کی اس بات پر حیرت کے علاوہ شرمندگی بھی ہوئی۔ اس رات ووزر نے بونوں کے لائے ہوئے پیالوں میں سے ایک پیالہ سنبھال کر جھونپڑی میں رکھ لیا اور رات کو جب اس کی جھونپڑی میں متعین بُوجا لڑکی نے چیخ ماری، تو ہم سمجھ گئے کہ ووزر مر چکا ہے۔

ووزر کی خودکشی کا ردِعمل بڑا عجیب تھا۔ صبح جب اس کی لاش احاطے میں لائی گئی، تو بونوں نے اسے اپنی کامیابی جان کر

خوشی سے ناچنا شروع کر دیا جب کہ ایم رنا نے اس حادثے پر صرف ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ہم محسوس کر رہے تھے کہ آخر کار یہی وقت ہم پر بھی ایک دن ضرور آئے گا۔ کولٹن کو اگرچہ ووزر کی موت پر افسوس ہوا لیکن اس کی حالت ہم سے مختلف تھی۔ ہم نے اسے کبھی زیادہ فکرمند نہیں دیکھا، وہ دن بھر احاطے کے جنگلے کے قریب بازوؤں پر ٹھوڑی رکھے الٹا پڑا رہتا۔ اس کی نظریں سامنے جنگل میں ایک بوجا لڑکے پر جمی رہتیں جو دن بھر ٹین کے ڈبے اور تاروں سے بنا ہوا ایک عجیب و غریب ساز ہاتھی دانت مار مار کر بجایا کرتا تھا۔ یہ ساز کیا تھا، شور پیدا کرنے کا ایک ذریعہ جس سے سارا جنگل گونجتا رہتا تھا اور ہم اس شور سے سخت عاجز آئے ہوئے تھے، لیکن کولٹن نہ صرف اسے دلچسپی سے سنا کرتا، بلکہ اس بوجا لڑکے کی اشاروں اشاروں میں تعریف کرتا اور اسے داد دیا کرتا۔ کولٹن کی اس حرکت پر یوں تو ہمیں غصہ آتا ہی تھا، لیکن موران نے تو ایک دن اسی بات پر کولٹن کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی، کولٹن نے جوابی حملہ کرنے کے بجائے جھنجھلا کر صرف اتنا کہا:

"دیکھو مسٹر موران، ذرا ہوش میں آ جاؤ، تم سمجھتے ہو مجھے اپنی مصیبت اور انجام کی خبر نہیں، حالاں کہ ممکن ہے میں فرار کا کوئی منصوبہ ہی تیار کر رہا ہوں۔"

اس کے بعد کولٹن نے ہمیں بتایا کہ اس عجیب و غریب ساز کا نام "لی کبے" ہے اور اُدبا کے بیان کے مطابق یہ افریقی اس ساز کے لیے ٹین اور تار سوڈان سے منگواتے ہیں۔

یہاں یہ بھی بتا دینا مناسب ہوگا کہ اُدبا اس بوجا لڑکی کا نام تھا، جو کولٹن کی جھونپڑی میں متعین تھی اور کولٹن کی باتوں سے ہمیں یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ ادبا اور کولٹن کے تعلقات اتنے خوشگوار تھے کہ وہ لڑکی اپنے قبیلے کی خواہشات کے خلاف کولٹن کی مدد کرنے پر تیار ہو گئی تھی، لیکن نومبر کا مہینہ بھی اسی طرح گزر گیا اور ہم فرار کا کوئی کامیاب منصوبہ نہ بنا سکے۔ دسمبر کے پہلے ہفتے میں ایک دن ایم رنا اپنے تیرانداز بولوں اور چند بوجا جوانوں کو ساتھ لیے علی الصباح احاطے میں آیا تا کہ مرتے ہوئے رودہمر کا کام تمام کر دے۔

ہیلٹ رودہمر کی حالت بدستور دہی تھی۔ بے ہوشی یا نیم بے ہوشی کے سوا اس پر کبھی کوئی دوسری حالت طاری نہ ہوتی۔ ایم رنا ابھی تک اس کی صحت کا منتظر رہا تھا، لیکن اب وہ ناامید ہو کر اسے ختم کرنا چاہتا تھا۔

بے ہوش رودہمر کو اٹھا کر احاطے میں لایا گیا۔ بُوجا نوجوان بھالے سنبھالے ہم پر پہرہ دینے لگے اور تیرانداز بولوں نے رودہمر کو گھیر کر کمانیں سنبھال لیں۔ میں نے رودہمر کی جان بچانے کی آخری کوشش کی اور ایم رنا سے چلا کر کہا:

"ٹھہرو، ابھی اسے نہ مارو، ہم اس کا علاج کر سکتے ہیں۔"

میں نے یہ بات بڑے یقین کے ساتھ کہی تھی، لیکن ایم رنا پر کوئی اثر نہ ہوا، اس نے پلٹ کر جواب دیا:

"کیا کہا، اس کا علاج کر سکتے ہو؟ فادر اینٹونن کی دوا کے بغیر اس کا علاج کر سکتے ہو؟ نہیں مسٹر کریب، آپ جھوٹ بول کر اپنے ساتھی کی جان بچانا چاہتے ہیں۔ میں نے اس قسم کے بہت سے مریض دیکھے ہیں اور یہ بات افسوس ناک ہے کہ فادر اینٹونن کے سوا کبھی ان کا کوئی علاج نہ کر سکا اور پھر آپ کے ساتھی نے بوجا قبیلے کی کوئی مدد بھی نہیں کی اور نہ یہ اس کے قابل ہے۔"

ایم رنا نے اس تقریر کے بعد بڑے دکھ اور تاسف کے ساتھ ہاتھ بلند کیا، عین اسی وقت بے چارے رودہمر نے غنودگی کے عالم میں منہ کھول کر کچھ کہنا چاہا، لیکن چھ تیروں نے اسی لمحے اس کے کھلے منہ سے گزر کر اس کے حلق اور کھوپڑی کو چیر ڈالا، اور پانچ مزید تیروں نے اس کے بازوؤں، ٹانگوں اور سینے کو زمین سے پیوست کر دیا۔

ہمارے ایک ساتھی نے خودکشی کرلی تھی اور دوسرے کو یوں بے رحمی سے قتل کر دیا گیا، اس دن موران غصّے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے ہمیں بھاگ نکلنے کا مشورہ دیا، لیکن جب وہ بھاگنے کا کوئی منصوبہ نہ بنا سکا، تو اس نے ہمیں بزدلی کے طعنے بھی دیے،

"دیکھ لو آج تمہارے اپنے ساتھی کا کیا حشر ہوا اور اگر تم اسی طرح بھاگ نکلنے سے ڈرتے رہے تو تمہارا بھی یہی انجام ہو گا۔"

موران کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ رات کو احاطے سے نکل کر پہلے ان مخبوط الحواس بونوں کا گلا گھونٹ دیا جائے جو کتّوں کی طرح ہم پر پہرہ دیتے تھے اور پھر جنگل میں پناہ ڈھونڈی جائے لیکن جنگل میں بونوں اور بوجا قبیلے کے لوگوں سے کیسے بچا جائے، یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی۔

موران اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ وہ رات بڑی اندھیری تھی۔ اور چاند نکلا نہیں تھا۔ ہم نے موران کو احاطے کا جنگلا پھلانگتے تو دیکھا لیکن اس کے بعد صرف آوازیں سنائی دیں پہلی آواز ایک بونے کی چیخ تھی لیکن چیخ نامکمل رہ گئی۔ موران کے مضبوط ہاتھوں نے بونے کا گلا اچھی طرح دبوچ لیا تھا۔ چند لمحے خاموشی کے بعد ہمیں موران کے بھاگنے کی آواز آئی، وہ جنگل میں بھاگا جا رہا تھا، لیکن اسی وقت جیسے سارا گاؤں ایک دم جاگ اٹھا۔ افریقیوں کے دوڑنے بھاگنے اور چلّانے سے سارا جنگل گونج رہا تھا، پھر ایک خوفناک چیخ سنائی دی اور ساری بلند آوازیں دب گئیں۔ تھوڑی دیر بعد احاطے کی جانب افریقیوں کا ایک جلوس بڑھ رہا تھا۔ درمیان میں دو بوجا جوانوں نے بھالوں کی نوک پر موران کی لاش بلند کی ہوئی تھی۔

اگلی صبح موران کی لاش دفنانے کے بعد جب ایم رنا ہمارے پاس آیا، تو اس کا پارہ چڑھا ہوا تھا لیکن ہم سے مخاطب ہونے کے بجائے وہ اس مخبوط الحواس بونے کی لاش پر پہنچا جسے رات موران نے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا تھا ایم رنا کو اس کی موت کا اس قدر افسوس تھا کہ وہ وہاں کھڑے ہو کر باقاعدہ آنسو بہا کر رو دیا! اس کے بعد جب وہ ہماری طرف پلٹا، تو اس کا رویّہ مختلف تھا۔ اس نے جیب سے ڈائری نکال کر اس میں سے موران کا نام کاٹتے ہوئے کہا:

"یہ انتہائی طفلانہ حرکت تھی، کیا آپ لوگ کبھی یہ نہ سمجھیں گے کہ میں آپ کو اپنا ساتھی سمجھتا ہوں، ہم سب ایک عمر اور ایک نسل کے لوگ ہیں اور میرا دشمن صرف فادر اینٹونی ہے۔"

ہمارے ایک ساتھی نے خودکشی کر لی تھی۔ دوسرا بیمار تھا جسے قتل کر دیا گیا اور اب تیسرا فرار ہونے کی کوشش میں مارا گیا۔ اس دن ہم نے آپس میں فادر اینٹونی کے بارے میں بہت غور کیا۔ یہ بلجین مشنری اس جگہ سے تقریباً پچاسی میل دور ربولوبا میں رہتا تھا اور ایم رنا کی باتوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ایم رنا اگر کسی سے خوف زدہ ہے، تو اسی پادری سے، لیکن ہماری سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ آخر فادر اینٹونی تک اپنی حالت کی اطّلاع کیونکر پہنچائی جائے، میں گریرا اور گرنفلڈ اس مقصد کو سامنے رکھ کر مختلف منصوبے بناتے رہتے تھے جب کہ کولنٹن سب سے الگ تھلگ بیٹھے کی "موسیقی" سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔

نومبر کا مہینہ بھی اسی طرح گزر گیا، دسمبر کے وسط میں ہم نے ایم رنا کے لڑکے اور بہو کو بطور یرغمال اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا یہاں یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ایم رنا کے لڑکے کی عمر بمشکل تیرہ سال۔ اور اس کی بیوی کی عمر تقریباً گیارہ سال تھی۔ یہ دونوں بچے اکثر کھیلتے ہوئے احاطے کے قریب آ جایا کرتے تھے۔

ایک دن صبح جب ہم نے ان دونوں ننھے منے "میاں بیوی" کو احاطے کے قریب ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتے دیکھا، تو فوراً ان کو متوجہ کرنے کے لیے احاطے میں کبڈی کی قسم کا کھیل شروع کر دیا۔ یہ کھیل اتنا دلچسپ تھا کہ نہ صرف دونوں بچے، بلکہ قریب قریب کے اور لوگ بھی احاطے کی باڑھ کے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔

دونوں بچے گردنیں آگے بڑھا بڑھا کر ہمیں دوڑتے بھاگتے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے، چنانچہ موقع پا کر گریرا اور گرنفلڈ ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے ان کے قریب پہنچے اور لپک کر دونوں کو احاطے کے اندر گھسیٹ لیا۔ اسی وقت کچھ بگڑا اس صورتِ حال سے ایم رنا کو مطلع کرنے کے لیے گاؤں کی طرف دوڑے اور ہمنے انہیں چیختے چلّاتے میاں بیوی کو ایک جھونپڑی کے کونے میں لا بٹھایا۔

جیسا کہ ہمیں توقع تھی، ایم رنا فوراً ہی پہنچ گیا اس کی حالت بڑی عجیب تھی، چہرے پر کبھی خوف کی لہر آتی، تو کبھی غصے سے کپکپانے لگتا: "میرے بچوں کو چھوڑ دو۔" ایم رنا احاطے کے باہر ہی سے چلایا۔

"پہلے ہمیں آزاد کرو۔" میں نے اسی سختی سے جواب دیا۔ اس دوران میں گریرا اور گرنفلڈ دونوں بچوں کو جھونپڑی کے دروازے میں لے آئے اور ان کی گردنیں ہاتھوں میں تھام کر ایم رنا کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"نہیں، تمہیں ابھی آزاد نہیں کیا جا سکتا۔" ایم رنا نے ہٹ دھرمی سے جواب دیا۔

میں نے فوراً کمان سے اصل تیر نکالا: "تو پھر ہم تمہارے بچوں کو بھی ابھی مار ڈالیں گے۔"

ایم رنا کے چہرے پر کرب اور غصے کے آثار نمودار ہوئے وہ کچھ دیر خاموشی سے سوچتا رہا اور ہم اس کے جواب کا انتظار کرتے رہے، بالآخر وہ بڑی کوشش سے بولا:

"اچھا تو پھر انہیں مار دو ورنہ میں تمہیں اسی وقت ختم کر دوں گا۔"

ہمیں ایم رنا سے اس جواب کی قطعاً توقع نہ تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سوچا کہ ایم رنا ہمارے دو ساتھیوں کو پہلے ہی قتل کر چکا ہے اور بالآخر ہمیں بھی قتل کر دیا جائے گا۔ اس وقت اگر ہم اس کے بچوں کو ہلاک کر دیتے، تو وہاں سے نکل بھاگنے کی ساری امیدیں نہ صرف ختم ہو جاتیں، بلکہ ہم اسی لمحے قتل کر دیے جاتے۔ گریرا اور گرنفلڈ کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور دونوں بچے اپنی گردنیں سہلاتے ہوئے دوڑ کر ایم رنا کے پاس پہنچ گئے۔ ایم رنا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا:

"شکریہ سار، ہم آخر ایک دوسرے کو سمجھنے لگے ہیں، کیونکہ ہم ایک ہی عمر اور نسل کے ساتھی ہیں۔"

ہمارا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا، لیکن بچوں کی جان بخشی پر ایم رنا ہم سے بہت خوش تھا۔ اس نے ہم سے وعدہ کیا کہ اگلے دن ہمیں کیلے اور ہاتھی کے بھنے گوشت کے بجائے بہت نفیس غذا ملے گی جس میں شکر قند، سانپ کے کباب اور چیتے کا سینہ بھی شامل ہوگا۔

آدھی رات کے قریب اچانک لیکبے کے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ لیکبے کا آہنگ پہلے سے ذرا مختلف تھا جس پر میں نے توجہ نہ دی، لیکن اندھیری رات کی خاموشی میں اس کا شور خوفناک تاثر پیدا کر رہا تھا۔ اگلے دن شام کو، لوجا قبیلے کے چھ نوجوان بڑے بڑے پیالوں میں ہمارے لیے جو کھانا لے کر آئے، وہ واقعی پہلے سے مختلف تھا۔

رات کو لیکبے کا بدلا ہوا آہنگ اور اگلے دن ہماری غذا میں تبدیلی کے اس واقعے پر میں نے چنداں غور نہ کیا، لیکن کولٹن نے اس بات کو اہمیت دی اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا، وہ اس نے ہمیں چھ ہفتے گزرنے کے بعد بتایا، اس دوران میں کولٹن انتہائی خاموشی سے ادبا کی مدد سے فرار کا منصوبہ بناتا رہا اور جب اسنے ہمیں اپنا منصوبہ بتایا، تو حیرت سے ہمارے منہ کھلے رہ گئے، کولٹن نے پہلی بات یہ بتائی کہ ہماری غذا میں سے کوئی بھی چیز اس علاقے میں پیدا نہیں ہوتی۔ دوسری یہ کہ ایم رنا کا قبیلہ جنگجو قبیلہ ہے اور خوراک کی فراہمی کا کام کوئی دوسرا قبیلہ کرتا ہے۔ دوسرے قبیلے کے یہ پُرامن لوگ جنگل میں کہیں قریب آباد ہوں گے اور لیکبے کی

آواز دراصل اس دوسرے قبیلے کے ساتھ ایک قسم کا مواصلاتی نظام ہے. ہماری ضروریات کے مطابق خوراک کے لیے لیکبے ہی سے سگنل دیا جاتا ہے۔

لیکن ہم نے آج تک اس دوسرے قبیلے کے کسی آدمی کو یہاں کیوں نہیں دیکھا؟" میں نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ ایم رنا یہ نہیں چاہتا کہ باہر کے لوگوں کو اس صورتِ حال کا علم ہو، اور اسی لیے وہ ان بوبلوں کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا جو روزانہ ہمارے لیے زہریلی خوراک لے کر آتے ہیں. میرا خیال ہے کہ یہ دوسرا پُرامن قبیلہ حکومت کا وفادار اور فادر اینٹونئن کے زیرِ اثر ہے. اس قبیلے کے لوگ جب کھانا لیکر آتے ہیں، تو ایم رنا اپنے قبیلے کے لوگوں کو جنگل میں بھیج دیتا ہے تاکہ وہ ان سے کھانے کے برتن لے کر خود ہی یہاں پہنچیں۔" کولٹن نے جواب دیا۔

"تب تو ہمیں اس قبیلے کو کسی نہ کسی طرح ضرور اپنی حالت سے مطلع کرنا چاہیئے!" میں نے احمقانہ انداز میں سوچتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے میں لیکبے سے سگنل دے سکتا ہوں!" کولٹن نے سر کھجاتے ہوئے کہا: "اگر اُدبا مجھے ایک چاقو لادے تو میں اس بوجا لڑکے کا کام تمام کر کے لیکبے پر قبضہ کر لوں۔"

"لیکن تم جو سگنل دو گے اسکے مطابق وہ کھانا بھجوا دیں گے انہیں ہماری حالت کا علم کیسے ہوگا؟" گرنفلڈ نے اس منصوبے پر شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

کولٹن جھلا گیا: "تم مجھے بھی بیوقوف سمجھتے ہو؟ تمہارا خیال ہے ہمیں ڈیڑھ مہینے سے اسلیے شکر قند مل رہے ہیں کہ ہم معزز مہمان ہیں اور ایم رنا ہم سے بہت خوش ہے، حالانکہ اسکی واضح وجہ یہ ہے کہ اس علاقے میں کیلے کی فصل ختم ہو چکی ہے اور پہلے ہمارے لئے جو غذا آتی تھی، وہ اب پیدا ہی نہیں ہو رہی!" پھر اسنے ہمیں سمجھایا: "اگر آپ لیکبے پر پُرانا سگنل دیا جائے تو اسکا مطلب ہوگا کہ ایم رنا کو کیلے، ہاتھی کا گوشت اور ساگ کے قسم کی وہ سبزی چاہیئے جو ہمیں پہلے ملتی رہی ہے، لیکن اب چونکہ ان چیزوں کی فصل ختم ہو چکی ہے، تو اس بے وقت سگنل پر اس قبیلے کے لوگ شک میں مبتلا ہو جائیں گے، اور ہو سکتا ہے اس صورتِ حال سے فادر اینٹونئن کو مطلع کر دیں ؛ کہ ایم رنا نا ممکن چیزوں کا مطالبہ کر رہا ہے؟

منصوبہ ہم سب کی سمجھ میں آگیا. دو دن ہم نے شدید ذہنی ہیجان میں گزارے. اس دوران میں کولٹن نے ادبا کی مدد سے ایک چاقو حاصل کر لیا اور اس سے یہ بھی معلوم کیا کہ ہمارے ریوالور کس جھونپڑی میں رکھے ہوئے ہیں۔

وہ رات ہم نے بڑی بے چینی سے گزاری، نصف شب کے قریب کولٹن اور ادبا نے مجھے جھونپڑی سے باہر آنے کا اشارہ کیا، ادبا احاطے سے نکل کر سیدھی جنگل میں اس بوجا لڑکے کے پاس پہنچی، جو لیکبے کے قریب بیٹھا سگنل کے وقت کا انتظار کر رہا تھا. اس نے لڑکے کو باتوں میں لگایا اور ہم دونوں موقع پاکر احاطے سے باہر نکل آئے، میں اور کولٹن دبے پاؤں اس لڑکے کے عین پیچھے پہنچ گئے اور جس وقت وہ ادبا کے اشارے پر کسی درخت پر بیٹھا ہوا الو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کولٹن نے لپک کر چاقو اسکے سینے میں اتار دیا. میں نے فوراً زخمی لڑکے کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک طرف گھسیٹ لیا اور کولٹن اطمینان سے بیٹھ کر لیکبے بجانے لگا۔

ادبا سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پورے گاؤں میں اس لڑکے کے سوا اور کوئی لیکبے کے سگنل سے واقف نہ تھا، چنانچہ اگلی صبح کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہوا. دوپہر کو جب ایم رنا ہم سے ملنے کے لیئے آیا، تو اسنے لیکبے کی جگہ سے اس لڑکے کی گمشدگی ضرور محسوس کی ہو گی، لیکن اسے یہ ہرگز معلوم نہ تھا کہ اسکی لاش اسوقت کولٹن کی جھونپڑی میں چٹائی کے نیچے دفن ہے۔

اگلی صبح چھ جنوری ۱۹۴۳ء کی وہ یادگار صبح تھی جب ہم نے دس میل دُور دریائے کانگو میں کسی جہاز کے وِسل کی آواز سنی۔

احاطے کے گرد متعین بوجا پہریداروں نے حیرت اور خوف سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، ایم رنا بھی وسل کی آواز سنکر اپنی جھونپڑی سے باہر آیا اور بے چین نظروں سے جنگل کا جائزہ لیکر واپس چلاگیا۔ اس دن وہ دوپہر کو معمول کیمطابق ہم سے ملاقات کے لیے بھی نہ آیا۔ تقریباً تین بجے جب جنگل میں کسی موٹر کے انجن کی آواز سنائی دی، تو پورے گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی۔ کولٹن، گریر اور گرنفلڈ، سب احاطے کی باڑھ کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ ہم پر پہرہ دینے والے بوجا اور بونے اگرچہ اپنے بھالوں اور کمانوں کا رُخ ہماری جانب کیے اپنی جگہ بدستور کھڑے رہے، لیکن انکے چہروں پر خوف اور وحشت کے آثار نمایاں تھے۔

چند لمحے بعد جھاڑیوں اور لمبی لمبی گھاس کو روندتی ہوئی ایک چھوٹی رینالٹ کار جنگل سے نمودار ہوئی اور جھونپڑیوں کے عین قریب آکر رک گئی۔ کار میں صرف ایک شخص سوار تھا جو لباس اور شکل وصورت سے پادری نظر آتا تھا۔ اس شخص نے کار سے اترتے ہی نہایت درشت لہجے میں ایم رنا کو آواز دی، اور ہم نے دیکھا کہ اس کی آواز سنتے ہی تمام بوجا عورتیں اور مرد چیختے چلاتے گاؤں کی دوسری جانب جنگل کو بھاگ کھڑے ہوئے، اور تو اور ہمارے چوکیدار بھی دہشت زدہ ہوکر اپنی جگہ سے کھسک گئے، یہ وہ موقع تھا جب ہم چاروں نے باڑھ پھلانگ کر گاؤں کی اس جھونپڑی کی طرف بگٹٹ دوڑنا شروع کیا جہاں ہمارے ریوالور رکھے ہوئے تھے، ہمارے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے گاؤں کے لوگ اتنے خوفزدہ تھے کہ انہوں نے ہماری جانب قطعاً توجہ نہ دی، چنانچہ ہم کسی مزاحمت کے بغیر جھونپڑی میں داخل ہو گئے جہاں ایک بچہ ہمیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، سامنے دیوار پر ہمارے ریوالور ٹنگے ہوئے تھے ہمیں یہ دیکھکر اطمینان ہوا کہ ریوالور بھرے ہوئے ہیں اور کارتوس بھی وہیں موجود ہیں، باہر نکل کر ہم نے دیکھا کہ ایم رنا چھ فٹ کا ایک بھالا سنبھالے پادری کیطرف بڑھ رہا ہے۔ بیس فٹ کے فاصلے سے ایم رنا نے بھالا پادری کی جانب بلند کیا۔ پادری نے اگرچہ اس وقت ہمیں دیکھ لیا تھا لیکن اس نے ہماری جانب توجہ دیے بغیر ایم رنا کو مخاطب کیا:

"ایم رنا بھالا پھینک دو، میں فادر اینٹوئن ہوں"

"مجھے معلوم ہے" ایم رنا نے جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اس کے بعد وہ جھک کر دو قدم اسطرح آگے بڑھا جیسے ابھی فادر اینٹوئن کے پیروں پر گرنا چاہتا ہے، لیکن اچانک چیخ مار کر کھڑا ہوگیا اور فادر اینٹوئن پر حملہ کرنے کے لیے بھالا پھر بلند کیا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ حملہ کرتا، میں نے اس کی کمر کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ ایم رنا چکرا کر گرا، تو اس کی اور میری آنکھیں چار ہوئیں۔ اس نے ایک لمحے مجھے دیکھا اور پھر بڑے سکون سے بولا:

"مسٹر کریب، میری عمر اٹھائیس سال ہے"

میں نے قریب جاکر دوسری گولی اسکے پیٹ میں ماری اور تیسری اس کا بایاں کندھا چیر گئی۔ ایم رنا پیٹ پکڑ کر اوندھا ہوگیا اور پھر کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگا، چنانچہ چوتھی بار میں نے اسکے سر کا نشانہ لیا اور وہ وہیں سرد ہوگیا۔ ★★

ایک بچہ باغ میں سیب توڑ رہا تھا کہ مالی نے اسے دیکھ لیا اور پکڑ کر پولیس کے حوالے کردیا۔ بچے کا یہ پہلا جرم تھا۔ اسی لئے مجسٹریٹ نے اسے معاف کردیا اور یہ نصیحت کی کہ "تمھیں برے لوگوں سے بچنا چاہئے"۔ بچے نے جواب دیا "میں نے بچنے کی بہت کوشش کی تھی مگر کمبخت نے پکڑ ہی لیا"۔



بہ
انیس مرزا

خبطی وزیر اعظم

میری زندگی کا ناقابلِ فراموش دَور وہی ہے جو میں نے سرونسٹن چرچل کی معیت میں گزارا۔ خدا کی پناہ کیسے بھیانک دن تھے وہ بھی! ہٹلر برطانیہ کو تہس نہس کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ جرمن طیارے لندن پر چوبیس گھنٹے بمباری کر رہے تھے۔ ہر طرف آگ اور خون کا کھیل جاری تھا اور بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہٹلر اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو جائے گا ——

اتحادی فوجیں حریف کو شکست دینے کے لئے سر توڑ کوششیں کر رہی تھیں۔ ان کے لیڈر آپس میں صلاح مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اُٹھاتے تھے۔ امریکہ، برطانیہ اور رُوس مل کر ایک قوم بن گئے تھے۔ ایسا اتحاد دوبارہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ برطانیہ کو بچانے کی ذمّے داری سرونسٹن چرچل کے کندھوں پر آن پڑی تھی اور بیسویں صدی کا یہ سب سے بڑا انگریز جس مہارت، ہوشیاری، تدبّر اور بہادری سے وطن کی حفاظت کر رہا تھا، اس کی تعریف خود حریف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ہٹلر نے ان ہی دنوں کہا تھا: "اگر برطانیہ کے پاس چرچل نہ ہوتا، تو میں اس مُلک کو کرۂ ارض سے نیست و نابود کر دیتا۔" خُدا جانے یہ روایت سچ ہے یا جھوٹ، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انگریزوں کو تباہی سے بچانے والا صرف یہی ایک مردِ عظیم تھا۔

میں اپنے آپ کو انتہائی خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ چرچل کے ساتھ میں نے چند سال اس طرح گزارے کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایک لمحہ بھی میرا ان سے رابطہ نہیں ٹوٹتا۔ میں اُن کے محافظ دستے کا انچارج تھا اور میرا فرض چرچل کی زندگی کی حفاظت کرنا تھا۔ کہنے کو تو یہ ایک سادہ سا جملہ ہے، لیکن اس کی حقیقت کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ ایک ایسے شخص کی دیکھ بھال کتنا مشکل فریضہ تھا جسے اپنے عوام سے بے پناہ محبت تھی اور جو کسی بھی وقت اُن سے ملنے کے لئے سڑکوں، بازاروں اور پناہ گاہوں میں جا سکتا تھا۔

دُشمن کے طیارے لندن پر آگ برسا رہے ہیں۔ بموں کے دھماکوں سے لندن لرز رہا ہے۔ زمین شق ہو رہی ہے۔ عمارتیں گِر رہی ہیں اور سائرن چلّا رہے ہیں کہ یکایک چرچل اپنی کرسی سے اُٹھتا ہے اور کمرے سے باہر نکل آتا ہے، وہ خود دیکھنا چاہتا ہے کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے، لوگ کیا کر رہے ہیں۔ ہم سب سائے کی طرح اس کے ساتھ ہیں، موت ہمارے تعاقب میں ہے، لیکن چرچل کے ہونٹوں پر ازلی وابدی مسکراہٹ طاری ہے۔ وہ نہایت بے پروائی سے سگار پیتے ہوئے جیپ پر بیٹھا شہر کا چکر لگا رہا ہے۔ بعض لمحات ایسے بھی آئے ہیں کہ ہم اپنی جانوں کو صریحاً خطرے میں محسوس کر رہے ہیں اور خود چرچل کی زندگی کا اعتبار اُٹھ گیا ہے، لیکن خوف کی علامت اس کے چہرے پر نمودار نہیں ہوتی، وہ موت کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

میں نے چرچل کو ہر حال میں دیکھا ہے۔ اُن کا اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، تقریر کرنا، لوگوں سے ملنا، ماتحتوں کو احکام جاری کرنا، سب کچھ میری نگاہ میں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے دَور کے مصروف ترین آدمی تھے۔ انھیں آرام کرنے کے لئے بمشکل وقت ملتا تھا۔

۱۲ر نومبر ۱۹۴۳ء کو مسٹر چرچل برطانوی بحریہ کے جنگی جہاز "ری ناؤن" کے ذریعے پلے ماؤتھ کی بندرگاہ سے قاہرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ تہران کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے جس میں رُوس کے مردِ آہن مارشل سٹالن، امریکہ کے صدر روزویلٹ اور برطانیہ کے وزیرِ اعظم مسٹر چرچل شریک ہوں گے۔ وزیرِ اعظم کے ساتھ پورا عملہ جا رہا ہے اور گھر میں سے صرف ان کی بیٹی

، سارہ چرچل اپنے باپ کے ہمراہ ہیں۔

پروگرام اصل میں یہ تھا کہ بحری جہاز کے ذریعے پہلے جبل الطارق جائیں گے وہاں سے طیارے میں قاہرہ کی طرف پرواز کریں گے، لیکن عین وقت پر پتا چلا کہ جبل الطارق کا موسم بے حد خراب ہے اور طیارہ وہاں سے پرواز نہیں کرسکے گا، چناں چہ ہم مالٹا کے راستے مصر پہنچے۔ برطانوی فوجی دستوں نے پہلے ہی سے مینا ہوٹل کا چارج لے لیا تھا، یہاں ہمیں ٹھہرایا گیا۔ اسی روز مادام اور مسٹر چیانگ کائی شیک، جنرل ایسو اور صدر روز ویلٹ قاہرہ پہنچ گئے اور ان لوگوں نے نہایت پُرلطف ماحول میں گفتگو کی۔ ان کی حفاظت کے کڑے انتظامات کیے گئے تھے چپے چپے پر فوجی سپاہی سنگینیں تانے ٹہل رہے تھے۔ اور ہر آنے جانے والے شخص کی سختی سے جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ کانفرنس کے دوران میں یا اس کے بعد کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ کانفرنس کے بعد فیصلہ ہوا کہ ایک گروپ فوٹو لیا جائے، چناں چہ یہ لیڈر کانفرنس روم کی پچھلی جانب واقع باغ میں جمع ہوگئے۔ صدر روز ویلٹ نے چیانگ کائی شیک کو درمیان میں بٹھانا چاہا، لیکن چیانگ تیار نہ ہوا۔ اس پر تینوں لیڈروں کے مابین مذاق بھی ہوا اور وہ ایک دوسرے پر فقرے چست کرتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ آخر صدر روز ویلٹ کو درمیان میں بیٹھنا پڑا۔ ان کی دائیں جانب چیانگ۔ اور بائیں جانب مسٹر چرچل تھے۔

تہران روانہ ہونے سے ایک دن پہلے صدر روز ویلٹ مسٹر چرچل ایک ہی کار میں بیٹھ کر اہرام مصر اور ابوالہول کا مجسمہ دیکھنے گئے۔ انھوں نے ان تاریخی عجائبات کے معائنے میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور دیر تک مصری فنِ تعمیر پر تبادلۂ خیالات اور بحث کرتے رہے۔ اس وقت ان دونوں کو دیکھ کر یہ احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ دنیا کے دو عظیم ملکوں کے سربراہ ہیں اور ایک طاقتور حریف سے لڑنے میں مصروف ہیں۔ اس کے بجائے وہ علم آثارِ قدیمہ کے دو ایسے ماہر نظر آتے تھے جن کو اپنے فن کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں۔

ہمیں اپنے جاسوسوں کے ذریعے قاہرہ ہی میں یہ اطلاع مل چکی تھی کہ نازی ایجنٹوں کی بڑی تعداد تہران میں موجود ہے، اور یہ لوگ اتحادی لیڈروں، خصوصاً مسٹر چرچل کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ نازی ایجنٹوں کی مہلک کارروائیاں میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی اور ہمارے پاس ان سے دو دو ہاتھ کرنے کی صلاحیت تھی، لیکن مسئلہ ہمارا نہیں، برطانوی مدبّر کو بچانے کا تھا جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ برطانوی قوم کو بچانے میں کام آرہا تھا۔ ہمارا طیارہ تہران کے ہوائی اڈّے پر اُترا تو میں نے محسوس کیا کہ برطانوی سفارت خانے نے اگرچہ وزیر اعظم کی حفاظت کے انتظامات خوب کیے ہیں، لیکن کچھ ایسے افراد بھی وہاں مختلف حیثیتوں سے موجود ہیں جن پر نازی ایجنٹ ہونے کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔ میں نے وزیر اعظم سے درخواست کی کہ ہوائی اڈّے سے سفارت خانے میں پہنچنے تک اپنے جاں نثار کی ہدایات پر عمل کرنا پسند کریں، تو یہ قوم پر بڑا احسان ہوگا۔

انھوں نے میری بات غور سے سُنی، ایک لمحے کے لئے سگار کا کش ملتوی کر کے مسکرائے اور میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولے: "ارے تھامپسن، تم فکرمند کیوں ہوتے ہو جس طرح کہو گے تعمیل کروں گا۔"

یہ سُن کر میری جان میں جان آئی۔ میں نے نازی ایجنٹوں کے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا اور

سفارت خانے کے فوجی اتاشی سے حفاظت کے انتظامات پر چند ضروری باتیں دریافت کیں۔ اس نے بتایا کہ نازی ایجنٹوں کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھی جا رہی ہے: تاہم خدشہ ضرور ہے کہ شاید وزیر اعظم پر حملہ کیا جائے۔

تماشائیوں کو ہوائی اڈے سے کافی دُور ہی روک لیا گیا تھا۔ مسٹر چرچل بند گاڑی میں سوار ہو کر سفارت خانے پہنچے اور اپنے کمرے میں جاتے ہی انھوں نے مجھے طلب کیا۔

"مسٹر تھامپسن، مجھے اطلاع ملی ہے کہ جرمن ایجنٹ پیراشوٹ کے ذریعے تہران پر آ اترے گئے اور ان کا ارادہ ہم پر حملہ کرنے کا ہے۔" ("ہم" میں چرچل نے سٹالن اور روزویلٹ کو بھی شامل کر لیا تھا۔)

میں حیرت سے اُن کی طرف تکنے لگا۔ میں اُن کے باڈی گارڈ دستے کا انچارج اور برطانوی سیکرٹ سروس کا رکن ہونے کے باوجود اس نئی خبر سے بے خبر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وزیر اعظم کے پاس کوئی خفیہ ٹرانسمیٹر ہے جس پر وہ براہِ راست اطلاعات وصول کرتے ہیں۔ انھوں نے میرے اندرونی جذبات بھانپنے کے بعد مسکرا کر کہا:

"سفارت خانے کے گرد جتنے آدمی حاضر ہیں، سب کی جانچ پڑتال کر کے مجھے بتاؤ اور امریکی سفارت خانے کو بھی اس خبر سے آگاہ کر دیا۔"

صدر روزویلٹ اپنے ملک کے سفارت خانے کی وسیع و عریض عمارت میں ٹھہرے ہوئے تھے جو ہمارے سفارت خانے سے ایک میل دُور تھی اور چرچل کو تھوڑی دیر بعد جانا تھا۔ میں ابھی نئے انتظامات میں مصروف تھا اور ڈیوٹیاں مقرر کی جا رہی تھیں کہ عین وقت پر چرچل نے مجھے دوبارہ اپنے پاس بُلایا اور فیصلہ کن لہجے میں کہنے لگے: "تھامپسن" میں اس وقت امریکی صدر سے ملنے نہیں جاؤں گا، میری بجائے تم گاڑی میں بیٹھ کر وہاں چلے جاؤ، لیکن اس انداز میں جس طرح مجھے جانا چاہیے۔"

میرے جسم پر جیسے کنکھجورے رینگنے لگے۔ مجھے مسٹر چرچل کا پارٹ ادا کرنا تھا۔ اگرچہ یہ نئی بات نہ تھی، مگر جان کسے پیاری نہیں ہوتی؟ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے وزیر اعظم کا مخصوص لباس پہنا، سگار مُنہ میں دبایا اور بند فوجی گاڑی میں اپنے حفاظتی دستے کے ساتھ روزویلٹ کی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔

مسٹر روزویلٹ نے مجھے بتایا کہ نازی ایجنٹوں کی خطرناک سرگرمیوں کے بارے میں وہ مارشل سٹالن کو اطلاع بھجوا چکے ہیں اور سٹالن نے پیش کش کی ہے کہ اگر صدر روزویلٹ روسی سفارت خانے میں قیام کریں، تو یہ زیادہ بہتر ہوگا اور ملاقاتیں کرنے میں بھی آسانی رہے گی۔ صدر روزویلٹ نے سٹالن کی یہ تجویز منظور کر لی تھی۔

یہ سُن کر مجھے کچھ سکون ہوا، کیوں کہ روسی سفارت خانے کی عمارت برطانوی سفارت خانے سے نزدیک تھی اور اس طرح مسٹر چرچل آنے جانے کی جان لیوا زحمت سے محفوظ ہو گئے۔ واپسی پر میں نے وزیر اعظم کو اس نئے منصوبے سے آگاہ کیا، تو وہ بھی خوش ہوئے۔ روسی اور برطانوی سفارت خانے کے درمیان جو سڑک واقع تھی، اسے عوام کی آمد و رفت اور ٹریفک کے لئے بند کیا جا چکا تھا اور یہاں بڑی تعداد میں امریکی، روسی اور برطانوی سپاہی تعینات تھے۔ انھیں مستعد دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی جنگ چھڑنے والی ہے۔

"تہران کانفرنس" رُوسی سفارت خانے کی عمارت ہی میں ہوئی۔ وزیر اعظم کے ساتھ ان کے خاص کاغذات سنبھالے جب میں کمرے میں داخل ہوا، تو میں نے دیکھا کہ مارشل سٹالن کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ انھوں

نے گرم جوشی سے ہاتھ ملائے۔ اس وقت دونوں لیڈر سگار پی رہے تھے اور اچھے موڈ میں تھے۔ صدر روزویلٹ کی گفتگو پُرلطف تھی۔ انھوں نے ایک لطیفہ سُنایا اور میں نے دیکھا کہ اس کے اختتام پر تینوں لیڈر کھلکھلا کر ہنسے۔ بیضوی میز کے گرد بیٹھے ہوئے یہ تین خوش و خرم انسان کرۂ ارض کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے تھے۔

کانفرنس کئی دن جاری رہی۔ سینکڑوں دلچسپ باتیں سامنے آئیں۔ آپس میں تحفے تحائف کا تبادلہ بھی کیا گیا۔ اس دوران میں صرف ایک مرتبہ دشمن کی طرف سے گڑبڑ پھیلانے کی کوشش کی گئی، لیکن اسے ناکام بنا دیا گیا۔ اتحادی لیڈروں ہی میں سے ایک لیڈر کا پرسنل سکریٹری نہ جانے کس طرح نازیوں کے ہتھے چڑھ گیا (میں اس لیڈر کا نام ظاہر نہیں کروں گا) اور انھوں نے اسے اپنے ساتھ ملا لیا اور بنک آف انگلینڈ کے کئی لاکھ پونڈ کی مالیت کے اصلی نوٹ رشوت میں دیے۔ اس کا کام صرف یہ تھا کہ جس کمرے میں کانفرنس ہو رہی ہے، اس میں ایک ٹائم بم لے جا کر رکھ دے، لیکن کانفرنس روم میں ٹائم بم لے جانا تو در کنار، وہاں ایک حقیر سی سوئی بھی دیکھے بھالے بغیر نہ جا سکتی تھی۔ پرسنل سکریٹری تاک میں لگا رہا، لیکن کڑی نگرانی اور تلاشی کے باعث ٹائم بم کمرے میں لے جانے کا موقع نہ مِل سکا۔ حالاں کہ یہ ٹائم بم دیا سلائی کی ڈبیا کے برابر تھا۔

میں کئی روز سے اس شخص کی پُراسرار حرکات کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان سا ہے، لیکن مجھے پریشانی کا سبب معلوم کرنے کا کوئی راستہ نہیں سُوجھ رہا تھا، اور ویسے بھی پرسنل سکریٹری پر ہاتھ ڈالنے کا اختیار نہ تھا۔ سوچ سوچ کر مسٹر چرچل سے اس کا ذکر کیا۔ ان کی کشادہ پیشانی پر غور و فکر کی لکیریں نمودار ہوئیں۔

"تمھیں یقین ہے کہ وہ شخص کچھ گڑبڑ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"جناب، مجھے "یقین" ہوتا، تو میں آپ سے ذکر کرنے کی ضرورت نہ سمجھتا اور اس معاملے کو بالا ہی بالا نمٹا دیتا، مجھے صرف "شک" ہے کہ وہ جرمنوں سے مِل گیا ہے اور کسی شرارت پر تُلا ہوا ہے۔"

"شک کی بنا پر کوئی کارروائی کرنا درست نہ ہوگا پیارے تھامپسن"۔ یہ ان کی مخصوص ادا تھی۔ وہ رسمی طور پر مجھے پکارتے، تو تھامپسن کہتے۔ لیکن جب تنبیہ کرتے، تو تھامپسن سے پہلے "پیارے" ضرور کہتے تھے۔

"تم جانتے ہو کہ وہ شخص بے قصور نکلا، تو یہ معاملہ کس حد تک بڑھ سکتا ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ سے ہماری کانفرنس ہی ناکام ہو جائے اور یہ جرمنوں کی بڑی کامیابی ہوگی۔ میں تمھیں کوئی ایکشن لینے کی اجازت نہ دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ غسل خانے میں چلے گئے۔

اگلے روز یعنی ۳۰ نومبر کو چرچل کی انہترویں (۶۹) سال گرہ تھی۔ اور وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ سال گرہ کی تقریب پورے وقار اور شان و شوکت سے منائی جائے گی۔ مہمانوں کی کل تعداد ۳۴ تھی اور ان میں وہ پرسنل سکریٹری بھی شریک تھا۔ میں نے مسٹر چرچل سے درخواست کی کہ فہرست میں سے اس شخص کا نام کاٹ دینا چاہیے۔

"تھامپسن، اس شخص کو تو ضرور آنا چاہیے۔ اگر وہ بُری نیت رکھتا ہے، تو یہ اس کے لیے بہترین موقع ہوگا۔ سب مہمان تحفے لے کر آئیں گے، ممکن ہے وہ بھی

کوئی تحفہ لے کر آئے۔"

مسٹر چرچل کے منہ سے نکلے ہوئے جملے کے آخری حصے نے مجھے چونکا دیا اور میں بے صبری سے آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ ڈنر سے پہلے کاک ٹیل پارٹی ہوئی جس میں سب نے شرکت کی۔ سٹالن اپنے ترجمان مسٹر پالوف کی مدد سے ہر مہمان کے پاس گیا اور گھل مل کر باتیں کیں۔ میں ایک گوشے میں کھڑا پرسنل سکریٹری پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا اور وہ بار بار اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ادھر ادھر دیکھتا۔ چرچل کو ملنے والے تحائف میز پر رکھے تھے۔

ڈنر کا وقت ہوا تو مسٹر چرچل اپنے مہمانوں کو لے کر ڈائننگ ہال کی طرف بڑھے۔ پرسنل سکریٹری چند لمحوں کے لئے رکا اور پھر مڑ کر اس نے اپنی جیب سے خوبصورت سا پارسل نکالا، اسے میز پر رکھا اور تیزی سے ڈائننگ ہال میں داخل ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے وہ پارسل اٹھایا، اپنے ایک ماتحت کو پرسنل سکریٹری کی نگرانی کا حکم دے کر میں جلدی سے دوسرے کمرے میں گیا اور پارسل کھولا تو اس کے اندر گھڑی رکھی تھی۔ میں نے گھڑی کو الٹ پلٹ کر دیکھا اسے کھولا، تو کوئی مشکوک بات معلوم نہ ہوئی۔ خاصی قیمتی گھڑی تھی۔ ڈائننگ ہال سے قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ یکایک ایک خیال بجلی کی مانند میرے ذہن میں آیا۔ میں نے گھڑی اسی پارسل میں بند کی۔ اسے دوبارہ میز پر رکھا اور ڈائننگ ہال کی طرف لپکا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ سب مہمان ایک لمبی میز کے گرد جمع ہیں جس پر بہت بڑا کیک رکھا ہے اور اس کیک پر انہتر (۶۹) موم بتیاں روشن ہیں۔ مسٹر چرچل کے دائیں بائیں جو مہمان کھڑے ہیں، ان میں صدر روزویلٹ، مسٹر ایورل ہیری مین اور وزیر اعظم کی بیٹی مس سارہ چرچل شامل ہیں۔ مجھے اطمینان تھا کہ سکریٹری ان آدمیوں کی موجودگی میں مسٹر چرچل کو نقصان نہ پہنچا سکے گا، تاہم اس کی نگرانی ضروری تھی۔

کیک کاٹنے کی رسم ادا کرنے کے بعد سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے اپنے اپنے گلاس اٹھا لئے، مسٹر چرچل نے ایک نظر مہمانوں پر ڈالی، اپنی جگہ سے اٹھے اور کہنے لگے:

"اس تقریب میں آپ حضرات کی شمولیت سے میری جو عزت افزائی ہوئی ہے، اس کا دلی خلوص سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خاص طور پر اپنے دو عظیم دوستوں، مارشل سٹالن اور صدر روزویلٹ کا بے حد ممنون ہوں کہ وہ اپنا قیمتی وقت صرف کر کے یہاں تشریف لائے۔"

چند لمحے چپ رہنے کے بعد مسٹر چرچل اسٹالن کی طرف متوجہ ہو کر انتہائی جذباتی انداز میں بولے:

"میں تمہیں جوزف کہہ کر پکارتا ہوں اور تم بھی مجھے ونسٹن کہتے ہو۔ میں تمہیں اپنا بہترین دوست سمجھتا ہوں اور برطانوی عوام کی طرف سے آپ کا جام صحت تجویز کرتا ہوں —— مارشل سٹالن عظیم شخصیت ہے۔ بہت عظیم ——"

مارشل سٹالن اپنی نشست سے اٹھ کر چرچل کے قریب گیا۔ دونوں نے گلاس ٹکرائے، پھر سٹالن نے کہا:

"میں روسی عوام کی طرف سے برطانیہ اور امریکہ کی دوستی کا ہاتھ آپ کی طرف بڑھاتا ہوں۔ ہم اس دنیا میں گہرے دوستوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ برطانیہ اور امریکہ اپنے عمل سے یہ ثابت کریں کہ وہ ہمارے دوست ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر اپنا گلاس چرچل کے گلاس سے ٹکرایا اور ہاتھ بلند کر کے گرج دار لہجے میں کہا:

"میں اپنے "لڑاکا دوست" کی سالگرہ کا جام تجویز کرتا ہوں۔"

مسٹر چرچل ایک بار پھر اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئے۔ اس مرتبہ ان کا خطاب روزویلٹ سے تھا۔

"جناب صدر، ہماری آپ کی دوستی صدیوں پرانی ہے، لیکن اس جنگ نے ہمیں نہ ٹوٹنے والے رشتے میں باندھ دیا ہے۔ میں برطانوی قوم کی جانب سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم ہر حال میں آپ کے ساتھ ہیں اور ہم آپ کی دوستی کی قدر کرتے ہیں۔ دونوں قومیں ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھتی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہم ہزارہا سال تک ایک دوسرے کے قدم بہ قدم سفر طے کریں گے۔" روزویلٹ نے جواب میں کہا: "آج میرے پرانے اور مایۂ ناز دوست ونسٹن چرچل کی انہترویں سالگرہ ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ ونسٹن چرچل دنیا کی ان شخصیتوں میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں جو بچپن ہی سے "عظیم" ہوتی ہیں، بشرطیکہ ان کے ابتدائی نو سال شمار نہ کیے جائیں۔" اس جملے پر مہمانوں نے قہقہے لگائے۔

روزویلٹ کا اشارہ یہ تھا کہ مسٹر چرچل بچپن میں نہایت کند ذہن اور غبی سمجھے جاتے تھے اور اپنی جماعت میں سب سے پچھلی نشست پر بیٹھتے تھے اور استادوں نے ان کی ذہانت کے بارے میں بارہا مایوسی کا اظہار کیا تھا۔ روزویلٹ نے پھر تقریر شروع کی:

"ونسٹن نے آج اپنی عمر کے ۶۹ سال بخیر و عافیت پورے کر لیے ہیں، یہ ان کی بڑی خوش نصیبی ہے۔ (قہقہے) چرچل اور سٹالن ہمارے دوست ہیں اور امریکی عوام کو ان کی دوستی پر فخر ہے۔"

تالیوں کی بے پناہ گونج میں صدر روزویلٹ اٹھ کر پہلے چرچل اور پھر سٹالن کے پاس گئے اور تینوں نے ایک دوسرے سے گلاس ٹکرائے۔ اس کے بعد مسٹر انتھونی ایڈن نے (جو بعد میں برطانیہ کے وزیر اعظم بنے) مسٹر مالوٹوف کا جام صحت تجویز کیا۔ شراب کا انتظام مسٹر چرچل کے خاص بٹلر مسٹر فرینک سویرز کے سپرد تھا۔ اس نے اپنے حسن انتظام اور عمدہ شراب سے مہمانوں کا دل موہ لیا، تو سٹالن نے اسی کا جام صحت تجویز کر دیا اور یہ ایسا اعزاز تھا کہ اس سے پہلے سفارت خانے کے کسی برطانوی ملازم کو نہیں ملا۔

تقریب اپنے عروج پر اس وقت پہنچی جب مہمانوں نے کھانے کی میز پر دھاوا بولا۔ میں نے دیکھا کہ سٹالن کے مسلح محافظ پوری طرح چوکنے اور باخبر ہیں، انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے لیڈر کو تنہا چھوڑنا پسند نہیں کیا۔ کبھی کبھی وہ آپس میں سرگوشیاں بھی کرتے تھے۔ کوئی آواز میرے کان میں کہہ رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ میں نے پرسنل سکریٹری کو دیکھا اس کا دھیان کھانے کی طرف نہیں تھا۔ وہ بار بار سر کھجا کر کچھ سوچنے لگتا۔ یکایک میں نے محسوس کیا کہ وہ ہال کمرے کے آخری دروازے کے قریب بہت دیر سے بیٹھا ہے۔ حالاں کہ قاعدے کے مطابق وہاں اس کی نشست نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے دل میں کہا: تھامپسن، چپ چاپ کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں، یہ تمہارے لیڈر کی زندگی کا سوال ہے، اگر اسے کچھ نقصان پہنچا، تو اپنی قوم کو منہ نہ دکھا سکو گے۔ میں آہستہ آہستہ بے پروائی سے چلتا ہوا پرسنل سکریٹری کی طرف بڑھا۔ میں اس سے پانچ سات فٹ کے فاصلے پر تھا کہ سٹالن نے کچھ کہا جس کا انگریزی ترجمہ روسی ترجمان پالوف نے

گیا۔ ابھی وہ بول ہی رہا تھا کہ ہال کمرے کا جنوبی دروازہ کھلا اور ایک ویٹر ہاتھوں میں بڑی سی ٹرے اٹھائے نمودار ہوا۔ ٹرے میں پڈنگ آئس کریم کے بھرے ہوئے کپ رکھے تھے۔ یکایک وہ لڑکھڑایا جیسے اس کا پیر پھسلا ہو، پھر وہ دھڑام سے وزنی ٹرے سمیت پالوف پر جا گرا اور پالوف کے کپڑے اور چہرہ آئس کریم سے لت پت ہو گئے۔ سب لوگ ویٹر کے گرنے کی آواز سن کر اُدھر دیکھنے لگے اور پالوف کا حلیہ دیکھ کر کئی زور زور سے ہنسے، یکایک ہال میں گھپ اندھیرا چھا گیا اور اس کے ساتھ ہی کوئی شخص چلّایا:

"ویٹر کو پکڑ لو۔"

چند ثانیوں کے لئے ہال میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پھر گولی چلی، برتنوں کے گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں اور مہمانوں کا غل غپاڑہ۔ میرا جسم پتھر ہو گیا۔ اتنے میں چاروں طرف سے ٹارچیں روشن ہو گئیں۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وزیرِ اعظم محفوظ ہیں۔ روزویلٹ اور سٹالن کو بھی ان کے باڈی گارڈ گھیرے میں لئے کھڑے ہیں۔ پرسنل سکریٹری ایک کرسی پر گرا ہوا تھا اور ایک نظر دیکھتے ہی پتا چل گیا کہ وہ مر چکا ہے۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی اور گاڑھا گاڑھا خون اس کی کھوپڑی سے مسلسل نکل رہا تھا۔ پستول ایک کرسی کے نیچے پڑا ہوا تھا۔

ویٹر اوندھا پڑا تھا۔ اس کا جسم برف کی مانند سرد تھا۔ تینوں لیڈروں کو فوراً دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ اب ہم نے اس ٹرے کا جائزہ لیا، تو اس کے نیچے ایک بٹن دکھائی دیا۔ بٹن دبانے سے ٹرے کا نچلا حصہ کھل گیا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا ٹائم بم نصب تھا جس کے ساتھ لگی ہوئی ننھی سی گھڑی کی سوئی بارہ کے ہندسے پر رکی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی، بارہ بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔ گھڑی میں سے ٹک ٹک کی آواز آ رہی تھی۔ ہم نے اس کا میکنزم کھول کر ٹائم بم اسی وقت بے کار کر دیا۔ بعد میں ہمارے ماہرین نے بتایا کہ اگر یہ بم بروقت چل جاتا، تو اس کمرے کا کوئی شخص زندہ نہ بچتا۔

ان چونتیس مہمانوں میں سے کس شخص نے پرسنل سکریٹری کو گولی ماری، یہ معمہ آج تک لاینحل ہے۔ تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ کوئی نازی ایجنٹ تھا۔ ویٹر کی گردن میں سوئی چبھی ہوئی پائی گئی جو بہت باریک اور تقریباً آدھ انچ لمبی تھی۔ یہ سوئی زہر میں بجھی ہوئی تھی۔

اگلے روز پریس کانفرنس تھی جسے تینوں لیڈر خطاب کرنے والے تھے، لیکن اس حادثے کے پیشِ نظر ہم لوگ بہت محتاط ہو گئے تھے۔ پریس کے رپورٹروں کی سختی سے تلاشی لینے کے بعد انھیں کمرے میں بٹھایا گیا اور ہر رپورٹر کے سر پر ایک مسلح سپاہی متعین تھا۔ چرچل نے اس روز میری فرمائش پر ایئر کموڈور کی وردی پہنی اور تصویریں اُتروائیں۔

تہران سے ہمیں ایک بار پھر قاہرہ اور وہاں سے تیونس جانا تھا۔ جنرل آئزن ہاور ان دنوں تیونس میں تھے اور مسٹر چرچل سے ملنا چاہتے تھے۔

تہران کے برطانوی سفارت خانے سے روانہ ہوتے وقت میں نے ایک انوکھی تدبیر سوچی۔ میں نے مسٹر چرچل کی کار میں ان کے پورے حفاظتی دستے کے ساتھ ایک سیکورٹی افسر کو ہوائی اڈے پر بھیج دیا اور خود مسٹر چرچل کے ساتھ ایک پرانی کار میں بیٹھا۔ اس کار کی چھت پر میں نے دو تین ٹرنک بھی رکھوا دیے جس سے

...بتا تھا کہ کوئی ادنیٰ درجے کا برطانوی افسر جا رہا ہے۔ ...پہر آکر ملنے میں خطرہ بھی تھا، لیکن اس کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ ہماری طرف کسی نے توجّہ نہ دی اور ہم بخیریت ہوائی اڈّے پر پہنچ گئے۔

صدر روزویلٹ پہلے ہی قاہرہ پہنچ چکے تھے۔ یہاں دونوں لیڈروں کی پھر ملاقات ہوئی۔ گفتگو میں جنرل سمٹس نے بھی حصّہ لیا۔ جنرل کی مسٹر چرچل سے یہ پہلی ملاقات تھی اور وہ ان کی شخصیت سے بے حد مرعوب اور متاثر ہوا۔ اس نے بعد میں مجھ سے کہا:

"مسٹر چرچل بلاشبہ دُنیا کے عظیم آدمی ہیں ــــ اور مسٹر تھامپسن، تمھیں فخر کرنا چاہیے کہ تم ان کے محافظ ہو۔"

تیونس جانے کے لیے جب ہم طیارے میں سوار ہو رہے تھے، تو میں نے محسوس کیا کہ مسٹر چرچل بہت زیادہ تھکے ہوئے ہیں۔ اُن کا چہرہ پژمردہ نظر آرہا تھا اور وہ بیمار پڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ میں نے اُن کے ذاتی معالج لارڈ مورن کو بتایا کہ وزیرِ اعظم بیمار ہیں، تو اس نے یقین نہ کیا اور کہا کہ یہ صرف تھکن ہے اور کچھ نہیں، لیکن تیونس پہنچتے پہنچتے مسٹر چرچل کی حالت اور خراب ہو گئی ــ وہ سیدھے آئزن ہاور کی قیام گاہ پر گئے اور بستر پر لیٹ کر کئی گھنٹے تک سوتے رہے۔ اسی دن لارڈ مورن نے اُن کا طبی معائنہ کیا، تو پتا چلا کہ مسٹر چرچل ایسے آدمی نہ تھے کہ قوم کو ابتلا میں چھوڑ کر خود آرام کرنے بیٹھ جاتے۔ وہ دن بھر کاغذات دیکھتے رہے اور بعض ضروری پیغامات بھجواتے رہے۔ رات کو اُن کی طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی۔ لارڈ مورن نے اب اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر ایک سخت مزاج معالج کی حیثیت اختیار کر لی اور مسٹر چرچل کو سمجھایا کہ انھیں اپنے لیے نہیں، ملک اور قوم کی خاطر آرام کرنا چاہیے۔ اس جذباتی اپیل کا ان پر اثر ہوا اور وہ "شکریہ" کہہ کر بستر پر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کریں۔ ذاتی ملازموں کے علاوہ باہر کے کسی ڈاکٹر پر اعتماد نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے مس سارہ چرچل نے اپنی اور میری ڈیوٹی لگائی کہ باری باری مسٹر چرچل کی نگرانی کریں گے۔

رات گیارہ بجے مس سارہ چرچل مجھے اپنے والد کے پاس چھوڑ کر آرام کرنے چلی گئیں۔ مسٹر چرچل گہری نیند سو رہے تھے۔ ان کے سانس لینے کی آواز مجھے بخوبی سُنائی دے رہی تھی۔ انھیں نیند میں خراٹے لینے کی پُرانی عادت تھی۔ میں ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا اور پڑھتا رہا۔ مسٹر چرچل کے خراٹوں کی آواز میرے کمرے میں برابر گونجتی رہی۔ نہ جانے کس وقت مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی اور آنکھ یکایک اس وقت کھلی، جب کمرے میں بھیانک خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ مسٹر چرچل کے خراٹے بند ہو چکے تھے اور سانس لینے سے اُن کے جسم میں زیر و بم کی جو کیفیت پیدا ہو رہی تھی وہ بھی زائل ہو چکی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری رُوح کھنچ کر کلیجے میں سمٹ آئی ہے۔ سب سے پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ وزیرِ اعظم ختم ہو گئے۔ میں نے کرسی سے اٹھنا چاہا، لیکن اعصاب نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ چیخنے کی کوشش کی، مگر آواز حلق سے نہ نکلی۔ اس روز جیسی میری حالت ہوئی، اس سے پہلے نہ آئندہ کبھی سابقہ پڑا۔ میرا جسم پسینے میں نہا گیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے چرچل کے بستر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے یکایک ہوش آیا۔ میں لپک کر بستر کے قریب پہنچا اور مسٹر چرچل کے تکیے پر جھک کر آواز سُننے کی کوشش کی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہے تھے۔ میں دوڑتا ہوا لارڈ مورن کے کمرے میں پہنچا اور انھیں یہ خبر سُنا کر

بدحواس کر دیا اور وزیرِ اعظم کی نبضیں رُک گئی ہیں۔ لارڈ موران اُٹھے اور ننگے پیر دوڑتے ہوئے مسٹر چرچل کے کمرے میں آئے اور معائنہ کرنے کے بعد کہنے لگے،

"بندۂ خدا تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔ مسٹر چرچل اب اچھی طرح سانس لے رہے ہیں۔ آپ براہِ کرم باہر تشریف رکھئے۔"

میں شرمندہ ہو کر باہر چلا آیا اور دروازے کے قریب کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ لارڈ موران پانچ منٹ بعد باہر نکلے اور "شب بخیر" کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

آدھ گھنٹے بعد کمرے میں سے کھڑبڑ کی سی آواز سنائی دی۔ میں فوراً اندر گیا۔ کیا دیکھتا ہوں مسٹر چرچل ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑے دراز میں کھول کر کچھ تلاش کر رہے ہیں۔ میرے قدموں کی آہٹ سُن کر وہ مُڑے۔ اُن کی آنکھیں سُرخ اور بوجھل تھیں۔

"تھامپسن، خواب آور گولیاں کہاں رکھی ہیں؟"

ڈاکٹر نے منع کر رکھا تھا کہ مسٹر چرچل کو خواب آور گولیاں ہرگز نہ دی جائیں اسی لئے گولیوں کا پیکٹ دراز میں نہ تھا۔

"جناب، لارڈ موران نے گولیاں استعمال کرنے کی ہدایت نہیں کی۔ آپ کی صحت کے لئے یہ گولیاں مضر ہیں۔"

اُنھوں نے اثبات میں سر ہلایا اور بستر پر لیٹ کر معصوم بچے کی طرح آنکھیں بند کرلیں۔

کئی روز تک اُن کی طبیعت کا یہی عالم رہا۔ اس دوران میں جنرل آئزن ہاور کئی مرتبہ وزیرِ اعظم کی عیادت کے لئے آئے اور انھوں نے اپنے خصوصی معالجوں کو مسٹر چرچل کا طبی معائنہ کرنے کی ہدایات کیں اور تیمارداری کے لئے قابلِ اعتماد نرسیں مقرر کیں۔

کرسمس کے دن ہم نے تیونس ہی میں گزارے اور جب مسٹر چرچل کی صحت قدرے درست ہوئی، تو ہم ہوائی جہاز کے ذریعے مراکش روانہ ہوئے۔ رائل ایرفورس کا ایک ڈاکٹر آکسیجن وغیرہ لے کر ہمارے ساتھ گیا اور ہم نے سات ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کی۔ مراکش میں ایک ہفتہ قیام کے دوران ہم نے مسٹر چرچل کو دماغی کام کرنے کا موقع نہ دیا، بلکہ تفریح کے پروگرام بناتے رہے۔ یہاں سے ہم جبل الطارق پہنچے اور بحریہ کے ایک جہاز میں سوار ہو کر وطن کی طرف چل پڑے۔

قوم نے اپنے وزیرِ اعظم کا جس جوش و خروش اور والہانہ انداز میں استقبال کیا، اس سے چرچل بے حد متاثر ہوئے۔ میں نے بارہا ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور کئی مرتبہ تو وہ فوجی دستوں کی سلامی لیتے ہوئے بچوں کی طرح بلبلا کر روئے۔ قوم اور فوج سے اُن کی محبت بے پناہ تھی ۱۹۴۴ء چرچل کی زندگی میں بے حد مصروفیت کا سال تھا۔ رات کو دو یا تین گھنٹے سونے کے علاوہ انھوں نے بیس بیس گھنٹے روزانہ کام کیا۔ دورے، تقریریں، ملاقاتیں، معائنے، تصنیف و تالیف، غرض یہ کہ اُن پر کام کرنے کا جُنون... (MANIA) سوار تھا۔

۱۲؍اپریل ۱۹۴۵ء کا دن میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔ صبح کے تین بجے تھے۔ میرے کمرے میں لگی ہوئی گھنٹی بجی۔ اس گھنٹی کا بٹن مسٹر چرچل کے کمرے میں تھا۔ میں حواس باختہ ہو کر ان کے کمرے میں داخل ہوا، تو دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں اور ایک ہی لفظ ان کی زبان سے بار بار ادا ہو رہا ہے۔

"اُف.... اُف...."

مجھے دیکھ کر وہ چپ ہوئے، شدّتِ جذبات سے ان کا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے اُن کی ایسی حالت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ انھوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

"تھامپسن، تمہیں معلوم ہے صدر روزویلٹ

گئے۔"

مجھے دھچکا سا لگا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ صبح کے تین بجے مسٹر چرچل مجھے یہ اندوہناک خبر سنائیں گے۔

وہ دیر تک اپنے پرانے اور عزیز دوست روزویلٹ کو یاد کر کے آنسو بہاتے رہے اور آخر میں انھوں نے یہ کہہ کر مجھے چونکا دیا:

"تھامپسن، جانتے ہو آج کیا تاریخ ہے؟ تیرہ۔"

شاید بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ مسٹر چرچل بھی ۱۳ کا عدد بہت منحوس سمجھتے اور اس معاملے میں اپنے ہم قوموں کی پیروی کرتے تھے۔ مجھے بہت سے دلچسپ واقعات یاد ہیں جو "چرچل کی تیرہ تاریخ" کے عنوان سے قلم بند کئے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ تیرہ کا عدد خود چرچل کے لئے کبھی منحوس ثابت نہ ہوا، لیکن اُن کے دل و دماغ پر ابتدا ہی سے ہیبت طاری تھی۔ وہ تیرہ تاریخ کو کوئی نیا منصوبہ نہ بناتے، سفر کرنے سے پرہیز کرتے اور اس روز تیرھویں ملاقاتی کو اپنے پاس آنے کا موقع نہ دیتے۔ جس ہوائی جہاز میں سفر کرتے یا محفل میں جاتے، تو وہاں دیکھ لیتے کہ تیرہ کا عدد تو موجود نہیں۔

مجھے یاد آتا ہے کہ قاہرہ میں جس روز صدر روزویلٹ کے ہمراہ اہرام دیکھنے گئے، تو ہماری جماعت تیرہ افراد پر مشتمل تھی۔ چرچل نے محافظوں میں سے فوراً ایک آدمی کو خارج کر دیا۔

وہ سگار پینے کے بے حد عادی تھے، حتیٰ کہ سگار چرچل کی خاص علامت (SYMBOL) بن گیا ہے۔ دن بھر میں نہ جانے کتنے سگار پی جاتے، لیکن تیرہ تاریخ کو وہ بارہ سگار گن کر اپنے پاس رکھتے اور پورا دن انہی سگاروں سے شغل کرتے۔ تیرھواں سگار انھوں نے کبھی نہیں سلگایا۔

مسٹر چرچل اپنی بے پناہ عظمت اور عبقریت کے باوجود زمانۂ قدیم کے باوضع اور با اُصول انگریزوں کی سچی تصویر تھے۔ اُن میں بیک وقت کئی شخصیتیں جمع ہو گئی تھیں۔ سپاہی، سیاستدان، مدبّر، فلسفی، ادیب، مؤرخ، اخبار نویس، مصوّر اور رہنما۔

بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ اگر ہماری قوم میں چرچل کا وجود نہ ہوتا، تو شاید ہم کرۂ ارض سے نابود ہو جاتے۔ اس ایک شخص نے برطانوی قوم کو تباہی سے بچایا، کیا ایسی شخصیت پھر کبھی ہمارے ہاں پیدا ہوگی؟ ★★

بندوقوں کے سائے تلے



مصنف:۔ جان محمد خاں۔ تلخیص:۔ دیوان تاراچند

یہ داستان ایک ایسے شخص کی ہے جو سکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا۔ جو انیس برس کی عمر میں آسٹریلوی فوج میں بطور سپاہی بھرتی ہوا۔ اس نے دوسری عالمگیر جنگ کا کچھ حصہ یورپ میں گذارا۔ لیکن جونہی جنگ ختم ہوئی اس کی پلٹن جاپان بھیجدی گئی لیکن جب اس نے جاپان میں سپاہی کی زندگی بے کیف اور مرجھائی ہوئی پائی تو اس کے گرم خون میں تلاطم خیز طوفان برپا ہو گئے وہ آسٹریلوی فوج کو خیرباد کہکر فرانسیسی فوج میں بھرتی ہو گیا، چونکہ آسٹریلوی فوج میں وہ وارنٹ آفیسر کے عہدے پر فائز تھا لہٰذا فرانسیسی فوج میں بھی اسے یہی عہدہ نصیب ہوا۔ سیگاؤں پہونچکر اسے جس زندگی سے دوچار ہونا پڑا وہ ایک لرزہ خیز کہانی ہے وہاں اس نے ایک سرکس سے شیر کا بچہ بھی حاصل کیا جو کافی عرصہ تک اس کا ساتھی بنا رہا۔

وہ رقمطراز ہے کہ جنگ کی وجہ سے وہاں کے باشندے کس کسمپرسی میں اپنے شب و روز گذارنے پر مجبور تھے وہاں کی نوخیز کلیوں ایسی حسین دوشیزائیں آدھی ڈبل روٹی، مکھن کی ٹکیہ اور سگریٹ کے پیکٹ کے بدلے اپنی عصمت فروخت کرنے پر مجبور تھیں، سیگاؤں سے وہ سنگاپور پہونچا وہاں کچھ دیر ٹھہر کر پاکستانی فوج میں بھرتی ہو گیا پاکستانی اور افغانستانی سرحد پر مغربی چترال کے قریب تعینات ہوا تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان اسمگلنگ کی بیخ کنی کرے وہاں ۲۰ لاکھ روپے کی اسمگلنگ کو اس نے کس انداز سے روکا، رونگٹے کھڑے کرنے والا واقعہ ہے پاکستان میں وہ ایک بار سخت بیمار ہو گیا وہاں اس کی ایک ایسی نرس سے ملاقات کی جس کے دام گیسو میں پھنس کر اسلام قبول کیا پھر جان سینرک سے جان محمد بن گیا کچھ عرصہ کے بعد وہ پاکستانی فوج سے سبکدوش ہو کر شمالی افریقہ کے کسی عرب ملک کی فوج میں ملازمت کرلی کہ اس کی غیر حاضری میں اس کی بیوی اور بچہ اچانک وفات پاگئے جن کی جدائی کو وہ برداشت نہ کرسکا۔

آج کل وہ گوجر خان (پاکستان) کے قریب ایک گاؤں میں مقیم ہے جہاں اس نے اپنی بیوی کی یاد میں اسکول کھولا ہوا ہے۔ فرصت کے وقت اپنے ملنے والوں کو اپنی زندگی کے حالات سناتا ہے۔

(مدیر)

میں نے دوسروں کی خدمت کے لئے فوجی پیشہ اختیار کیا تھا تاکہ بے کسوں اور مظلوموں پر اندھا دھند گولیاں چلا کر اپنے حکام سے شجاعت حاصل کروں اور پیٹ پال سکوں۔ اس وقت مجھے اپنے اس پیشے پر اتنا ہی ناز تھا جتنا کہ کسی دوکاندار کو دکانداری سے، یا معلم کو بچوں کی تعلیم دینے سے یا کسی مؤذن کو اذان دینے سے مجھے اس وقت انتہائی غصہ آتا تھا جب لوگ بھاڑے کے ٹٹو کے نام سے پکارتے تھے۔

مرے سے نری یعنی کرائے پر فوجی بننا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس کام میں کسی فوجی کو بھروسہ نہیں کہ اس کی روح کب قفس عنصری سے پرواز کر جائے نہ تو کوئی اس کی لاش پر آنسو بہاتا ہے اور نہ اسے کسی قسم کی پنشن ملتی۔ اور کسی قسم کا پرچم اس کی یاد میں سرنگوں نہیں ہوتا۔ اس کے مردہ جسم کو کفن دفن کی بجائے چیل کوؤں، گدھوں اور کتوں کا نوالہ بننا پڑتا ہے گھر والوں کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان کا لاڈلا بچہ یا بھائی کس کسمپرسی کی حالت میں اس جہان سے اس

جگہ چلا گیا، جہاں سے کوئی شخص واپس لوٹ کر نہیں آتا۔ اگر بھاڑے کا سپاہی دشمن کے پلے پڑ جائے تو اسے ذلت و خواری ان گنت مصیبتوں کے سوائے اچھے سلوک کا حقدار نہیں سمجھا جاتا۔

مجھ سے اکثر سوال پوچھا جاتا ہے کہ ان حالات کے پیش نظر بیشتر نوجوان مرسے نری بننا کیوں پسند کرتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کے مختلف ممالک (زیادہ تر افریقی) میں لاکھوں نوجوان مرد بطور مرسے نری فوجی لباس زیب تن کئے ہوئے ہیں اور آتشیں اسلحہ سے مسلح ہیں۔ ان میں ڈاکٹر بھی ہیں اور انجنیئر بھی۔ فلاسفر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ ان کی تنخواہ منہ مانگی ہوتی ہیں۔ اگرچہ عرصہ ملازمت تین ماہ سے چھ ماہ تک یا کبھی طول پکڑے تو نو دس مہینے ہو جاتا ہے اس قلیل عرصہ میں ان سپاہیوں کو خطرناک مہموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو مرد موت کو کھلونا سمجھتے ہیں وہ اس ملازمت کو لبیک کہتے ہیں لڑائی کے دنوں میں وہ اپنے "مالک ملک" کے دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور "امن" کے دنوں میں ان کے فوجیوں کو اسلحہ چلانے کی خاطر خواہ تربیت دیتے ہیں۔

یہ مرسے نری ان ملکوں کی فوجوں میں بھرتی ہوتے ہیں جو دوسری عالمی جنگ کے بعد آزاد ہوئے ہیں عرب افریقی ممالک اور مصر وغیرہ وغیرہ۔

پہلے پہل ۱۹۳۶ء میں اسپین کی خانہ جنگی میں مرسے نری بھرتی کئے گئے تھے اس خانہ جنگی میں وہ اشخاص بطور مرسے نری ہوئے جن کے فکر و ذہن اشتراکیت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے وہ کسی وقتی لالچ کی وجہ سے بھرتی نہیں ہوئے تھے بلکہ اپنے ذہن کے رجحان کی تشنگی کو دور کرنے کی غرض سے موت کی وادی کی طرف قدم بڑھائے، ان میں سے بیشتر کوئی نشان چھوڑے بغیر ہوا میں یوں تحلیل ہو گئے گویا ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ لیکن آج کل حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ ہر مرسے نری کی خواہش ہے کہ زندگی کو خطرے میں ڈال کر زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرے انھیں اچھی طرح معلوم ہے فائدہ کے ساتھ موت بھی گامزن ہے۔ ہر ایک غلط قدم فنا کا پیغام دیتا ہے، خطرے، ضبط، مردانگی و شجاعت کے ہم رکاب ہیں۔

میں اس بات کو ماننے سے انکار نہیں کرتا کہ زیادہ تر مرسے نری "ٹھگ، چور، اور جرائم پیشہ" کے جراثیم کے مالک ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان کا دماغ تشدد کی طرف مائل ہوتا ہے ان کے نزدیک فوجی وردی پہننا اور اسلحہ سے لیس ہونا ہی مردانگی کی نشانی ہے میں ایک مرسے نری کو جانتا ہوں جس نے اپنی سابقہ زندگی کا کافی عرصہ نیویارک کی سنٹرل جیل میں گزارا تھا۔ اس پر پسٹول، قتل و غارت کے مقدمے چلے، جب وہ جیل سے رہا ہوا تو اسے عامیانہ زندگی میں کوئی دلچسپی نظر نہ آئی۔ لہٰذا وہ جیل کے پرانے ساتھی کے ہمراہ پاکستان جا کر مرسے نریوں میں شامل ہو گیا، ابھی اسے آزاد کشمیر آئے ہوئے کچھ ہفتے ہی گذرے تھے کہ ایک دوسرے مرسے نری نے رات کے اندھیرے میں اس کا گلا گھونٹ دیا، پوچھ تاچھ کے بعد قاتل نے عدالت کو بیان دیا کہ مقتول نے اس کی بارہ سالہ بیٹی کے ساتھ منہ کالا کر کے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا پھر وہ وہاں سے چھلاوہ کی مانند غائب ہو گیا۔ وہ اپنی بچی کی موت پر پاگل سا ہو گیا تھا۔ وہ اس کی تلاش میں کناڈا، برطانیہ، فرانس جرمنی، مصر سے ہوتا ہوا پاکستان پہونچ گیا۔ یہاں آکر

جان محمد خاں
گل لالہ
نسیمہ
اور
دل عزیز



صوبے دار گلدار خاں

اس کا متواتر تین سال کا سفر پھل لایا۔ اور اسے اپنی بیٹی کا قاتل مل گیا۔ اس نے نفرت کے جذبہ کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ پھر ایک رات اس نے اسی طرح اس کا گلا گھونٹ دیا۔ قاتل کو کیا سزا ملی مجھے کچھ معلوم نہیں لیکن آج کل وہ پاکستان میں نہیں ہے۔

ایک اور مرسے نری کا قصہ مجھے یاد آیا وہ ویتنام کی جنگ میں نہتے کسانوں، عورتوں اور بچوں کو اپنے گرینیڈوں

کا نشانہ بنا کر قہقہے لگایا کرتا تھا۔ جب میں نے ان قہقہوں کی وجہ پوچھی تو بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا

جان تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ گرینیڈ بدنصیب انسانوں کو زندگی کی کشمکش سے آزاد کرانے کے لیے بنائے گئے ہیں، تو میں ان کو آزاد ہونے میں کیوں تاخیر کردں وہ کئی سالوں سے کتوں اور بلیوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اس کا یہ جواب سن کر میں نے نفرت سے زمین

پر تھوک دیا۔

سب ہی مرسے نری انسی طبیعت کے مالک نہیں ہوتے جیسے میں ہوں ۱۹۴۴ء میں میری عمر ۱۹ برس کی تھی کہ میں آسٹریلوی فوج میں بھرتی ہو گیا اگرچہ میری پیدائش اسکاٹ لینڈ میں ہوئی تھی میں نے جاوا، سماٹرا، اور بورینو، کی لڑائیوں میں خاطر خواہ حصہ لیا تھا۔ جب دنیا میں امن قائم ہو گیا تو میں جاپان میں امریکی قابض فوج کا ایک رکن بن گیا۔

میں نے ان لڑائیوں میں حصہ لیا تھا جب۔ آسمان سے موسلا دھار بارش ہونے کے بجائے دل کو ہلا دینے والے توپوں کے گولے برستے تھے، چاروں طرف تباہی و بربادی کا دور دورہ تھا، میں نے زندگی اور موت کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ لیکن جاپان میں امن کی زندگی مجھے راس نہ آئی میں آسٹریلوی فوج چھوڑ کر سیگاؤں چلا گیا جہاں فرنچ انڈو چائنا کے قوم پرستوں نے فرانسیسی فوج کے چھکے چھڑا دیئے تھے فرانسیسی فوج میں بطور انسٹرکٹر بھرتی ہو گیا، ہمیں حکم ملا کہ ہم مقامی "وفادار" لوگوں کو تھوڑے عرصہ میں مناسب فوجی ٹریننگ دے کر اس قابل بنا دیں تاکہ وقت آنے پر دشمن کے دانت کھٹے کر سکیں۔

میں "دشمن" کا مفہوم نہ سمجھ سکا۔

وہاں مجھے سارجنٹ کا عہدہ ملا۔ رنگروٹوں کو تربیت دینے کا یہ معمول تھا وہ صبح پونے پانچ بجے بستر سے بیدار ہو جاتے تھے، پھر چائے کا پیالہ پی کر ڈیڑھ گھنٹہ سخت ورزش کرتے اس کے بعد انھیں ناشتہ ملتا پندرہ منٹ آرام کرنے کے بعد بارکوں کی صفائی کی جاتی، ٹھیک آٹھ بجے مختلف آتشیں اسلحہ کو استعمال کرنے کی ٹریننگ شروع ہو جاتی جو ایک بجے دوپہر تک رہتی دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد دو گھنٹے آرام کے لئے ملتے پھر سب رنگروٹوں کو جنگل کی لڑائی سکھائی جاتی پندرہ روز کے بعد پورے ایک دن کی رخصت ملتی۔ تاکہ سیگاؤں جا کر شہر کی گھما گھمی میں حصہ لیکر تازہ دم لوٹیں۔

تربیت دہندگان پر بہت کم پابندیاں عائد تھیں۔ اس لئے ہم لوگ شام کے وقت سیگاؤں کے شہر میں سیر کرنے چلے جاتے، اس شہر کے باشندگان کی حالت ابتر تھی، کیونکہ جنگ کی وجہ سے اشیائے خوردنی کی اس قدر کمی واقع ہو چکی تھی کہ نوجوان عورتیں نصف ڈبل روٹی، آدھی ٹکیہ مکھن کی، یا ڈبہ بھر چینی، اور سگرٹوں کے ایک پیکٹ کے بدلے عصمت فروشی کرانے پر مجبور تھیں ابھی ہم لوگ شہر کے صدر دروازے تک نہ پہونچتے تھے کہ اٹھارہ، انیس سال کی دوشیزائیں پھٹے پرانے کپڑے پہنے جن کے سوراخوں سے ان کی نوجوانی اچھل اچھل کر انسانیت کی موت پر آنسو بہاتی تھی، سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر اپنی مادری زبان میں بلند آواز سے کہتی تھیں جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے،

"اے یورپی سپاہی تو بڑا خوش نصیب ہے جو ہمارے ملک میں ہمیں قتل و برباد کرنے یہاں آیا ہے خبر اب ایک آدمی روٹی کے عوض میرا سڈول جسم تمہیں خوش آمدید کہہ رہا ہے تاکہ میں یہ ڈبل روٹی اپنے دودھ پیتے بھائی کو گرم پانی میں بھگو کر کھلا سکوں۔"

مرسے نری ٹرکوں سے اتر کر ان بدنصیب لڑکیوں کے پاس جاتے جن کی آنکھوں میں یاس اور حسرت ٹپکتی اپنے انجام سے بے خبر مرسے نری ان لڑکیوں کے نیم برہنہ جسموں کو اپنی سخت انگلیوں سے یوں ٹٹولتے جیسے منڈی میں



جذری العبّاس

میں

جان محمد خاں

عقاب بھیڑ بکریوں کے جسموں کو دبا دبا کر بھانپتے ہیں۔

میں بھی ان خونخوار خریداروں میں سے ایک تھا۔

میں نے دنیا کے کئی ملکوں میں بطور مرسے نری کام کیا ہے خوفناک بھیانک اور لرزہ خیز مہموں کو سر کرنے کے لئے خود کو موت کی وادیوں میں دھکیلا تھا لیکن سیگاؤں کی دوشیزاؤں کی ابتر اور مایوس کن حالات کو یاد کر کے میرے جسم میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔

مرسے نریوں کا تو ذکر ہی کیا کردن فرانسیسی فوجی افیسروں نے اپنی بارکوں میں حرم بنا رکھے تھے، بھوک پیاسی اور مصیبت کی ماری عورتیں مٹھی بھر چاول اور چائے کے دو پیالوں کے بدلے اپنی عزت اور آبرو کا اثاثہ لٹانے کے لئے تیار ہو جاتیں۔ ایک بیان کے مطابق ایک فرانسیسی جنرل نے ۵۰ کے قریب ویت نامی عورتوں کو اپنے قبضہ میں رکھا ہوا تھا اتوار کے روز تمام عورتیں برہنہ ہو کر اس کی خدمت میں جٹ جاتیں اس کے حرم میں کیا گزرتا تھا مجھے کچھ علم نہیں ہے لیکن ہاں اتنا میں جانتا ہوں کہ تیسرے چوتھے روز حرم کی پانچ چھ عورتوں کی لاشیں دفنانے کے لئے سپاہی بیلچے اٹھائے قبرستان کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتے ایک مرتبہ ایک فرانسیسی اخبار کے نمائندے نے جنرل سے سوال کرتے ہوئے پوچھا۔

آپ کو اتنی زیادہ عورتیں حرم میں رکھنے کا کیا فائدہ ہے

جنرل نے ہنس کر کہا۔

"فوجی کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں کہ اگلے چند لمحوں میں اس کی زندگی پر کیا گزرنے والا ہے اس لئے بطور فوجی میں ان باریکیوں میں پڑ کر اپنا دماغ پراگندہ کرنا نہیں چاہتا۔ قدرت نے عورتوں کو کھلونا بنایا ہے تاکہ مرد فرحت کے وقت اس کے ساتھ کھیل سکے، اس لئے میں جنگی صعوبتوں کو بھول کر فرحت کے لمحات کو پرسکون طریقے سے گزارتا ہوں۔

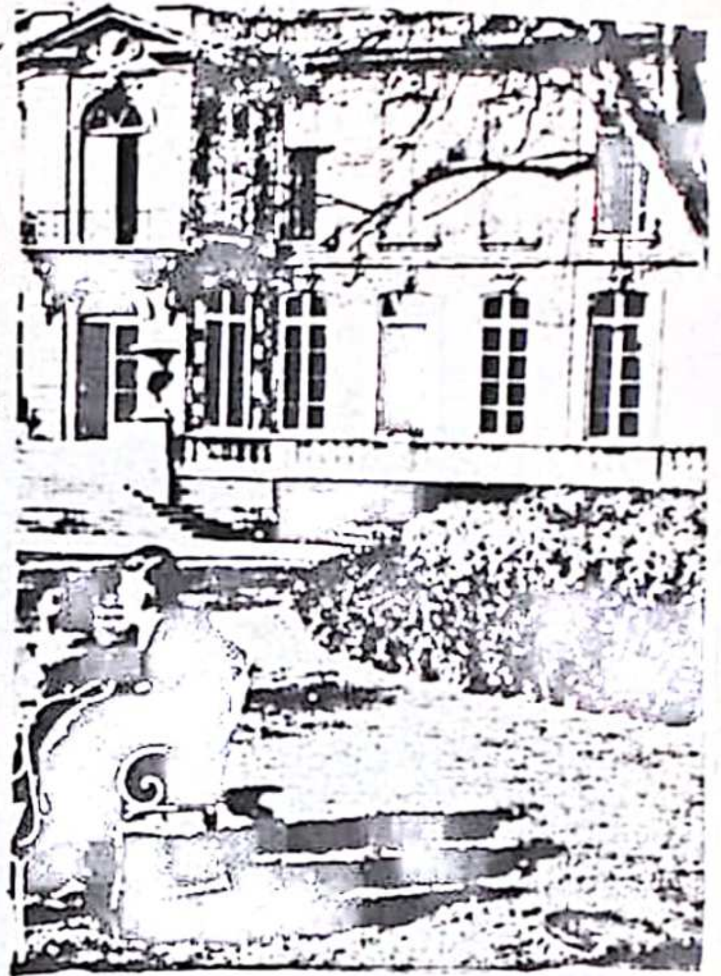
سیگاؤں میں رہ کر میں نے فرانسیسی زبان پر کافی عبور حاصل کر لیا تھا۔ اسی عرصہ میں ایک فرانسیسی کرنل کی بیوہ سے میری واقفیت ہو گئی۔ عورت بڑی طرحدار

اس مہم میں میرے سپاہیوں کے ہاتھوں سینکڑوں بے گناہ کسان موت کے گھاٹ اتارے گئے چونکہ اب میری طبیعت پوری طرح جھڑپوں سے خوگر ہو چکی تھی، لہٰذا ادھر ادھر لاشوں کو پڑی دیکھکر مجھے کسی قسم کا قلق نہ ہوتا تھا بلکہ میرا ضمیر اتنا گر چکا تھا کہ ایک بار میں نے مردہ ویت نامیوں کی لاشوں سے کپڑے اتروا ئے۔ تاکہ وہ کپڑے کسی اور کام آسکیں لاش کو برہنہ کرنا ہر ملک میں معیوب سمجھا جاتا ہے مگر ویت نام کی جنگ میں ہر حرکت کی اجازت ہے۔ اگرچہ اس واقعہ کو ۲۳، ۲۴ برس کا عرصہ ہو چکا ہے مگر جب ان لاشوں کی برہنگی میری نظروں میں گھومتی ہے تو میرے تمام جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتی ہیں

ایک روز دو ویت نامی بانس سے بندھے ہوئے سؤر کو میرے پاس لاکر بولے۔

"صاحب ہم نے بڑی مشکل سے جنگلی سؤر مارا ہے اب اسے تحفہ کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کرنے آئے ہیں"

جنگلی سور کو دیکھکر میرے سپاہی خوشی سے پھولے نہیں سمائے انھوں نے خوشی خوشی سور کو ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔ شام کو جب اسے دو سپاہی صاف کرنے لگے تو دھماکے سے دونوں کے پرخچے اڑ گئے تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ اس مردہ سور کے پیٹ میں ڈائنامیٹ رکھا ہوا تھا جو ان سپاہیوں کا جان لیوا بنا۔ اس واقعہ سے ہمارے خیمہ میں سراسیمگی پھیل گئی بدلہ لینے کی غرض سے میں نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ باہر جاکر راستے میں کھڑے ہو جاؤ جو پہلے تین ویت نامی تمہارے پاس سے گذریں، ان کی گردنیں کاٹ کر درختوں پر لٹکا دو تاکہ دوسرے ویت نامی اس سے عبرت حاصل کریں۔



رہائشی فلیٹ

تھی اداؤں اور عشووں سے اس نے مجھے اپنے پھندے میں پھانس لیا۔ اس عورت کے ساتھ میں نے شب و روز گذارنا شروع کئے مگر وہ ہفتوں کے بعد مجھے ایک بھیانک بیماری نے آگھیرا جس کا نام بتاتے ہوئے مجھے شرم دامن گیر ہے۔ قارئین اس بیماری کا نام سمجھ گئے ہونگے پورے دو ماہ میں نے ملٹری ہسپتال میں قیام کیا، میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں انجکشنوں نے یورش نہ کی ہو، میں نے کان پکڑ کر توبہ کی کہ اگر زندگی نے وفا کی تو میں بھول کر بھی کسی عورت کے قریب نہ جاؤں گا

۱۹۶۸ء میں لیفٹننٹ بن گیا اور چھ ماہ تک ۵۰ سپاہیوں کے قائد کی حیثیت سے وطن پرست چھاپہ ماروں کی بیخ کنی کے لئے جنگلوں میں مارا مارا پھرا۔

شام کو مجھے پتہ چلا کہ میرے سپاہیوں نے اسکول سے آتے ہوئے تین معصوم بچوں کو قتل کر کے میرے حکم کی تعمیل کی ہے اور ان کی گردنیں سڑک کے کنارے درختوں پر لٹکا دی گئی ہیں۔

اس طرح ہمارے سپاہیوں نے یورپی تہذیب کا مضحکہ اڑایا۔۔۔ سنگاپور میں اپنی ملازمت کی مدت ختم کر کے جب میں سنگاپور پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ پاکستانی حکام مر سے زبوں کو بھرتی کر رہے ہیں۔ تاکہ وہ ان کی فوج کے سپاہیوں کو مناسب ٹریننگ دے کر ہوشیار اور پختہ کار فوجی بنا سکیں ان کو آزادی ملے دو سال ہی گزرے تھے جب میں ملازمت کے سلسلہ میں ان کو اپنا فوجی تجربہ بتایا تو مجھے فوراً بھرتی کر لیا گیا۔

پاکستانی فوج میں مجھے کیپٹن کا عہدہ ملا تھا۔

سرحدی صوبہ کے قبائلیوں کی عادات اور اوصاف ابھی تک میرے ذہن پر کندہ ہیں اگر آپ ان کو ایک بار "برادر" کے نام سے پکاریں گے تو زندگی بھر آپ کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کریں گے سلطان خان بھی ایک ایسا ہی نوجوان تھا۔ جسے میں برادر کے نام سے پکارتا تھا۔ ایک بار غلطی سے میری بندوق کی گولی ایک دیہاتی کی ٹانگ چیرتی ہوئی نکل گئی۔ وہ دیہاتی سلطان خان کے گاؤں کا رہنے والا تھا، اس واقعہ سے وفادار قبائلیوں میں غصہ کی لہر پھیل گئی وہ سینکڑوں کی تعداد میں اکٹھے ہو کر ہمارے کمانڈنگ آفیسر کے سامنے حاضر ہوئے اور مطالبہ کیا کہ "انگریز" کو ان کے حوالے کیا جائے، کمانڈنگ آفیسر کا نام لیفٹیننٹ کرنل نسیم حیدر تھا وہ تذبذب میں پڑ گیا کہ کیا قدم اٹھائے کہ سلطان خان نے آگے بڑھ کر کہا۔

"حضور میں زخمی آدمی کو بیس بھیڑیں بطور تاوان دینے کو تیار ہوں اگر انگریز پر کسی قسم کی پابندی نہ لگائی جائے۔"

جب اس سے اس تاوان دینے کی وجہ پوچھی گئی تو وہ آنکھیں نیچی کر کے بولا۔

"انگریز میرا برادر ہے"

ستمبر ۱۹۵۱ء میں مجھے اپنی رجمنٹ کے ہمراہ چترال کے مغرب میں جانا پڑا کیونکہ وہاں ایک درے کے راستے سے افغانستان اور پاکستان کے درمیان بھاری اسمگلنگ ہونے کی خبریں مل رہی تھیں ہمارا کام اسمگلنگ کا انسداد کرنا تھا ایک روز میں اپنے خیمے میں بیٹھا ہوا اپنے چھوٹے بھائی کو خط لکھ رہا تھا کہ ایک سپاہی نے آکر کہا

"جناب دریا کے اس پار کچھ لوگ ایک میت کو لئے ہوئے ہیں تاکہ دریا کے اس پار پاکستان کے علاقہ میں واقع فقیروں کے قبرستان میں لاش کو دفن کر سکیں لاش بھی ایک ایسے فقیر کی ہے جو اسی علاقہ کا رہنے والا تھا۔ جب آپ کا حکم نہ ہو وہ سرحد پار نہیں کر سکتے۔"

میں نے چند لمحے سوچ کر کہا۔

"ٹھیک ہے ان سب کا نام اور پتہ لکھ کر انہیں قبرستان تک جانے دو۔"

قبرستان ہمارے کیمپ سے تھوڑی دور ہی واقع تھا ایک صوبیدار جس کا نام گل داؤد خان تھا، چار سپاہیوں کو اپنے ہمراہ لیکر قبرستان تک گیا قبائلیوں نے میت کو چارپائی سے اتار کر زمین پر رکھا، قبر پہلے ہی تیار تھی، جنازہ کی نماز پڑھ کر لاش قبر میں اتار دی گئی ایک گھنٹے کے بعد صوبیدار اور سپاہی اپنے خیموں میں واپس لوٹ آئے۔

رات کے گیارہ بجے کا عالم ہوگا کہ میری آنکھ کھل گئی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کچھ دور تین چار آدمی سرگوشیاں کر رہے ہیں میں نے ایک دم اور کوٹ پہنا اس کی جیب میں پستول رکھا اور اسٹین گن سنبھالے اپنے خیمے سے باہر آیا۔ اب آوازیں آنا بند ہوگئیں لیکن قبرستان کی جانب سے مجھے مدھم روشنی آتی دکھائی دی میں نے صوبیدار گل داد خاں کو ساتھ لیا اور بلی کی چال سے روشنی کی جانب چل دیا۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ہم نے دیکھا کہ چار قبائلی شام والی قبر سے مردہ نکال رہے ہیں یہ دیکھ کر گل داد خاں طیش میں آگیا کہ مردود اور ذلیل لوگ مردے کی بے حرمتی کر رہے ہیں لیکن میں نے اس کا بازو تھام کر اسے بڑی آہستگی سے کہا۔

"صوبیدار صبر سے کام لو، طیش میں آکر سارا کام بگڑ جائیگا۔ آؤ دیکھیں قبر چور مردے کو نکال کر اگلا قدم کس طرح اٹھاتے ہیں۔

چوروں نے مردے کو لٹا کر اس کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ ہم حیران و ششدر رہ گئے جب ہم نے دیکھا مردہ کے پیٹ میں بہت چھوٹے چھوٹے ٹرانسسٹر سونے کی لاتعداد گھڑیاں اور ہیرے رکھے ہوئے تھے میں نے گل داد خاں کو مزید سپاہی لانے کا حکم دیا۔

آنکھ جھپکتے ہی گل داد خاں چھ سپاہیوں کی جمعیت لے آیا۔ چوروں کو گھیر کر گل داد خاں نے مقامی زبان میں حکم دیا۔

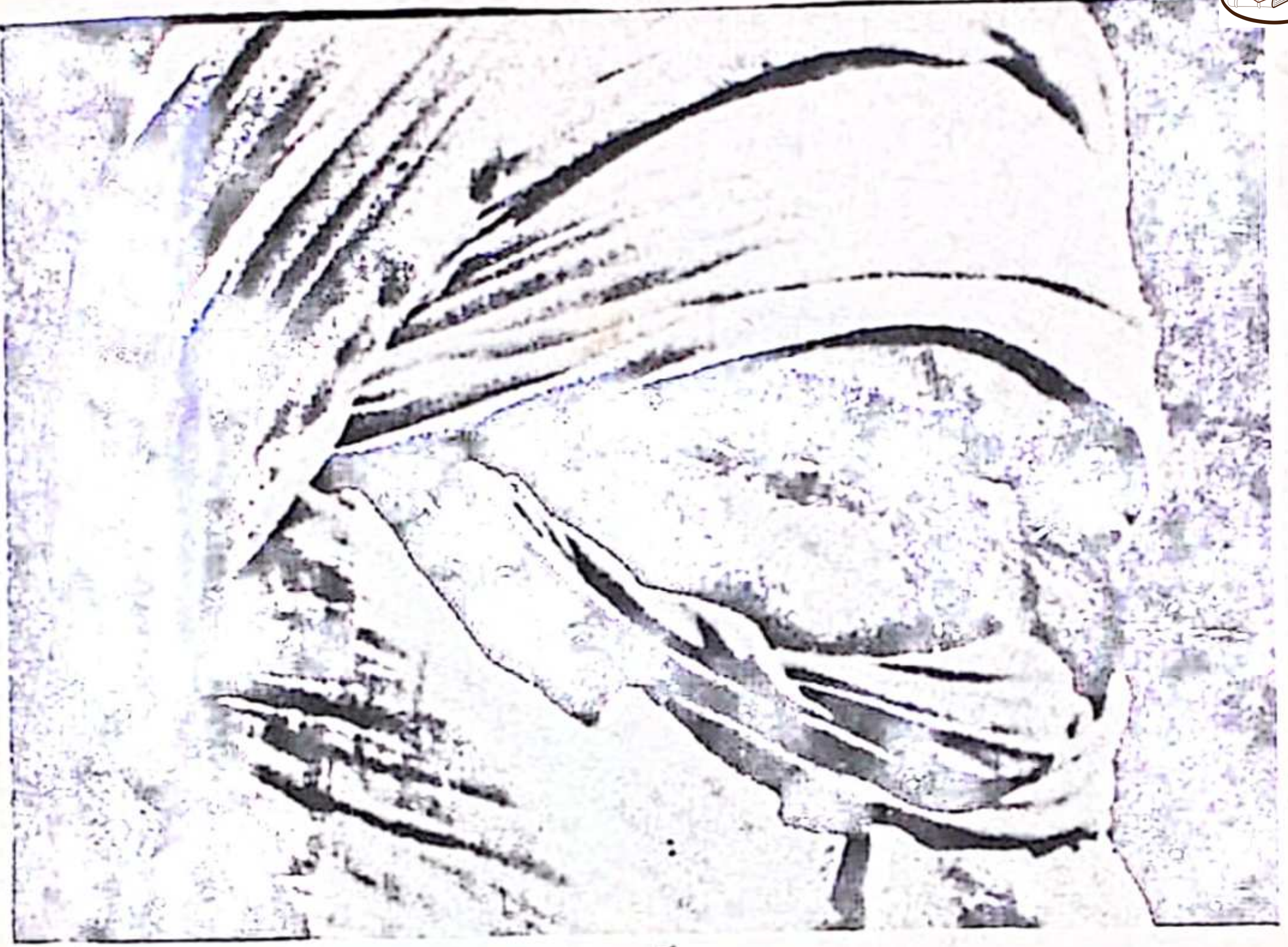
" اگر اپنی جان کی خیر چاہتے ہو جہاں ہو وہیں اپنے اپنے ہاتھ سروں پر رکھ لو۔ ورنہ گولیوں سے بھون دیئے جاؤ گے "

قبر کے قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ اسمگلروں نے جدید ترین طریقہ سے اسمگلنگ کا ڈھنگ نکالا ہے انھوں نے پلاسٹک کے بنے ہوئے آدمی کے پیٹ میں بیش قیمت اشیاء رکھ کر میت کو دفنانے کا ڈھونگ رچایا تھا۔ تمام اشیاء کی لاگت بیس لاکھ روپے کے قریب تھی چوروں میں ایک شخص قبرستان کی مسجد کا موذن بھی تھا۔

اس مہم کو سر کرنے کی خدمت کے صلہ میں مجھے فوراً میجر بنا دیا گیا اور صوبیدار گل داد خان کو "جرات استقلال" کا تمغہ نصیب ہوا سات روز بعد میری بٹالین کا تبادلہ چک لالہ چھاؤنی ہو گیا۔

راولپنڈی مملکت پاکستان کا دارالخلافہ ہے۔ اور صحت کے لحاظ سے بہت اچھا مقام ہے، یہاں پھل اور خشک میووں کی بھاری منڈی ہے، چک لالہ آئے ہوئے ابھی مجھے مشکل سے دو ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ مجھے نزلہ زکام نے آدبوچا جس کی وجہ سے مجھے ملٹری ہسپتال میں کئی روز تک رکھا گیا۔ آپ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ سیگاؤں سے لایا ہوا شیر کا بچہ جس کا نام میں نے گل لالہ رکھا تھا، بدستور میرے پاس تھا۔ جب میں ہسپتال میں داخل ہوا تو میرے ساتھ میں گل لالہ کے گلے میں پڑی ہوئی زنجیر دیکھ کر لوگ گھبرا گئے لیکن جب انھیں پتہ چلا کہ گل لالہ گوشت کی بجائے دودھ پیتا ہے اور مکھن ٹوسٹ کھاتا ہے تو سب کی جان میں جان آئی، میری خدمات مد نظر رکھ کر اپنے پاس گل لالہ رکھنے کی اجازت مجھے مل گئی۔

جو نرس میری تیمارداری پر مامور تھی اس کا نام نسیم رحمان تھا اس کا والد ہندوستانی فوج میں میجر تھا اور اس کی والدہ میرے وطن اسکاٹ لینڈ کی رہنے والی



میجر جنرل لوکس پاشا

تھی، نسیمہ گل لالہ کو اپنے ہاتھوں سے ناشتہ کراتی، اور آدھ گھنٹے کے لئے ہسپتال سے باہر سیر کرانے کیلئے لے جاتی لوگ گل لالہ کو دیکھنے کے لئے سڑک پر کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔

خدا جانے کیا بات تھی کہ پہلے ہی روز میں نسیمہ کو دل دے بیٹھا، چند روز بعد جب اسے معلوم ہوا کہ بیس لاکھ روپے کی اسمگلنگ پکڑنے کا سہرا میرے سر بندھا ہوا ہے تو میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبا کر بولی۔

"سر اگر اجازت ہو تو میں ان ہاتھوں کا بوسہ لے لوں کیونکہ ان ہاتھوں نے ملک و قوم کے دشمنوں کو شکستِ فاش دی" یہ کہکر اس نے میرے دائیں ہاتھ کا بوسہ لیا میں نے اس کے گال پر چپکے سے ایک چٹکی بھر لی۔

ہسپتال سے چھٹی ملتے ہی میں نے نسیمہ رحمان سے نکاح کر لیا۔ میں میجر جان منزی کنیتھ سے میجر جان محمد خان بن گیا۔ اس روز میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، ہماری شادی کے چرچے پاکستان کے تمام اخبارات میں ہوئے اور میری، نسیمہ کی اور ساتھ ساتھ گل لالہ کی تصویریں شائع ہوئیں۔

لوگ مجھے نمبر والا انگریز کے نام سے پکارنے لگے پاکستانی فوج میں رہتے ہوئے مجھے پانچ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ہم نے اپنے پہلے بچے کا نام دلعزیز خان رکھا۔ دل عزیز ہو بہو نسیمہ کی مانند تھا وہی ناک نقشہ ویسی ہی دل کو لبھانے والی آنکھیں۔

ایک دم میری طبیعت میں بے چینی سی پھیلی کہ اب کسی دوسرے ملک میں قسمت آزمائی کی جائے۔ جب میں نے اپنی خواہش نسیمہ کے سامنے ظاہر کی تو وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

نام میں صیغۂ راز میں رکھنا چاہتا ہوں کی فوج میں کرنل کا عہدہ ملتا ہے۔ وہاں جانے کی اجازت دو۔ میں صرف ایک سال کے لئے جانا چاہتا ہوں وہاں میں تمہارے لئے اتنی دولت کماؤں گا کہ ایک محل تیار کرواسکوں گا۔ میرے



فوجی ساتھیوں کے ہمراہ

آپ کی غیر حاضری میں دل عزیز کس شخص کو آیا کہہ کر مخاطب کرے گا۔

"نسیمہ اپنا دل چھوٹا مت کرو، شیروں کے بچے شیر ہوتے ہیں۔ مجھے شمالی افریقہ کے کسی عرب ملک جس کا

دل کی مورنی ایک بار ہاں کہہ دو، باقی رہا سوال ہر دلعزیز کا ایک سال کا عرصہ آنکھ جھپکتے ہی گذر جاتا ہے اس کی دیکھ بھال تمہارے نازک کندھوں پر ہے۔

وہ بیچاری عورت ذات مردوں کی حیلوں کو کیا



مرد جس ٹہنی پر بیٹھتے ہیں وہیں گھونسلہ بنا لیتے ہیں
آخرکار دل عزیز کے سر کی قسم دے کر اس وعدے پر مجھے اس نے رخصت کیا کہ میں سال کے اندر اندر پاکستان واپس لوٹ آؤں گا۔

یہ واقعہ ۱۹۵۴ء کا ہے جب میں نے عرب ممالک میں پہنچکر ریجمنٹ کے کرنل کمانڈنٹ میجر جنرل لوکس پوشا کے پاس اپنے پہونچنے کی اطلاع دی اور اسے بتلایا کہ پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے میں میں اینٹی اسمگلنگ سکواڈ کا سربراہ تھا تو اس نے میری پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

" ہاں کرنل جان محمد جب میں لاہور میں تھا تو میں نے ٹیلی ویژن پر اخباری نمائندوں کے ساتھ ملاقات دیکھی تھی مجھے پوری امید ہے کہ تم یہاں بھی پوری محنت اور جانفشانی سے کام کرو گے۔"

اس ملاقات کے تین روز بعد میں صدق العباس کے تاریخی قلعے میں تعینات کر دیا گیا۔ یہ قلعہ صلاح الدین ایوبی کی معرکہ خیز فتوحات کی یاد دلاتا تھا یہاں زندگی اور موت میں بہت کم فرق تھا۔ اسی قلعہ میں الجیریا کے وطن پرستوں کی بیخ کنی کے پروگرام مرتب ہوتے تھے جب مجھے پتہ چلا کہ مجھے بھی اپنے ہم مذہبوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے ترغیب دی گئی ہے تو میں نے فوراً ملازمت سے استعفیٰ دیدیا۔ جب جنرل لوکس کو میرے ارادوں کا پتہ چلا تو اس نے مذہبی جذبات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے قلعے سے ہٹا لیا اور غلاموں کی تجارت کا انسداد کرنے والے سکواڈ کا سربراہ بنا دیا گیا۔ کہ اسی اثنا میں راولپنڈی سے مجھے اطلاع ملی کہ اسٹوو پھٹنے سے میری بیوی نسیمہ کی موت واقع ہوگئی اور میرا بیٹا دل عزیز بری طرح گھائل ہو کر ہسپتال میں بستر مرگ پر آخری سانس لے رہا ہے۔

اس خبر نے میرے جسم سے تمام طاقت و توانائی خارج کردی اور میں مٹی کے تودے کی مانند بے سدھ ہوکر زمین پر گر پڑا جب مجھے ہوش آیا تو خود کو ڈسپنسری میں پڑے پایا۔ اپنے چھوٹے سے چمن کو ناگہانی طوفان کی زد میں یوں برباد ہوتا دیکھ کر دنیا کی رنگینیوں سے میرا دل اچاٹ ہوگیا۔ ہسپتال میں جب تک رہا گرم توے پر لوٹتا رہا، کھانا پینا سب کچھ چھوٹ گیا دل کو بہتیرا سمجھایا لیکن اسے کسی صورت چین نہ ملا جب ڈاکٹروں نے اجازت دی تو پاکستان لوٹنے کا منصوبہ بنایا

آج کل میں اپنی بیوی اور بچے کے مزاروں پر جاروب کشی کر کے خداوند کریم سے اپنے سابقہ گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔ عوام مجھے انگریز درویش کے نام سے پکارتے ہیں، پاکستان آتے ہی میں نے گل لالہ کو اسلام آباد کے چڑیا گھر کو دیدیا خدا بہتر جانتا ہے کہ اس کا کیا حشر ہوا۔

اپنی کمائی سے میں نے یتیم بچوں کی دیکھ بھال کے لئے گاؤں میں ایک یتیم خانہ کھول رکھا ہے۔ حکومت پاکستان کی جانب سے بھی یتیم خانے کے لئے کچھ امداد مل جاتی ہے

میرا پختہ یقین ہے کہ انسان کے نیک و بد افعال کا صلہ اس جہاں میں ہی مل جاتا ہے۔ چاہے وہ شخص امیر ہے یا غریب۔

اگر میں نے سیگاؤں میں ظلم نہ ڈھائے ہوتے تو میرا چمن بھی سرسبز ہی رہتا۔ ★ ○


ابن صحرا
جب جاپان ہار رہا تھا
نام کتاب:- DEFEATEDARMY
مصنف:- تھامس بروک
تلخیص:- ابنِ صحرا

"ہم دشمن کا مقابلہ کر رہے ہیں لیکن دشمن کی طاقت اسقدر زیادہ ہے کہ ہم زیادہ دیر تک جم کے لڑ نہیں سکیں گے ہماری مدد کے لیے لڑاکا طیارے بھیجو....." یہ ایک وائرلیس پیغام تھا جو بحرالکاہل کے کسی جزیرے میں محصور ایک جاپانی کمانڈر اپنی ہائی کمانڈ کو دیتے رہا تھا۔

اسے ہائی کمانڈ کا جواب ملا: "الوداع دوستو! خدا حافظ" یہ اس وقت کی بات ہے جب گذشتہ جنگ عظیم کے دوران پرل ہاربر کی کامیابی کے بعد جاپانی سپاہ کے قدم اکھڑ رہے تھے۔ جاپانی فوجیں پرل ہاربر پر کاری ضرب لگا کر بحرالکاہل کے سینکڑوں جزیروں پر قابض ہو گئی تھیں لیکن اتحادیوں کی جوابی یلغار نے جاپانی دستوں کا رابطہ ان کے ہیڈ کوارٹروں کے ساتھ اس حد تک کاٹ دیا تھا کہ انہیں جزیروں تک نہ راشن پہنچتا تھا نہ ایمونیشن۔ انہیں صرف وائرلیس پر احکام ملتے تھے۔ اور ہر حکم اس قسم کا ہوتا تھا۔

"جزیرے میں امریکیوں کو داخل نہ ہونے دو۔ انہیں سمندر میں ڈبو دو۔ شہنشاہ جاپان کا حکم ہے کہ اپنے جسموں کے ساتھ بارود باندھ کر دشمن کے مورچوں میں کود جاؤ۔"

جاپانی سپاہی اپنے شہنشاہ کے حکم پر اور اپنے وطن کے نام پر مرنے کو سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے شکست کی صورت میں خودکشی جاپانیوں کی قومی روایت بن گئی تھی بہت حد تک یہی روایت ان کی شکست کا باعث بھی بنی جب جاپانیوں کے پاس گولہ بارود ختم ہو جاتا تھا تو وہ سنگینوں تلواروں خنجروں، پتھروں، بیلچوں اور کدالوں سے امریکی مورچہ بند دستوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ لیکن سوائے مرنے کے جاپانیوں کو کوئی جنگی کامیابی حاصل نہ ہوتی تھی۔ بعض جاپانی سپاہی کریا ٹانگ سے بے حد طاقتور ڈائنامیٹ (بارود) باندھ کر امریکی ٹینکوں سے ٹکرا جاتے تھے۔ اس طرح امریکہ کے بہت ٹینک تباہ ہوئے لیکن امریکہ کے پاس ٹینکوں کی کمی نہ تھی جاپانی جزیروں پر جزیرے ہارتے چلے گئے اور امریکی یلغار بحرالکاہل کے اہم ترین جزیرے سائپن تک جا پہنچی

سائپن میں جاپانیوں نے خوب مقابلہ کیا۔ انہیں احساس تھا کہ اگر امریکی سائپن پر قابض ہو گئے تو ان کے بمبار طیاروں کو جاپان پر بمباری کرنے کیلئے جاپان کے قریب ہوائی اڈہ مل جائے گا۔ شہنشاہ نے بھی حسب معمول مرنے کا حکم نامہ بھیج دیا اور کہا: "تمہارا وطن خطرے میں ہے"۔——

چنانچہ سائپن میں بحرالکاہل کا شدید ترین معرکہ ہوا لیکن امریکی بحری بیڑے کی بحری توپوں اور فضائیہ کے بمباروں نے جزیرے میں اس قدر بارود پھینکا کہ جزیرہ سیاہ گھٹاؤں میں چھپ گیا۔ جب اس گولہ باری کے سائے میں امریکی میرین فورس جزیرے پر حملہ آور ہوئی تو جاپانی سپاہی جو اس وقت تک زمین دوز مورچوں اور بمباری سے محفوظ بنکروں میں دبکے رہے تھے، باہر نکل آئے، ان کی توپیں مشین گنیں، راکٹ لانچر اور گرینیڈ امریکی سپاہیوں کے پرخچے اڑانے لگے۔ کئی دنوں کے معرکے کے بعد جاپانیوں کا اسلحہ بارود ختم ہونے لگا امریکی بحری جہازوں نے ساحل سے ازسرنو گولہ باری شروع کر دی، اس کی شدت نے جاپانیوں کو بہت جانی نقصان پہنچا کر بے بس کر دیا۔ بچے کھچے جاپانیوں نے اس کا جواب "خودکشی حملے" سے دیا۔ وہ دشمن کے آگ اگلتے مورچوں میں دست بدست جنگ کے لیے کود گئے۔ بہت سے تو فائر سے مر گئے لیکن جو بچ گئے، وہ امریکی سپاہیوں کے لیے قیامت بن گئے۔ جو جاپانی سپاہی زخمی تھے وہ دور سے فائر کرتے رہے اور جو زخمی اٹھنے یا فائر کرنے کے قابل نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو گولیاں ماریں یا اپنے سینوں پر گرینیڈ رکھ کر اپنے جسموں کی بوٹیاں میدان جنگ میں بکھیر دیں۔ جنہوں نے اپنے جسموں

کے ساتھ بارود باندھ رکھا تھا۔ انہوں نے انسانی بم بن کر توپوں اور ٹینکوں سے ٹکرا ٹکرا کر امریکی عسکری قوت کو ادھ موا کر دیا لیکن وہ ایک ایک کر کے مر گئے، نقصان امریکیوں کا بھی بہت ہوا لیکن انہوں نے فی الفور پورا کر لیا۔ سمندر میں بحری جہاز کھڑے تھے جن میں اتنے ہی تازہ دم سپاہی موجود تھے جتنے مورچے میں لڑ اور مر رہے تھے۔ جزیرہ امریکہ کے قبضہ میں آ گیا۔

ان جاپانیوں میں سے صرف ایک زندہ بچا جسے پکڑ لیا گیا۔ جاپانی سپاہی قید نہیں ہوا کرتے تھے۔ قید کے خطرے کے پیش نظر وہ خودکشی کر لیا کرتے تھے۔ ساری جنگِ عظیم کے دوران معدودے چند جاپانی زندہ پکڑے گئے تھے۔ قید کے دوران وہ کچھ کھاتے پیتے ہی نہیں تھے۔ اور جب بھی موقعہ ملتا تھا وہ خودکشی کی کوشش کرتے تھے یا التجائیں کرتے تھے کہ "ہمیں گولی مار دو" لیکن سائپن کے معرکے میں جو جاپانی سپاہی پکڑا گیا وہ بہت ہشاش بشاش تھا۔ اور ہر سوال کا جواب بھی خندہ پیشانی سے دے رہا تھا۔ آخر اس سے پوچھا گیا کہ قید ہو کر وہ اتنا خوش کیوں ہے؟

اُس نے جواب دیا ــــ "حکم ملا تھا کہ آخری سپاہی تک لڑو ..... میں آخری سپاہی ہوں"

جب جاپانی سپاہی ختم ہو گئے تو جزیرے میں جو جاپانی کنبے آباد تھے انہوں نے خودکشی کا لرزہ خیز سلسلہ شروع کر دیا۔ بے شمار جاپانی کنبے جو اپنی فوجوں کے زمین دوز مورچوں میں چھپے ہوئے تھے۔ بچوں سمیت باہر نکل آئے اور اونچی اونچی چٹانوں پر چڑھ گئے۔ ماؤں اور باپوں نے بچوں کو بلندیوں کی طرف سے پتھروں کی طرح نیچے پھینکنا شروع کر دیا۔ پھر ان کے پیچھے خود بھی سروں کے بل چھلانگیں لگا دیں۔ بعض عورتیں ایک ایک دو دو بچوں کو گود میں اٹھائے سمندر میں جا ڈوبیں۔ ایک ماں کو دیکھا گیا جو اپنے چند ماہ کے بچے کا پیٹ چھری سے چاک کر کے اپنا پیٹ چاک کر رہی تھی۔ امریکی سپاہیوں نے بھاگ کر انہیں خودکشی سے روکنا چاہا لیکن کوئی بھی ان کے ہاتھ نہ آیا۔

اس بھیانک منظر میں ایک جاپانی سپاہی نظر آیا۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک گرینیڈ نکالا اس کی پن کھینچی، اپنی فولادی ٹوپی اتاری اور گرینیڈ سر پر رکھ کر اوپر ٹوپی رکھ لی۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ تین چار سیکنڈ بعد دھماکہ ہوا اور جب گرینیڈ کا دھواں چھٹا تو وہاں نہ جاپانی سپاہی تھا نہ اس کی فولادی ٹوپی۔

اور منظر انتہائی رقت انگیز تھا کہ کئی مرد اور عورتیں بچوں کو اٹھائے سمندر میں گھٹنے گھٹنے پانی میں بڑے اطمینان سے آگے ہی آگے چلے جا رہے تھے، پانی گہرا ہوتا چلا گیا اور وہ سب سمندر میں غائب ہو گئے۔

جزیرے کی وادی میں اچانک دھماکے شروع ہو گئے، جا کے دیکھا تو جاپان کے سینکڑوں زخمی سپاہی ایک جگہ ہجوم کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے درمیان گرینیڈ رکھ لیے تھے جو پھٹ رہے تھے۔ جب دھماکے تھمے تو وادی انسانی خون اور اعضا سے اٹی پڑی تھی۔

امریکی فوجیں جزیروں پر جزیرے فتح کرتی جا رہی تھیں لیکن بعض جزیروں میں کئی جاپانی سپاہی چھپ گئے تھے وہ برسوں وہیں چھپے رہے۔ ان میں سے بعض کو تو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ جنگ ختم ہو گئی ہے اور جنہیں معلوم ہو گیا وہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ ان کے شہنشاہ نے شکست مان لی ہے اور جاپان کا سورج دیوتا اتحادیوں کے قدموں میں غروب ہو گیا ہے۔ وہ ابھی تک امریکی حملوں کے منتظر تھے اور لڑتے ہوئے مرنے کے لیے بے تاب۔ مثلاً ۱۹۵۲ء میں چند آسٹریلوی سیاح بحرالکاہل کے ایک گمنام اور غیر آباد جزیرے میں گئے جہاں پرندوں، اور جنگل کے چند ایک بے ضرر جانوروں کے سوا کوئی جاندار،

نظر نہ آتا تھا۔ اچانک ان پر پتھر برسنے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان پر پتھر پھینکنے والا ایک انسان نما تھا۔ سر اور داڑھی کے بال بہت لمبے تھے، جسم ننگا، پاؤں سوجے ہوئے، آنکھیں لال۔۔ انگارہ اور حال حلیہ سے وہ صدیوں پرانا دنیا کا انسان معلوم ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے اس پر قابو پایا گیا۔ ایک سیاح جاپانی زبان بول سکتا تھا۔ اس نے اس سے بات کی تو وہ عتاب آلود لہجے میں بولا ـــ میں جاپانی سپاہی ہوں۔ اس جزیرے کا دفاع میری ذمہ داری ہے یہ شہنشاہ جاپان کا جزیرہ ہے ـــ اسے بتایا گیا کہ جنگ ختم ہوئے سات برس گزر گئے ہیں لیکن وہ ماننے پر تیار نہ ہوا وہ کمزور بہت تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر جزیرے سے نکالا گیا اور جاپان پہنچایا گیا۔

ایسے کئی ایک واقعات ہیں کہ جاپانیوں نے فرداً فرداً چھوٹے چھوٹے ویران جزیروں پر قبضہ کیے رکھا۔ ان میں ایک واقعہ سب سے زیادہ دلچسپ اور ڈرامائی ہے۔ جون ۱۹۴۴ء میں امریکی بمباروں اور بحری جہازوں نے کھلے سمندر میں تین بحری جہاز تباہ کر کے ڈبو دیئے۔ ایک جہاز کا ایک پیٹی آفیسر، جنجی الو، بصد مشکل بچا اور تیر کر ایک جزیرے میں پہنچ گیا۔ جاپانی فوجیں اس جزیرے سے دستبردار ہو چکی تھیں اور امریکیوں نے اس پر قبضہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ الو جزیرے کے جنگل میں چلا گیا۔ گھنے جنگل کی وجہ سے جزیرہ دشوار گزار تھا جنگل کے وسط میں گیا تو اُسے کسی اور جاپانی بحری جہاز سے بچے ہوئے چھ بحری سپاہی، دو سپاہی اور کسی پرائیویٹ بحری کمپنی کے بیس جاپانی ملاح مل گئے۔ ان سب میں الو کا عہدہ بڑا تھا انہوں نے الو کا پُرمسرت استقبال کیا اور وہ ان سب کا کمانڈر بن گیا یہ جزیرہ جاپان کی ملکیت تھا۔

وہیں جھونپڑوں کی ایک بستی تھی۔ اس بستی سے ایک اور جاپانی نکل آیا وہ سپاہی نہیں تھا۔ اور اس جزیرے میں اور سرسبز تھا۔ جزیرہ خالی ہونے کے بعد وہ یہاں سے نکل نہیں سکا تھا۔ انہی جھونپڑوں سے جزیرے کے چالیس باشندے بھی نکل آئے۔ الو نے سب کو اکٹھا کیا اور کہا ـــ میں جاپان کی امپیریل نیوی کا پیٹی آفیسر ہوں تم جاپان کی فوج ہو اور میں تمہارا کمانڈر ہوں۔ یہ جزیرہ ہمارے شہنشاہ کا ہے اور اس کا دفاع ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ آج سے تم میرے حکم کے پابند ہو!

ان لوگوں کے پاس کھانے پینے کا سامان کچھ ایسا زیادہ نہ تھا۔ الو نے ساحل کے قریب ڈوبے ہوئے ایک جاپانی۔۔ جہاز سے چاولوں کی بھیگی ہوئی چند ایک بوریاں اور راشن کے کچھ بند ڈبے نکال لیے۔ جنگل میں تھوڑی سی مرغیوں اور سوروں کے علاوہ پانچ پانچ فٹ لمبے گرگٹ تھے۔ جن کے متعلق مقامی باشندوں نے بتایا کہ ان کا گوشت ناقابل برداشت حد تک ترش ہوتا ہے سمندر سے مچھلیاں پکڑی جاسکتی تھیں۔ لیکن ساحل کے قریب زہریلی مچھلیوں اور سانپوں کی افراط تھی یا ذرا پرے شارک مچھلیاں تھیں لیکن اتنی بڑی مچھلیاں پکڑنے کے لیے ان کے پاس نہ مضبوط رسیاں تھیں نہ بڑے کانٹے تھے کھانے پینے کی جس قدر چیزیں کسی کے پاس تھیں جھونپڑوں سے مل سکیں الو نے اپنے قبضہ میں رکھ کر راشن بندی کر دی نیوی کے سپاہیوں کے پاس دو چھوٹی مشین گنیں اور تھوڑا سا ایمونیشن تھا۔ الو نے اس اسلحہ کو جزیرے کی دفاع کے لیے رکھ لیا۔

اُدھر امریکی سپاہ جزیرے سائپن پر چڑھائی کر رہی تھی جو الو کے جزیرے سے تریسٹھ میل دور تھا۔ الو کے آدمی ناکافی اور غیر صحت مند غذا کی وجہ سے پہلے ہی لاغر ہو چکے تھے اور بعض ملیریا اور پیچش سے مر رہے تھے۔ ایک روز اچانک امریکی بمباروں نے جزیرے پر بمباری شروع کر دی اور۔۔ جھونپڑیوں کو تباہ کر کے چلے گئے۔ الو نے اپنے آدمیوں کو

بکھر کر بچا لیا تھا۔ اس کے بعد بمباری روزمرہ کا معمول بن گئی۔ الِو نے ایک پہاڑی کی کھوہ میں اپنا ہیڈکوارٹر بنا لیا۔ ایک مشین گن چٹان کے اوپر اور ایک سامنے نصب کرا دی۔ چند اور آدمیوں کو سمندر اور فضا پر نظر رکھنے کی ڈیوٹی لگا دی۔ فوجی افسروں کی طرح حکم چلاتا تھا۔ اور کھانے کو انہیں بہت تھوڑا دیتا تھا کیونکہ راشن جلدی ختم ہو جانے کا خدشہ تھا۔ اُس نے ایک اور حکم نامہ جاری کیا کہ ہر آدمی اُسے سیلوٹ کیا کرے۔ باقی تو مان گئے لیکن نیوی کے دونوں سپاہیوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ الِو نے دونوں کو کھڑا کر کے اُن کے مُنہ پر ایک ایک گھونسہ مار کر کہا ــــ "احمقو! دشمن نے حملہ کر دیا تو کیا کرو گے؟ ہمیں فوجی ڈسپلن برقرار رکھنا ہے۔"

ایک روز اسے پتہ چلا کہ اس کے پانچ چھ آدمی کہہ رہے تھے کہ ہم اس جزیرے سے زندہ نہیں نکل سکیں گے۔ الِو نے ان سب کو کھڑا کر کے جھک جانے کو کہا اور چھڑی سے انہیں اسقدر پیٹا کہ ان کے جسموں سے خون رسنے لگا۔ پھر چیخ چیخ کر بولا ــــ "اگر تم یوں خوفزدہ رہے تو جزیرے کو دشمن سے کیسے بچاؤ گے؟ یہ ہمارے شہنشاہ کا جزیرہ ہے۔"

دو مہینے گذر گئے۔ انہوں نے ساری مُرغیاں اور سُور کھا لیئے۔ اور اب فاقوں تک نوبت پہنچنے لگی۔ مچھلیاں پکڑنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ جزیرے پر ناریل کے درخت تھے لیکن بمباری نے پکا ہوا پھل تباہ کر دیا تھا اور جو بچ رہا تھا وہ ان لوگوں نے کھا لیا تھا۔ ایک روز الِو کے آدمیوں نے پانچ چھ فٹ لمبا گرگٹ پکڑ لیا۔ اور اس کا گوشت کھانے کی کوشش کی لیکن ذائقہ قابلِ قبول نہ تھا۔ پھر انہوں نے بڑے جھینگا ڈروں کو آگ پر بھونا اور کھانا شروع کر دیا۔ الِو کو ایک روز چند ایک ناریل مل۔ اُس نے ان کے پانی میں جھینگا ڈر پکائے۔ یہ سالن کافی خو ذائقہ اور مُفرّح ثابت ہوا۔ لیکن اتنے سارے آدمیو کے لیے کافی نہ تھا۔ خوراک ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ الِو کی جسمانی لحاظ سے پہلے ہی بے حال تھی اب کم غذا سے ا کے آدمی مرنے لگے۔

لیکن ایک روز اچانک خوراک سے کہیں ٹیڑھا پیدا ہو گیا۔ یہ مسئلہ ایک دلکش اور نوجوان لڑکی کی میں سامنے آیا۔ وہ ایک جاپانی لڑکی تھی۔ اُسے اوو نے ایک سال سے داشتہ بنا کر اپنے گھر میں چھپا کر کھا اس لڑکی کو الِو کے ایک آدمی نے اتفاقیہ دیکھ لیا اور ا اطلاع کر دی اس نے (الِو نے)، اووسیئر کو حکم دیا کہ ل کو پیش کرے۔ جب لڑکی اس کے سامنے آئی تو الِو ایک د سے دو حصوں میں کٹ گیا۔ وہ اب اپنی فوج کا 'جانباز' بھی تھا جسے اپنے شہنشاہ اور وطن کے سوا کسی چیز سے نہ تھا۔ وہ اندر ہی اندر لرز اٹھا۔ وہ اب مرد بھی تھا عورت کی صورت دیکھے اِن بے رحم جزیروں میں ایک زمانہ گلتے سڑتے گذر گیا تھا۔ وہ لڑکی کا بھولا بھالا اس سا چہرہ، آنکھوں کی پُر شباب چمک۔ لانبے لانبے چمکیلے اور جسم کی زہر شکن ساخت کو دیکھ کر الِو کی زبان گنگ لڑکی کو دیکھنے سے پہلے اس نے سوچا تھا کہ وہ اسے اور ا کو سزا دے گا اور انھیں قید کر دے گا تاکہ اتنے سار مردوں میں ایک عورت لڑائی جھگڑے کا باعث نہ بے لڑکی کو دیکھا تو اس کے فیصلے ڈگمگا گئے۔

اسی روز امریکی طیاروں نے پھر جزیرے پر بم کر دی۔ الِو کو اپنا ہیڈکوارٹر کسی محفوظ مقام پر منتقل کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اس نے لڑکی کو اپنے دو اعتماد کے آدمیو

ا نے لیا اور کچھ آدمیوں کو ساتھ لے کر کسی محفوظ جگہ کی تلاش
ا نکل گیا۔ جزیرے میں تلوار کی طرح کی اونچی اور تیز گھاس
ا جس میں سے انھیں گزرنا پڑا۔ وہ لہو لہان ہوتے کئی روز
، بعد گھنے پیڑوں میں ڈھکی ہوئی ایک چٹان تک پہنچے۔ وہاں
ں نے پناہ گاہ بنائی اور واپس آئے۔ اس کام اور مسافت
ایک مہینہ گذر گیا۔ اس ایک ماہ کے دوران، اِنّو کی غیر حاضری
ڑکی کی موجودگی کی وجہ سے اس کی فوج میں ابتری اور انتشار
ہو چکا تھا جن دو آدمیوں کے حوالے وہ لڑکی کو کر آیا تھا
یک دوسرے کے خون کے پیاسے بن چکے تھے۔ دوسرے
یوں میں بھی نظم و نسق ختم ہو چکا تھا بھوک نے ان میں تحمل
بُردباری رہنے ہی نہ دی تھی ملیریا، پیچش، مچھروں اور
وں نے ان کے جسموں سے زندگی کی رمق ختم کر ڈالی تھی تین
دمی بیماری یا فاقہ کشی سے مر گئے تھے اور دو آدمی سمندر
مچھلیاں پکڑنے گئے اور ڈوب گئے۔

اِنّو اپنی بچی کھچی فوج کو نئی جگہ لے آیا۔ دو اور آدمی
میں مر گئے۔ اس نے لڑکی کو کندھے پر اٹھا لیا۔ اور منزل
ہو پہنچایا۔ وہاں جا کر کسی مقامی باشندے نے انکشاف کیا
یل کے پانی کی شراب بن سکتی ہے جس کے لیے صرف
بڑا اہتمام کی ضرورت ہے کہ پانی کو ناریل میں ہی خاص
نک کے لیے دھوپ میں پڑا رہنے دیا جائے۔ درختوں کے
اب ناریل پکنے لگے تھے۔ تھوڑے دنوں تک ہر آدمی
کشید کر رہا تھا۔ اس شراب نے ان کے جسموں سے رہا
ہا دم خم بھی ختم کر دیا۔ آخر اِنّو نے شراب پر پابندی عائد
، چند دنوں بعد ایک امریکی بحری جہاز جزیرے کے
پر رکا۔ اِنّو نے دو آدمیوں کو مشین گنوں پر لگا دیا۔
ے چند ایک امریکی فوجی اترے اور جزیرے میں داخل
ل میں غائب ہو گئے۔ وہ ہر طرح کے اسلحہ سے لیس تھے

اِنّو نے ان کے تعاقب میں تین چار آدمی بھیج دیئے اور انھیں کہا کہ اگر یہ امریکی رات کو جزیرے میں قیام کریں تو ان پر شب خون مارنے کا انتظام کیا جائے۔ لیکن امریکی سپاہی تھوڑی دیر بعد جنگل سے نکل آئے، جہاز میں سوار ہوئے اور جہاز چلا گیا۔ اِنّو نے اپنے آدمیوں کو خبردار کیا کہ اب تھوڑے ہی دنوں میں امریکی دستے یہاں آئیں گے۔ وہ دیکھ گئے ہیں کہ جزیرہ خالی ہے۔ اس لیے اب تم جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اس کی فوج میں اب صرف بیس آدمی لڑنے کے.. قابل تھے اور باقی نقاہت سے مر رہے تھے۔ اِنّو نے سب کو چاقوؤں، نوکیلے پتھروں اور کدالوں سے مسلح کر دیا۔ دوسرے روز امریکی سپاہی نکلے اور کل کی طرح جنگل میں چلے گئے اِنّو نے ان کے پیچھے جاسوس بھیج دیئے۔ وہ دن کے وقت تو لڑ نہیں سکتے تھے۔ اِنّو شب خون مارنا چاہتا تھا۔ جاسوسوں نے اطلاع دی کہ یہ امریکی سپاہی جزیرے کا جائزہ لے رہے ہیں اور رات جلدی واپس نہیں جائیں گے لیکن وہ بھی جلدی واپس چلے گئے دوسرے روز امریکی بمباروں نے جزیرے پر جگہ جگہ بم گرائے پھر بمباری کئی روز تک ہوتی رہی۔

امریکی سپاہیوں کے بار بار آنے کی وجہ سے اور مسلسل بمباری کے باعث اِنّو اور اس کے آدمیوں کی توجہ لڑکی کی طرف سے ہٹی رہی، پانچ مہینے گذر گئے۔ ان پانچ مہینوں میں اِنّو نے لڑکی کو اپنے قبضے میں رکھا۔ لڑکی کی.. حیثیت اس کی داشتہ کی سی تھی۔ ان پانچ مہینوں میں نہ کوئی امریکی بحری جہاز آیا نہ بمباری ہوئی۔ پُرلطف سا۔ امن و امان قائم رہا۔ ایک روز ایک امریکی بحری جہاز۔ کنارے آلگا اور اس کے لاؤڈ سپیکروں سے آواز آنے لگی
" جاپانی سپاہیو! میں جاپان نیوی کا لیفٹیننٹ کمانڈر

نشو شیٹو بول رہا ہوں۔ ہمارے شہنشاہ نے ۱۵ اگست کو شکست تسلیم کرلی ہے۔ اگر کوئی جاپانی سپاہی اس جزیرے میں موجود ہے تو وہ اس جہاز میں آجائے ہم جاپان جا رہے ہیں۔"

الو اور رائس کے آدمیوں کو یقین نہ آیا کہ ان کا شہنشاہ، سورج کا بیٹا امریکیوں کے سامنے گھٹنے ٹیک سکتا ہے ایک آدمی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔۔۔ "امریکی ہمیں اُلو بنانا چاہتے ہیں"۔۔۔ انہوں نے اس اعلان کو امریکی چال سمجھا۔ اور جزیرے میں ڈٹے رہے۔

مہینے گذرتے گئے۔ وقتاً فوقتاً بحری جہاز آتا اور اسی طرح کا اعلان کر کے چلا جاتا۔ جنگ واقعی ختم ہو چکی تھی لیکن الو کی فوج اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے پہ آمادہ نہیں تھی کہ جاپان اپنی شکست تسلیم کر چکا ہے۔ جزیرہ اس قدر دشوار گذار تھا کہ اس کے اندر آکر انسانوں کو تلاش کرنا محال تھا۔ اور نہ ہی کسی نے ایسی ضرورت محسوس کی۔ اس قسم کے اعلان بحر الکاہل کے ہر چھوٹے بڑے جزیرے کے ساحل سے کیے جا رہے تھے۔

ایک سال گذر گیا۔ الو کے کئی آدمی مر گئے لیکن اس نے دو لو مشین گنوں کو جزیرے کے دفاع کے لیے تیار رکھا۔ وہ زیادہ تر ناریل پر ہی زندہ رہے اور لاغر ہوتے چلے گئے الو لڑکی کو ہر قیمت پر زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی خاطر اس نے فاقے کیے اور جسمانی کمزوری نہ ہونے دی۔ ایک روز جزیرے میں گھومتے پھرتے انھیں ایک تباہ شدہ امریکی بمبار طیارہ نظر آ گیا جسے جنگ کے دوران گرایا گیا تھا۔ طیارے کے ٹوٹے ہوئے ڈھانچے سے چھ پیراشوٹ، بند فروٹ کے ڈبے اوزار اور کام کی کئی چیزیں ہاتھ لگیں۔ الو نے پیراشوٹ پھاڑ کر چھ چھ گز کپڑا اپنے آدمیوں میں تقسیم کر دیا۔ اوزاروں اور طیارے کے بعض کل پرزوں سے انہوں نے بڑی مچھلیاں پکڑنے کا سامان تیار کر لیا۔ ان اشیا نے ان کی فاقہ کش کی زندگی کو سہارا دے دیا۔

الو کے دو آدمیوں کو طیارے میں سے دو پستول بھی مل گئے۔ جو انہوں نے الو سے چھپا کے رکھے تھے ایک روز ان میں سے ایک آدمی نے پستول تان کر سب کو للکارا اور بولا "یہاں پستول والے کا حکم چلے گا" اور وہ لڑکی کی طرف لپکا۔ دوسرا آدمی جس کے پاس دوسرا پستول تھا سامنے آگیا۔ اس نے بھی پستول تان کر کہا، "میرے پاس بھی پستول ہے۔ لڑکی کا مالک میں ہوں" دونوں نے ایک دوسرے پر بیک وقت فائر کر دیا۔ اور دونوں مر گئے الو نے دونوں پستولوں پر قبضہ کر لیا۔ اور لڑکی اس کی داشتہ بنی رہی لیکن لڑکی کی خاطر دو آدمیوں نے ایک دوسرے کو قتل کر دیا تھا۔ اس حادثے نے الو کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے فوراً بعد دو اور آدمیوں نے اسی طرح ایک دوسرے کو چاقوؤں سے قتل کر دیا۔ الو نے جب دوسرے آدمیوں کا جائزہ لیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ سب لڑکی کے چاہنے والے تھے اور رقابت نے انھیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا تھا۔ حالانکہ لڑکی صرف الو کی داشتہ تھی۔

الو نے محسوس کیا کہ وہ دیانتدار کمانڈر نہیں اور اس نے اپنی فوج کے جذبات کا خیال نہیں رکھا۔ اس نے لڑکی سے بات کی اور اسے کہا ۔۔۔ "یہ لوگ صرف تمہاری خاطر اپنے شہنشاہ اور وطن کی عزت کو فراموش کر کے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہیں۔ وطن تم سے قربانی مانگ رہا ہے"۔۔۔ لڑکی ساری بات سمجھ گئی اور وہ ہر کسی کی محبوبہ بن کر سب کی مشترکہ داشتہ بن گئی۔ فوج میں نظم

ے کی خود کرایا

نکل گئے مچھلیاں پکڑنے کا سامان بن جانے سے اُن کا..
بر: راک مسئلہ حل ہو گیا تو وہ تندرست ہو کر کچھ اور سوچنے
بعد گئے قایل ہو گئے۔ انہوں نے سبزیاں اگانے کا تجربہ کیا
ں۔ کامیاب رہا — دو سال گذر گئے — مچھلیوں اور
ایک سبزیوں نے انہیں نئی زندگی دی لیکن اب الِنو کے صرف
رکی ۶ آدمی زندہ تھے۔ اس طویل عرصے میں جزیرے میں امن
ہو چکا۔ نہ بمباری ہوئی نہ کوئی امریکی بحری جہاز آیا لیکن الِنو کی
بدج، ابھی تک امریکہ کے برخلاف برسرپیکار تھی اور اس
دل ہنظار میں تھی کہ امریکی فوجیں اس جزیرے پر حملہ کریں اور
برد، ان کے خلاف لڑیں۔ اِلنو دو لو مشین گنوں کو ہر لمحہ تیار
دں رکھتا تھا۔ اب تو اسے دو پستول بھی مل گئے تھے۔

دم ان دو برسوں کے درمیان لڑکی سب کی تفریح
چھلہ سامان بنی رہی۔ لیکن ایک روز دو آدمی لڑکی پر اُلجھ
پڑے اور انہوں نے ایک دوسرے کو لہولہان کر دیا۔
میر نے سب کو جمع کر کے لڑکی کو حکم دیا کہ وہ اپنا ایک
ہو ۳ وند منتخب کر لے تاکہ ہر روز کا جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔
یل رکو توقع تھی کہ لڑکی اسی کو منتخب کرے گی۔ لیکن اس نے
براب اور آدمی 'شیبا' کو خاوند چُن لیا۔ اِلنو نے دل پر پتھر
نک رکھ کر جاپانی رسم و رواج کے مطابق شادی کر دی۔

ار ایک اور برس گذر گیا۔ ان چھ آدمیوں میں چند دن
ب کر امن و امان قائم رہا۔ لیکن عورت کی موجودگی نے امن
ہا دیر نہ دیا۔ لڑکی کے خاوند شیبا کو اس کے چال چلن پر
) شبہ ہوا اور وہ اسے مارنے پیٹنے لگا۔ اِلنو نے اسے ظلم
) رنے باز رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن شیبا نے لڑکی کو اور
ے پا اور الزام لگایا کہ وہ اِلنو سے ملتی ہے۔
نا ۱۹۵۰ء کے سال کا جون آگیا یعنی جنگ عظیم کو ختم ہوئے

پانچ سال گذر چکے تھے۔ ایک روز اچانک لڑکی لاپتہ ہو گئی
سب آدمی دو ہفتے تک اسے وادیوں اور جنگلوں میں تلاش
کرتے رہے لیکن اس کا سُراغ نہ ملا اِلنو نے شیبا پر شبہ کیا
کہ اس نے اُسے قتل کر دیا ہے۔ تو شیبا نے انکشاف کیا کہ
ایک روز ہم دونوں ساحل کے ساتھ گھوم رہے تھے
کہ امریکہ کا ایک چھوٹا سا بحری جہاز کنارے آ لگا۔ لڑکی
اس کی طرف بھاگی میں نے اسے پکڑنے کی بہت کوشش
کی لیکن اسے جہاز کے ملاحوں نے کشتی لٹکا کر اٹھا لیا
اور اسے ساتھ لے گئے۔

ایک مہینے بعد ساحل پر، جہاں امریکی جہاز لنگر
انداز ہوا کرتے تھے اِلنو کے ایک آدمی کو دو لفافے پڑے
ملے۔ اس نے اِلنو کو دیئے، ایک پر اِلنو کا نام لکھا تھا اور
دوسرے پر اس کے ایک اور آدمی کا نام تھا جو نیوی کا
سپاہی تھا۔ انہوں نے لفافے کھولے تو اندر سے ان
کی بیویوں کے خط نکلے۔ وہ خط دیکھ کر بہت حیران ہوئے
کہ وہ واقعی ان کی بیویوں کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے
تھے۔ اور ان میں ان کے خاندانوں کے بچے، بوڑھے سب
کے نام لکھے ہوئے تھے قصہ دراصل یہ تھا کہ اِلنو کی پارٹی
کا ایک بحری سپاہی جسے وہ سمجھتے تھے کہ سمندر میں مچھلیاں
پکڑتے وقت ڈوب گیا ہے۔ ایک روز ساحل پر گیا تو
اُدھر سے ایک امریکی موٹر بوٹ آ نکلی وہ اس کشتی میں
سوار ہو کے چلا گیا تھا۔ اس کے علاوہ لڑکی بھی جاپان
پہنچ چکی تھی ان دونوں نے وہاں اِلنو اور اس کے آدمیوں
کے متعلق اطلاع دی تھی۔ سرکاری طور پر ان کے گھر والوں
سے ان کے نام خط لکھوائے گئے۔ اور ایک روز نیوی کی
ایک لانچ یہ دونوں لفافے جزیرے کے ساحل پر رکھ گئی
خط رکھنے والوں کو بتایا گیا تھا کہ اِلنو کے آدمی ساحل

کی پہریداری کرتے ہیں ان خطوط میں الو اور اس کے ساتھیوں کو گھر والوں نے لکھا تھا کہ جنگ ختم ہوئے پانچ برس گذر چکے ہیں اور تم گھر آجاؤ۔

الو کے آدمیوں نے جزیرے میں باغ اگالیے تھے اور نہایت صحت مند زندگی بسر کر رہے تھے لیکن ان خطوط نے ان کے جذبات میں ہل چل مچادی۔ الو کو اپنی بیوی۔ اور اپنا اکلوتا بچہ یاد آنے لگا۔ دسمبر ۱۹۵۰ء میں ایک روز پھر ساحل پر بند لفافے پڑے ملے جو رات کے وقت کوئی کشتی رکھ گئی تھی خطر رکھنے والوں کو معلوم تھا کہ الو کی فوج کے پاس مشین گنیں اور پستول ہیں اس ڈر سے وہ جزیرے کے اندر نہیں جاتے۔ یہ خط الو کے باقی آدمیوں کے نام تھے جو ان کے گھر والوں نے لکھے تھے۔ پہلے تو وہ ان خطوط کو دھوکہ سمجھتے رہے۔ لیکن ایک روز الو نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اب اگر کوئی جہاز آجائے تو ہم اس میں واپس چلے جائیں گے لیکن اس کے آدمی چلا اٹھے۔ ایک نے کہا یہ اس نامراد لڑکی کی کرتوت ہے۔ اس نے امریکیوں کو ہمارے نام بتادیے ہیں یہ امریکی سازش ہے۔ وہ ہمیں گرفتار کر کے جزیرے پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔" دوسرے نے کہا یہ جزیرہ ہمارے شہنشاہ کا ہے ہم اس سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ ہم لڑیں گے۔" الو چپ ہوگیا۔ اسے اپنی بیوی کی یاد ستا رہی تھی۔ وہ چٹان کی کھوہ میں چلا گیا اور چپ چاپ دن گزارنے لگا۔ اس کا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔

۱۹۵۱ء کے جون کا ایک دن تھا کہ ایک امریکی طیارہ جاپانی زبان میں لکھے ہوئے کئی اشتہار جزیرے پر بکھیر گیا۔ ان میں لکھا تھا کہ جنگ ختم ہوگئی ہے اور جو جاپانی یہاں موجود ہیں وہ ساحل پر چلے جائیں۔ کل ایک امریکی بحری جہاز انھیں جاپان لے جائے گا۔ دوسرے روز ایک بحری جہاز آگیا لیکن الو کے آدمی ساحل پہ نہ گئے۔ الو نے اپنے آدمیوں سے کہا میں جہاز میں سوار ہوجاتا ہوں اور تم جنگل میں چھپ کے دیکھتے رہو اگر یہ دھوکہ ہوا تو میں بازو لہراؤں گا اور تم جہاز سے دور رہنا۔ اس کے آدمی مان گئے۔

الو ساحل پہ گیا تو اسے جہاز والوں نے سیڑھی لٹکا کر اٹھا لیا۔ جہاز میں چند ایک جاپانی فوجی افسر موجود تھے۔ انہوں نے اسے قائل کر لیا کہ جنگ ختم ہوئے چھ برس گذر گئے ہیں۔ آخر وہ مان گیا اور اس نے اپنے چھپے ہوئے آدمیوں کو بھی جہاز میں بلالیا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی نہ آیا۔ اور جہاز الو کو ساتھ لے چلا گیا۔

چند دنوں بعد پھر طیارے کے ذریعہ جزیرے پر اشتہار پھینکے گئے اور ایک جاپانی لانچ بھیج کر الو کی نشان دہی کے مطابق اس کے ساتھیوں کو تلاش کیا گیا۔ اور بصد مشکل انہیں قائل کیا گیا کہ جنگ ختم ہوگئی ہے یہ ساری کوششیں اس لڑکی کی تھیں جو جزیرے میں ان کی تفریح کا بھی کشت و خون کا بھی باعث بنی رہی تھی۔ اس نے حکام بالا کو دردکر قائل کیا تھا کہ وہ جاپان کے وفادار اور جانباز باشندے ہیں انھیں ویران جزیرے میں مرنے سے بچایا جائے۔

آخر ۳۰ جون ۱۹۵۱ء کو دس بجے دن کے الو کے باقی آدمی بھی جہاز میں سوار ہوگئے۔ اور جنگ عظیم جو سرکاری طور پر ۱۵ اگست ۱۹۴۵ء کو ختم ہوگئی تھی عملاً ۳۰ جون ۱۹۵۱ء دن کے دس بجے ختم ہوئی۔

٭٭



عورت اور جنگ

"میں آپ کو فرانس اور جرمنی کی جنگ کی ایک ہولناک داستان سُناتا ہوں۔" موسیو اینڈ ولین نے بیرن ڈی ریوت کی رہائش گاہ میں تمباکو پینے کے کمرے میں اپنے کچھ دوستوں سے کہا "آپ لوگ میرے اس گھر کے بارے میں جانتے ہی ہیں جو فابرگ ڈی کارمیل میں ہے۔ جب پروشین یہاں آئے تو میں اُسی گھر میں رہتا تھا۔ میرے پڑوس میں ایک پاگل عورت رہتی تھی، وہ پے در پے صدموں کی وجہ سے اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ ۲۷ سال کی عمر میں وہ باپ کے سائے سے محروم ہو گئی۔ اس کے ایک ماہ بعد ہی وہ اپنے نوزائیدہ بچے اور خاوند سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

"جب موت ایک بار کسی کا گھر دیکھ لیتی ہے تو دوبارہ جلد ہی لوٹتی ہے۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔ نوجوان عورت غموں سے نڈھال بستر مرگ پر لیٹ گئی۔ چھ ہفتے تک اس کی حالت بہت خراب رہی، اور پھر طوفان گزرنے کے بعد مہیب سکوت چھا گیا۔ وہ ہر وقت بے حس و حرکت بیٹھی رہتی، برائے نام کھانا کھاتی صرف اس کی آنکھوں کی پُتلیاں متحرک رہتیں۔ لوگ جب بھی اُسے اُٹھانے کی کوشش کرتے، وہ زور زور سے چیخیں مارنے لگتی جیسے اُسے قتل کیا جا رہا ہو۔ وہ اسے بستر ہی میں لیٹے رہنے دیتے۔ اسے صرف نہلانے دُھلانے، لباس تبدیل کرنے یا بستر جھاڑنے کے لئے اٹھایا جاتا۔

اِس کا ایک پرانا ملازم اس کے پاس ہی رہنے لگا، تاکہ اسے کھانے پینے کے لئے کچھ دیتا رہے، اسے

بھلانے لو تو تست دیا جاتا۔ کوئی بھی اس کے غمزدہ دل کی حقیقی حالت سے واقف نہ تھا، کیوں کہ اس نے بولنا چالنا چھوڑ دیا تھا۔ کیا وہ مرنے والوں کے بارے میں سوچتی رہتی ہے؟ کیا وہ خالی الذہن ہوگئی ہے، یا پھر ماضی کے واقعات کے متعلق یونہی سوچتی رہتی ہے۔ یا اس کا حافظہ جاتا رہا ہے۔ اُسے ماضی کی کوئی بات یاد نہیں رہی، کیا اس کی یادداشت میں اس جوہڑ کی طرح ٹھہراؤ پیدا ہوگیا ہے جس میں لہریں نہیں اٹھتیں؟؟

اسی حالت میں پندرہ سال بیت گئے۔ وہ اسی طرح عزلت نشین اور اندرون بینی کی زندگی گزارتی رہی۔

پھر جنگ چھڑ گئی اور دسمبر کے اوائل میں جرمن کارمیل آپہنچے۔ مجھے تمام واقعات کل کی بات معلوم ہوتے ہیں۔ سردی کچھ اتنی شدید تھی کہ پتھر بھی جم کر رہ گئے تھے۔ اور میں ایک آرام کرسی میں لیٹا ہوا تھا، کیونکہ گٹھیا کے مرض کی وجہ سے ہل بھی نہ سکتا تھا۔ میں گلی سے گزرتے ہوئے سپاہیوں کے بھاری قدموں کی چاپ سُن رہا تھا جو میری کھڑکی کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

فوجی دھاگوں سے حرکت کرنے والی کٹھ پتلیوں کی طرح اِدھر سے اُدھر حرکت کرتے نظر آرہے تھے۔ فوجی افسروں نے بھی اپنے جوانوں کو مقامی لوگوں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔ میرے حصے میں سترہ آدمی آگئے۔ میری ہمسایہ پاگل عورت کے حصے میں بارہ آدمی آئے۔ جن میں کمانڈنٹ بھی تھا۔ وہ بے حد جھگڑالو تھا۔

شروع کے چند روز تو ہر چیز معمول کے مطابق چلتی رہی۔ دوسرے گھر میں رہنے والے افسروں کو یہ بتادیا گیا کہ یہاں ایک بیمار عورت رہتی ہے، انھوں نے پہلے پہل تو اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی، لیکن اس عورت کی موجودگی نے انھیں بے چین کر دیا۔ انھوں نے اس کی بیماری کے بارے میں دریافت کیا، انھیں بتایا گیا کہ پے در پے غموں کی وجہ سے وہ پندرہ سال سے بستر سے لگی ہوئی ہے، اس میں شک نہیں کہ انھیں اس بات کا یقین نہ آیا۔ انھوں نے سمجھا کہ شاید یہ عورت اپنے غرور کی وجہ سے بستر چھوڑنا نہیں چاہتی۔ وہ ضرور ان جرمن افسروں کے قریب آنے، ان سے بولنے، یہاں تک کہ ان کو دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہے۔

کمانڈنٹ اس بات پر بضد تھا کہ وہ خود اٹھ کر اسے خوش آمدید کہے۔ اسے پاگل عورت کے کمرے میں لے جایا گیا۔ اس نے بڑے اکھڑ پن سے کہا:

"مادام میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ بستر سے اٹھیں اور میرے ساتھ نیچے آئیں تاکہ ہم سب آپ کو دیکھ سکیں"۔ لیکن اس نے جواب دینے کی بجائے اپنی نحیف آنکھیں اس کی طرف گھما دیں۔ اس پر کمانڈنٹ نے بگڑ کر کہا "میں ایسی توہین برداشت نہیں کرسکتا۔ اگر تم اپنی مرضی سے بستر سے نہیں اٹھوگی۔ تو مجھے ایسے ذرائع استعمال کرنے پڑیں گے، جن سے تم بغیر کسی مدد کے چلنے پھرنے پر مجبور ہو جاؤگی۔ اس پر بھی بیگی نے کوئی ایسی بات نہ کی جس سے پتا چلتا کہ اس نے افسر کی بات سُنی ہے۔ وہ پہلے کی طرح خاموش اور بے حس و حرکت لیٹی رہی۔ وہ اس مسلسل خاموشی کو اپنی ہتک سمجھتے ہوئے آگ بگولا ہوگیا۔ اس نے چلا کر کہا "اگر تم کل تک نیچے نہ اتریں تو۔۔۔" وہ اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کر چلا گیا۔

دوسرے روز اس نے بوڑھے ملازم کو ڈرایا دھمکایا اور اُسے مجبور کیا کہ وہ اس کو لباس پہنائے۔ لیکن پاگل عورت اس پر داد بلا کرنے لگی۔ جرمن افسر اوپر چلا آیا۔ بوڑھے ملازم

نے پگلی کو افسر کے قدموں میں ڈالتے ہوئے کہا "جناب وہ نیچے نہیں جائے گی۔ بالکل نہیں جائے گی۔ اسے معاف کر دیجئے۔ کیونکہ دنیا سے اس کا دل ٹوٹ گیا ہے۔"

اس بات سے افسر کا دل پسیج گیا۔ وہ اپنے سپاہیوں کو اُسے زبردستی گھسیٹ کر نیچے لانے کا حکم دینے کی بجائے یکا یک ہنسنے لگا۔ پھر اس نے جرمن زبان میں احکامات دیئے۔ تھوڑی دیر بعد سپاہیوں کی ایک ٹولی اس طرح چٹائی اٹھائے آئی جیسے کسی زخمی آدمی کو اٹھا رکھا ہو۔ پگلی شکن آلود بستر پر چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی۔ اسے اپنے ارد گرد ہونے والے ہنگامے کا کچھ علم نہ تھا۔ اس کے سرہانے ایک سپاہی زنانہ لباس لئے کھڑا تھا۔ افسر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "اب ہم دیکھیں گے کہ تم خود اپنا لباس تبدیل کر سکتی ہو اور چل پھر سکتی ہو یا نہیں؟"

اس کے بعد چٹائی پر پگلی کو ڈال کر سپاہیوں کی ٹولی ایملول کے جنگل کی طرف چل پڑی۔ دو گھنٹے کے بعد سپاہی خالی ہاتھ واپس لوٹے۔ اس کے بعد پاگل عورت کا کچھ پتا نہ چلا۔ جانے انھوں نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ وہ اسے کہاں لے گئے۔ کوئی بھی نہ جانتا تھا۔

دن رات برف باری ہوتی رہی۔ میدان اور جنگل پر خون جما دینے والا کہرا پڑتا رہا اور بھیڑیئے ہر گھر کے دروازے پر آکر غراتے رہے۔

اس پاگل عورت کا خیال میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ میں نے پردشین افسروں کو اس سلسلے میں تحقیقات کرنے کے لئے کئی درخواستیں دیں، جس پر وہ بہت بگڑے۔ جب موسم بہار آیا تو یہ ٹھہرے ہوئے فوجی واپس جانے لگے۔ لیکن میرے پڑوس کا مکان بدستور بند رہا۔ باغ کی روشوں میں گھاس اُگنے لگی۔ بوڑھا ملازم سردیوں ہی میں مرگیا تھا اور کسی کو بھی واقعہ یاد نہ رہا۔ صرف میں اس کے بارے میں مسلسل سوچے جا رہا تھا۔ آخر انھوں نے اس عورت کا کیا کیا؟ کیا وہ جنگل کے راستے بچ نکلی تھی۔ کیا کسی نے اُسے وہاں لیٹے ہوئے پاکر ہسپتال پہنچا دیا تھا۔ کیونکہ وہ تو انھیں کچھ نہ بتا سکی ہوگی، میرے شک و شبہات دُور کرنے کے لئے مجھے کوئی ثبوت نہ ملا۔ وقت کے ساتھ ساتھ میرا تجسس بھی کم ہوتا گیا۔

ہاں تو آنے والے موسم خزاں میں جنگلی مرغول کی بہتات تھی۔ اب تو میری گٹھیا کی تکلیف بھی کچھ کم ہو گئی تھی میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا جنگل تک چلا گیا۔ میں نے کوئی چار پانچ لمبی دُم والے پرندے شکار کئے۔ ان میں سے ایک شاخوں سے بھری کھائی میں گر پڑا۔ مجھے اسے باہر لانے کے لئے اس میں اُترنا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ پرندہ ایک ڈھانچے کے سر کے قریب پڑا ہے۔ اچانک پاگل عورت کا خیال میرے دل میں اُبھرا۔ گزشتہ تباہی کے چند سالوں میں کئی ایک افراد جنگلوں میں مارے گئے تھے لیکن اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ میرے سامنے اُسی غریب پاگل عورت کی کھوپڑی پڑی تھی۔

میری سمجھ میں سب باتیں آگئیں۔ جلد ہی ہر بات کا مجھے اندازہ ہونے لگا۔ وہ سپاہی اس غریب عورت کو توشک میں لپیٹ کر سردی میں باہر لے گئے ہوں گے۔ اور پھر ویران جنگل میں بھی وہ اپنی ضد پر قائم رہی ہوگی۔ اور خود کو برف کی موٹی تہہ میں چپ چاپ دب جانے دیا ہوگا، پھر بھیڑیوں نے اُسے چیر پھاڑ ڈالا ہوگا۔ پرندوں نے اس کے پھٹے ہوئے بستر سے روئی نکال کر اپنے گھونسلے بنالئے ہوں گے۔ میں نے اس کی ہڈیاں دفن کر دیں۔ میری تو یہی دعا ہے کہ ہماری اولاد مزید کوئی جنگ نہ دیکھے ★



کیا ہٹلر اس بچے کا باپ تھا؟

شنکر لال

نازی جرمنی کی شکست کے بعد امریکی فوج جب برلن میں داخل ہوئی تو وہاں کے سرکاری دفاتر پر قبضہ کرتے وقت بہت سے اہم کاغذات اس کے ہاتھ آئے۔ ان تمام کاغذات کو واشنگٹن بھیج دیا گیا۔ ہٹلر کی محبوبہ ایوا براؤن کی ڈائری اور بہت سے البم بھی ان کاغذات میں شامل تھے۔ ایوا براؤن کی موت بھی ہٹلر کے ساتھ ہی واقع ہوئی تھی۔ بہت دنوں تک ان کاغذات کو کسی نے کوئی اہمیت نہ دی۔ حال ہی میں ایک امریکی صحافی نے ایوا براؤن کی ڈائری اور اسکے البموں کا مطالعہ کیا جس سے بہت سے رازہائے سربستہ

سے پردہ اٹھا۔

ایوا براؤن کے البموں میں ایک بچے کی تصویریں بھی ہیں۔ تقریباً ہر تصویر میں وہ ہٹلر کے ساتھ نظر آتا ہے۔ یہ بچہ کون تھا؟ ہٹلر اور اس کی محبوبہ اس کا اتنا خیال کیوں کرتے تھے؟ ان سوالات کا جواب حتمی طور پر کبھی نہ مل سکا۔ لیکن قیاس یہی ہے کہ یہ بچہ ہٹلر کا اپنا بیٹا تھا۔

ایوا براؤن کو بخوبی معلوم تھا کہ تاریخ میں ہٹلر کے ساتھ اس کا نام بھی ضرور لیا جائے گا۔ لیکن پھر بھی اس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ ہٹلر کے ساتھ اپنے تعلقات کو راز میں رکھا جائے، دوسری صورت میں اس کے ہزاروں دشمن پیدا ہو جاتے۔ اس نے تصاویر اور اخبارات وغیرہ کے تراشوں کے جو البم چھوڑے ہیں ان کی کوئی باقاعدہ تاریخی اہمیت نہیں ہے۔ پھر بھی بعض ایسے لوگوں کی تصویریں ملی ہیں جنھیں گرفتار ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ وہ لوگ ہیں جن کا کہنا ہے ان کا ہٹلر سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔

ان البموں میں سے پانچ میں ایوا کی وہ تصویریں ہیں جن میں اسے اپنی بہن اور سہیلیوں کے بچوں کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ کچھ گھریلو تصاویر ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے البموں میں ایک بچے کی سیکڑوں تصویریں ہیں اس بچے کی شکل وصورت بالکل ہٹلر جیسی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس کی کوئی الگ تصویر نہیں ہے۔ ہر تصویر میں یہ بچہ ہٹلر اور ایوا میں سے کسی ایک کے ساتھ یا دونوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ہٹلر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ تصویر اُتروانے میں بہت محتاط تھا۔ پھر بھی اس بچے کے ساتھ اس کی سَو سے زائد تصویریں ہیں۔ اسی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہٹلر کا اپنا بیٹا ہی ہوگا۔ جہاں تک ایوا براؤن کا سوال ہے اس کے بارے میں اب تمام باتیں معلوم ہو چکی ہیں۔ حالانکہ اس زندگی میں صرف چند مخصوص لوگ اس کی حیثیت سے واقف تھے۔

ہٹلر صرف ایک مطلق العنان حکمران ہی نہ تھا بلکہ جرمن اس کی پرستش کرتے تھے۔ لہٰذا اپنی ذاتی زندگی کو وہ بالکل صاف اور پاک رکھنا چاہتا تھا۔ لوگ اس کو بہت ہی پارسا خیال کرتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ عورتیں اپنے تکیوں کے نیچے ہٹلر کی تصویر رکھ کر سوتی تھیں۔

نازی اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ ہٹلر کے بارے میں کوئی ایسی بات دُنیا کو نہ معلوم ہو جس سے اس کی ذاتی زندگی پر کوئی حرف آسکے۔ برلن میں ایسی بہت سی ذی حیثیت خواتین تھیں جن کا نام ہٹلر کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ متعلقہ عورتیں اس قسم کی افواہ پر خوش ہوتی تھیں۔ وہ ہٹلر کے سامنے بہتر سے بہتر انداز میں آتی تھیں لیکن ایوا ان سب سے مختلف تھی۔

اس وقت اگر کوئی کہتا کہ ہٹلر کی محبوبہ پہلے ایک فوٹو گرافر کی سکریٹری تھی تو لوگ اس کا مذاق اڑاتے۔ ایک بار مسولینی کا وزیر خارجہ کاؤنٹ کیانو ہٹلر سے ملنے گیا۔ ایوا کو یہ ہدایت کردی گئی کہ جس وقت تک کیانو وہاں رہے وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے۔ کیانو کو کانوں کان ایوا کی موجودگی کا علم نہ ہوسکا۔ حالانکہ اسے ہٹلر کی ذاتی زندگی سے دلچسپی تھی۔ اس سلسلے میں جو بھی چھان بین کرتا اسے دوسری عورتوں کے نام معلوم ہوتے۔ لیکن ایوا براؤن کا کوئی ذکر نہ ہوتا۔

ایوا براؤن ایک خاموش طبع لڑکی تھی۔ وہ نازیوں کے

سرکاری فوٹوگرافر ہنریخ ہافمین کے ساتھ کام کرتی تھی۔ وہ بڑی ہیرو پرست قسم کی لڑکی تھی۔ ہمیشہ ہٹلر، مسولینی اور کیانو کا ذکر کرتی رہتی۔ ایوا خوبصورت تھی، لیکن اس کے اندر دوسری نوجوان لڑکیوں کی طرح کوئی ولولہ یا جوش نہیں تھا۔ اس کو ایک ایسے خوبصورت پھول سے تشبیہہ دی جاتی تھی جس میں خوشبو نہ ہو۔

ایوا ۱۹۱۲ء میں میونخ کے مقام پر پیدا ہوئی تھی۔ کا تعلق ایک متوسط خاندان سے تھا۔ تعلیم کے بعد وہ ہافمین کے ساتھ اس کی سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے لگی۔ ہٹلر اپنی تصویریں دیکھنے اکثر ہافمین کے پاس جایا کرتا تھا وہاں پر عام طور سے ایوا ہی ہٹلر کو تصویریں وغیرہ دکھاتی تھی۔ اس طرح اسے ہٹلر کے قریب آنے کا موقع ملا۔

ایوا نے اپنے البموں کو بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ شروع کے البموں میں اس کے بچپن، لڑکپن اور آغازِ جوانی کی تصویریں ملتی ہیں۔ ان البموں میں کچھ تصویریں ایسی بھی ہیں جن میں کسی دعوت کے موقعے پر ایوا کو رقص کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ان تصاویر میں ہٹلر بھی دعوت میں شریک نظر آتا ہے۔

آخری البموں میں ہٹلر کے ساتھ ایوا کی بہت سی تصویریں ہیں۔ ان میں ایسی تصاویر بھی شامل ہیں جن سے اس وقت کے واقعات کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ کچھ تصویریں ہافمین اور دوسرے فوٹوگرافروں کی کھینچی ہوئی ہیں۔ ایوا خود بھی بڑی اچھی فوٹوگرافر تھی۔ لہٰذا اس نے بھی بہت سی تصویریں لیں۔ ان میں ہٹلر کی گھریلو تصویریں بھی ہیں جن میں وہ سادے لباس میں نظر آتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم تصاویر مارٹن بورمین کی ہیں جس کو ہٹلر نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ بورمین بہت ہی محتاط آدمی تھا لیکن جب بھی ہٹلر سے ملنے جاتا، ایوا چھپکے سے اس موقع کی تصویر لے لیتی۔ اس طرح اور بھی اہم شخصیتیں جو خفیہ طور پر ہٹلر سے ملاقات کرتی تھیں ایوا کے البم میں موجود ہیں۔

ایوا کی ڈائری اور البم ایک قیمتی تاریخی سرمایہ ہیں۔ ان سے اس دور کے بہت سے واقعات اور لوگوں کا پتہ چلتا ہے۔

ایوا براؤن کی ڈائری اس لئے تاریخی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں ہٹلر کے قریب ترین مشیر مارٹن بورمین کی شخصیت کے بعض اہم پہلوؤں سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ اپنے آخری ایام میں ہٹلر کو صرف تین شخصیتوں پر اعتماد تھا۔ ایک تو خود ایوا براؤن تھی۔ دوسرا ڈاکٹر گوبلز تھا اور تیسرا شخص مارٹن بورمین تھا۔ ایوا براؤن اور ڈاکٹر گوبلز دونوں نے ہٹلر کے ساتھ ہی خودکشی کی۔ لیکن مارٹن بورمین کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوا۔ بعض لوگوں کی رائے میں وہ زندہ ہے۔ اور ارجنٹائنا میں گمنام زندگی بسر کر رہا ہے۔ ★★

دشمنوں سے تو خیر کیا شکوہ!
آپ اپنے رقیب ہیں ہم لوگ

فاصلے کس قدر دلوں میں ہیں
گو بظاہر قریب ہیں ہم لوگ

دے رہے ہیں قلم کی نیلامی
ہائے کیسے ادیب ہیں ہم لوگ

توپوں کی زد میں آتے ہی اُسنے تمام بم گرا دیئے



فہیم اقبال

ویت نام کے سینے پر اب کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں امریکی بمباروں نے اپنی وحشیانہ بمباری سے شگاف نہ ڈال دیئے ہوں۔ ایشیا کے اس سرسبز و شاداب ملک میں اب آپ کو چاروں طرف مشین گنوں کی آوازیں اور بارود کی بو پھیلی ہوئی ملے گی۔ اب یہاں کوئی گھر، کوئی گلی، کوئی شاہراہ ایسی نہیں جس پر امریکی طیاروں نے بم نہ برسائے ہوں۔ اسکولوں معبدوں، ہسپتالوں تک پر بمباری کی گئی۔ اور ہر روز کی جاتی ہے۔ اس کے باوجود مٹھی بھر حریت پسند ویت نامی باشندوں پر قابو پانا امریکہ جیسی بڑی طاقت کے لئے دن بہ دن ایک سنگین مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔

آئے دن بیسیوں بمبار گلیوں شاہراہوں پر اپنے خونی طیاروں کا بوجھ ہلکا کر کے چلتے بنتے ہیں، لیکن بم برسانے کے بعد ان کا صحیح سلامت اپنے اڈوں کو لوٹ جانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ وہ ہوا باز بڑے خوش قسمت اور بہادر سمجھے جاتے ہیں جو حریت پسندوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ویت نامی باشندے اپنے دیسی ہتھیاروں سے امریکہ کے جدید ترین طیاروں کو اتنی آسانی سے گرا لیتے ہیں کہ اب امریکی ہوا باز ویت نامی علاقوں میں پرواز کرنے سے کترانے لگے ہیں۔

یہ دس مارچ ۱۹۶۷ء کا ذکر ہے۔ جنوبی ویت نام کے گھنے جنگلات میں آشو کے مقام پر دو ہزار ویت کانگ گوریلے جنوبی ویت نام کی فوج اور امریکی دستوں سے جنگ لڑ رہے تھے۔ پورا جنگل مشین گنوں اور توپوں کے دھماکوں سے گونج رہا تھا، چاروں طرف بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی، فضا میں گرد و غبار اور دھول ہی دھول تھی، آسمان گہرے سیاہ بادلوں کے پیچھے چھپ گیا

تھا۔ دونوں طرف سے یہ معرکہ جیتنے کی کوششیں جاری تھیں کہ آشو کے قریب واقع ایک امریکی فضائی اڈے کے حکام نے میجر برنارڈ فشر اور میجر جمپ مائز کو حکم دیا کہ وہ چھ طیاروں کے ساتھ آشو کی جنگ میں امریکی اور جنوبی ویت نامی فوجوں کو مدد پہنچائیں۔

امریکہ کا یہ فوجی ہوائی اڈہ لاؤس کی سرحد کے نزدیک واقع تھا۔ اسے چاروں طرف سے گھنے جنگلات نے گھیر رکھا تھا۔ چوں کہ یہ ایک اہم فوجی ہوائی اڈہ تھا اس لیے امریکی فوجیں اس کی کڑی نگرانی کرتی تھیں — ویت کانگ گوریلوں کو اس اڈہ کا علم تھا۔ چناں چہ انھوں نے کئی مرتبہ حملے کرکے اس اڈے کو بری طرح نقصان پہنچایا تھا لیکن اس کے باوجود یہ فضائی اڈہ قائم رہا۔

۱۰ مارچ کو جب اس فضائی اڈے سے تھوڑے فاصلے پر ویت کانگ گوریلوں نے مشترکہ امریکی اور جنوبی ویت نامی فوجیوں پر حملہ کیا تو میجر برنارڈ فشر اور میجر جمپ مائز اپنی نگرانی میں چھ طیارے لے کر اڑے۔ میجر فشر اور میجر جمپ کو آٹھ ہزار فٹ کی بلندی سے غوطہ لگا کر ایک درخت کی اونچائی پر آنے کے بعد چھ میل تک بم برسانے تھے۔ یہ بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔ ویت کانگ گوریلے زبردست گولہ باری کر رہے تھے اور ایسی صورت میں میجر فشر اور میجر جمپ کا اس مہم پر جانا موت کے منھ میں جانے کے مترادف تھا۔ اس مہم میں جتنے ہوا باز شریک تھے وہ سب کے سب اس بات سے واقف تھے کہ ان کا زندہ بچ آنا ایک معجزے سے کم نہیں تھا۔ میجر فشر اور میجر جمپ اپنے اپنے طیاروں میں تھے۔ انھیں ہیڈکوارٹر سے وائرلیس کے ذریعے برابر ہدایات مل رہی تھیں۔

اس کے ساتھ ہی انھوں نے آشو کے مقام پر اپنی فوجوں سے بھی رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ انھیں ہدایت ملی کہ ویت کانگ گوریلوں پر بم برسائیں۔ وہ اپنے چھ جہاز جنگل میں صرف پچاس فٹ کی بلندی پر لے آئے۔ ویت کانگ گوریلے طیاروں کو اتنے قریب دیکھ کر گھبرا گئے۔ اور پناہ گاہوں میں چھپ گئے، طیاروں کی ساری بمباری بےکار ہی گئی —— آدھ گھنٹے بعد وہ دوبارہ واپس آئے لیکن اب جنگل میں چھپی ہوئی موت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اچانک دو ہزار ویت کانگ گوریلوں کی توپیں آگ برسانے لگیں، چار جہاز اسی جگہ گر گئے، میجر فشر اپنے زخمی جہاز کو لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن میجر جمپ کا جہاز بری طرح توپوں کی زد میں آچکا تھا اور موت اس کی نگاہوں کے سامنے ناچ رہی تھی۔

اس نے سوچا کاش وہ آج اس مہم میں شریک نہ ہوا ہوتا۔ اگر اسے اس دن حملے کا حکم نہ ملتا تو اگلے دن سے اس کی ایک ہفتہ کی چھٹیاں شروع ہو رہی تھیں، جنھیں وہ بنکاک میں گزارنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا، اب شاید میں بنکاک کبھی نہ دیکھ سکوں۔ اس کے طیارے کی آواز بدل گئی تھی۔ زندگی کا بہت مختصر سا حصہ باقی رہ گیا تھا۔ ابھی کوئی گولہ اس کے طیارے کے پرخچے اڑا دے گا۔ ٹھیک اسی لمحے تین اور گولیاں اس کے طیارے پر آکر لگیں۔ لیکن وہ اپنے طیارے کو آگے بڑھاتا چلا گیا۔ اب وہ بم برسانا بھول گیا تھا، اپنی جان بچانے کی فکر کر رہا تھا۔ اس نے توپوں کی زد میں آتے ہی سارے بم نیچے گرا دیے تھے اور طیارے کو نیچے اتارنے میں کامیاب ہوگیا۔ ■■

ہٹلر کا آخری دور

تلخیص: مسعود احمد صدیقی

مصنف ـــــ فریڈرک سونڈرن



برلن میں نازی جرمنی کے زوال کے تین ہفتے بعد روسی حفاظتی پولیس کے نائب چیف نے بیان دیا کہ نہ ہی ہٹلر نے اپنے آپ کو زمین دوز پناہ گاہ کے اندر ہلاک کیا اور نہ ہی اس کی لاش کو نذر آتش کیا گیا جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا۔ اور یہیں سے اس بارے میں مختلف افواہیں پھیلنا شروع ہو گئیں کیونکہ اب بھی کچھ لوگوں کو یقین تھا کہ ہٹلر زندہ ہے ـــــ

۱۹۴۵ء میں اتحادیوں کے محکمہ تاریخ سازی سے اس سلسلے میں فوری تحقیقات کے احکام جاری کئے گئے ـــــ اور پھر اس کے بعد ہٹلر کے آخری ایام پر سے رفتہ رفتہ تاریکی کا پردہ ہٹتا گیا ـــــ وہ اٹھائیس افراد جو برلن کی جنگ کے دوران ہٹلر سے قریب تر رہے تھے، مغربی اتحادیوں نے ان کو گرفتار کیا اور ان سے مختلف سوالات کئے گئے۔ ان افراد کے بیانات کو دوسرے حقائق کی روشنی میں پرکھا گیا اور پھر مختلف بیانات کو ترتیب دے کر ہٹلر کے انجام کی صحیح کہانی منظر عام پر آگئی ـــــ

۳۰ اپریل ۱۹۴۵ء کی دوپہر کو دو بج کر تیس منٹ پر اڈولف ہٹلر نے اپنی زمین دوز فیوہرر بنکر میں اپنی بیوی کے نزدیک بیٹھ کر اپنے تالو میں پستول کی گولی مار کر خود کو ہلاک کیا، اور ایوا ہٹلر (ہٹلر کی بیوی) نے سائنائیڈ جیسے سریع الاثر زہر سے خود کو ہلاک کیا۔ اسی شب کو ساڑھے دس بجے ان کی جلی ہوئی مسخ شدہ لاشوں کو جو کہ بار بار چانسلری باغ میں پیٹرول چھڑک کر جلائی گئی تھیں جنرل راٹن ہوبر نے دفن کر دیا۔ اس رات چانسلری باغ کے مضافات میں روسی توپ خانہ برابر آگ برساتا رہا ـــــ شاید ہٹلر کی ہڈیاں بھی اس کی ہزار سالہ تاریخ کی طرح منتشر ہو گئیں ـــــ

اس اختتام کی ابتداء ۲۰ اپریل ۱۹۴۵ء کو فیوہرر کی سالگرہ سے ہوئی ـــــ زمین دوز فیوہرر بنکر میں جو کہ چانسلری باغ کی سطح سے پچاس فٹ نیچے واقع تھی جرمن مسلح افواج اور نازی پارٹی کے اعلیٰ حکام اپنے جنگجو رہنما کو نذرانہ عقیدت



• نازی جرمنی کا سب سے بہادر افسر جنرل رومیل

پیش کرنے کے لیے حاضر ہوئے، وہاں گے ہر متنفر سے شان و شوکت عیاں تھی لیکن زیادہ تر چہرے غم واندوہ کی وجہ سے مضمحل و لاغر نظر آرہے تھے ــــــ جرمن افواج ہر محاذ پر پسپا ہو رہی تھیں، روسی برلن کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے اور مغربی اتحادی جو کرائن کو پار کر چکے تھے تیزی سے پیشقدمی کر رہے تھے ــــــ دس ماہ قبل ہونے والے حادثے کے بعد سے جس میں چند جرنلوں نے ہٹلر کو بم کے ذریعے ہلاک کرنے کی ناکام کوشش کی تھی اب ہٹلر بہت بوڑھا نظر آتا تھا۔ اس کے ایک پیر میں معمولی سی لنگڑاہٹ تھی اور اس کے بائیں بازو میں رعشہ بھی تھا لیکن اب بھی اس کی آواز میں ہمیشہ کی سی سختی اور آنکھوں میں پہلے جیسی چمک بھی، اور

• جنگ ختم ہورہی تھی تو خوف زدہ جرمن سپاہی دہشت زدہ ہو کر کنوئیں میں چھلانگ لگا گئے

پھر جب کانفرنس شروع ہوئی اور ہر محاذ پر شکست اور بدلتے ہوئے حالات کا تذکرہ شروع ہوا تو ہٹلر کو اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ جب فیلڈ مارشل کیٹل نے ہٹلر کو بڑھتے ہوئے خطرے سے آگاہ کیا تو ہٹلر نے شدید غصے کے ساتھ اس کو جواب دیا۔ "بیوقوف، تم نہیں جانتے کہ روسی برلن کو ناقابل تسخیر پائیں گے اور یہاں پہنچ کر ان کو شکست فاش ہوگی اور تب ہم مغربی اتحادیوں کو بھی واپس سمندر میں دھکیل دیں گے ــــــ" تمام نگاہیں اس دوران میں ان پر جمی ہوئی تھیں اور تمام حاضرین ساکت تھے۔ گورنگ نے فیوہرر کو کسی محفوظ مقام پر منتقل ہونے کی تجویز پیش کی اور اس کے بعد خود رخصت لے کر بواریا کے لئے روانہ ہو گیا جہاں وہ اپنے آپ کو موجودہ صورت حال کے پیش نظر مقابلتاً محفوظ تصور کرتا تھا۔ اس کے بعد ہٹلر محاذ جنگ کے نقشوں کی طرف متوجہ ہوا اور اپنی جنگی مہم کو جرنلوں پر واضح کرنے لگا۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد ایک جنرل نے کہا کہ "اس کے باوجود کہ ہم جانتے تھے کہ جن فوجی دستوں کے بارے میں ہٹلر ہدایات دے رہا ہے، وہ کسی بھی پیشقدمی کے قابل نہیں ہیں اور تقریباً ناکارہ ہو چکے ہیں، ہم کو اس کی تقریر کے دوران ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید اب بھی فتح کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے۔"

• ایک امریکی سپاہی کا جنگی جنون



ہٹلر کے چند وفادار فوجی جرنل



• خاتمہ جنگ سے قبل ہٹلر اور گوئرنگ سے ملاقات

ان حالات میں فیوہرر بنکر میں صرف ایک فرد ایسا تھا جو ہٹلر کو اس کے جنونی پن سے باز رکھ سکتا تھا۔ اور وہ تھا البرٹ اسپیر ـــــ وزیر حربیہ، جس کو جرمنی کی صنعت اسلحہ سازی میں ایک اعلیٰ دماغ تصور کیا جاتا تھا ـــــ اور وہ جرمن عوام کی بہتری کا بھی خواہاں تھا۔

مارچ کے اوائل میں ہی اسپیر کو ہٹلر کے اس خطرناک منصوبے کا علم ہو چکا تھا جس کا مطلب تھا کہ شکست کی صورت میں جرمنی کو مکمل طور پر تباہ کر دیا جائے۔ تمام اضلاع کے پارٹی لیڈروں کو اس سلسلے میں تفصیلی احکامات جاری کئے جا چکے تھے کہ اگر اتحادی جرمنی میں داخل ہو جائیں تو تمام صنعتی کارخانے، عام استعمال کی اشیاء، اناج اور کپڑے کے ذخیرے تباہ کر دیئے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی فوج کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ تمام اہم پلوں، ریلوے لائنوں، نہروں، جہازوں اور مشینوں کو مکمل طور پر تباہ کر دے۔

اسپیر نے پورے ملک کا طوفانی دورہ کیا اور تمام اعلیٰ حکام اور اہم جرنلوں سے ملاقات کی اور ان کو ہٹلر کے اس حکم سے باز رکھنے کی کوشش کی ـــــ اسپیر کے لئے ہٹلر کی سالگرہ کا دن بڑی اہمیت رکھتا تھا کیونکہ یہ ایک آخری موقعہ تھا ہٹلر کو اس کے جنونی پن سے باز رکھنے کا۔ لیکن اس موقع پر بھی ہمیشہ کی طرح ہٹلر نے بڑے سخت لہجے میں جواب دیا "تمہارا مطلب ہے کہ جرمن افواج اپنی پیشقدمی روک دیں اور جنگ سے دست بردار ہو کر اتحادیوں کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دیں اور اپنی شکست تسلیم کر لیں، ہمارا یہ قدم بزدلی پر مبنی ہوگا اور اس طرح صرف تباہی و بربادی ہمارا مقدر ہو جائے گی۔" ہٹلر کا یہ جواب بڑا بے معنی اور غیر اطمینان بخش تھا اس لئے اسپیر نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی جان پر کھیل کر ہٹلر کے اس تباہ کن منصوبے کو ناکام بنائے گا۔ گسٹاپو کی آہنی گرفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر پورے جرمنی کا دورہ کیا۔ ہمبرگ میں کارل کاف مین نے اس کو یقین دلایا کہ تمام بندرگاہیں تباہ ہونے سے بچا لی جائیں گی۔ اسی طرح دوسرے مقامات پر بھی اس کو یقین دلایا گیا کہ اس تباہ کن منصوبے کو شکست کی صورت میں عملی جامہ نہیں پہنایا جائے گا۔

اپنی اس کوشش کو مضبوط تر بنانے کے لئے اسپیر نے تمام آتش گیر مادہ اور تباہ کن بموں کو فوج کی دسترس سے نکال کر کانوں یا کنوؤں میں غرق آب کرا دیا ـــــ

اس دوران میں ہٹلر روسیوں کو برلن سے باہر نکالنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ منصوبے کے مطابق اس حملے کا آغاز ایس ایس کے جنرل فیلکس اسٹینر کو کرنا تھا۔ اس حملے کا حکم ٹیلیفون پر جنرلوں نے ہٹلر کی گرجدار آواز میں سُنا کہ "اگر کسی آفیسر نے ایک بھی فوج کو اس حملے سے باز رکھنے کی کوشش کی تو وہ پانچ گھنٹے کے اندر اندر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا"۔۔۔۔

۲۲ اپریل کی صبح کو فیوہرر نے اپنے مخصوص عملے کو باخبر کیا کہ اس کا منصوبہ فتح کے پہلے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ ایس۔ایس کے سربراہ ہملر نے ٹیلیفون پر اطلاع دی کہ جنرل اسٹینر کا دفاعی حملہ بڑی حد تک کامیاب رہا اور اب روسی افواج برلن سے پیچھے ہٹ رہی ہیں۔ یکے بعد دیگرے بہت سے پیغامات جنرل الفریڈ جوڈل کو بھی موصول ہوئے جو کہ تمام جرمن افواج کا ناظم اعلیٰ تھا۔ لیکن جنرل جوڈل جنگ کی اصل صورتِ حال سے واقف تھا۔ اس حملے کی کامیابی کی تمام اطلاعات سراسر فریب تھیں اور حقیقت اس سے بالکل مختلف تھی۔ اور اب جنرل جوڈل ہٹلر کو اس حقیقت سے لاعلم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ بڑی دیر تک وہ اپنے آپ کو ہٹلر سے گفتگو کرنے کے لئے تیار کرتا رہا اور پھر اس نے بڑی ہمت کر کے خوف زدہ چہرے کے ساتھ رُک رُک کر ہٹلر کے سامنے اس طرح حقیقت کا انکشاف کیا کہ "میرے فیوہرر۔ حقیقت یہ ہے کہ ۔۔۔۔ جنرل اسٹینر نے مارشل زدکوف کی مسلح فوج پر حملہ نہیں کیا"۔ اس جواب نے ہٹلر پر بم کے دھماکہ کا سا اثر کیا۔ وہ اپنے زرد چہرے کے ساتھ خالی خالی نگاہوں سے فضا میں گھورنے لگا، اور پھر اس نے آہستگی کے ساتھ کہا "ایس۔ایس

ایس۔ایس نے مجھ کو فریب دیا ۔۔۔۔ پہلے فوج نے، پھر حفاظتی دستوں نے اور سب سے آخر میں ایس ایس نے میرے ساتھ غداری کی"۔ وہ شدتِ جذبات سے چلایا



٭ جنگ کے خاتمے کے دو روز قبل ہٹلر کی آخری تقریر

"تم سب فریبی ہو۔ دغاباز کُتّے"۔ آئندہ تین گھنٹے تک وہ غصے اور شدتِ جذبات سے بے قابو رہا اور عجیب حرکتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے ہانپتے ہوئے بھاری آواز سے کہا "تھرڈ ریخ ختم ہو گئی، سب کچھ تباہ ہو گیا۔ وائے میری ذات



جنگ کے آخری دنوں میں بھی عوام سے ملتا رہا تھا

• جرمنی فتح کرنے کے لئے امریکہ نے بکتر بند گاڑیوں اور ٹینکوں کا بے تحاشا استعمال کیا تھا۔

کے۔ لیکن میں آخر وقت تک اس فیصلہ کُن جنگ کا انجام دیکھنے کے لئے زندہ رہوں گا اور اس کے بعد میں اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گا ـــــ جرمنی شکست سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے ـــــ گوئرنگ کو اتحادیوں سے گفتگو کرنا چاہئے۔"

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۴۱ء میں ہٹلر نے اپنے ایک مخصوص حکم نامے کے ذریعے جس کو قانونی شکل بھی دے دی گئی تھی گوئرنگ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اور اسی حکم نامے کی رُو سے گوئرنگ اپنے آپ کو ہٹلر کا قانونی وارث و جانشین تصور کرتا تھا، اور اس وقت جبکہ جرمنی کا دفاع تقریباً ناممکن ہو چکا تھا گوئرنگ نے ہٹلر کے نام ایک پیغام روانہ کیا "میرے فیوہرر ـــــ مجھے آپ کے فیصلے کا علم ہو چکا ہے، کیا آپ مجھ کو اس بات کی اجازت دیں گے کہ میں جرمن عوام کے دفاع اور بہتری کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ریخ کی سربراہی اور اقتدارِ اعلیٰ بذاتِ خود سنبھال لوں۔ اگر آج دس بجے شب تک مجھے آپ کی طرف سے جواب نہ ملا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ میری رائے سے متفق ہیں۔"

اور جس وقت گوئرنگ جنرل آئزن ہاور سے ملنے کی تیاریوں میں مصروف تھا تب اچانک اس کو ہٹلر کا ایک برقی تار ملا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا "گوئرنگ ـــــ تمہاری کارگذاری نے تم کو سزائے موت کا مستحق بنا دیا ہے۔ اگر تم رضاکارانہ طور پر اپنے عہدے سے مستعفی ہو جاؤ تو تمہاری سزا میں رعایت کا امکان ہے ورنہ تمہارے خلاف سخت قدم اٹھایا جائے گا۔"

'ایڈولف ہٹلر'

گوئرنگ اس پیغام کو بغور پڑھ ہی رہا تھا کہ ایس ایس کے مخصوص دستوں نے آندھی و طوفان کی طرح آ کر اس کو گرفتار کر لیا ـــــ اور اس طرح ریخ کا مارشل اب ہٹلر کا قیدی بن چکا تھا ـــــ اس کے ساتھ ہی ہٹلر نے فوری احکامات جاری کئے کہ جرمنی کا ہر نوجوان شہری روسی حملے کو پسپا کرنے کے لئے اور برلن کا دفاع کرنے کی خاطر محاذِ جنگ پر بھیجا جائے۔ اس حکم نامے کی تعمیل نہ کرنے والے کو بروقت اسی جگہ گولی کا نشانہ بنا دیا جائے۔ اور یہ وہ وقت تھا جبکہ روسی برلن کا پوری طرح محاصرہ کر چکے تھے۔

فیوہرر بنکر میں ہٹلر کی موت سے قبل آخری ہفتے کے دوران بڑے عجیب اور دردناک مناظر دیکھے گئے ـــــ گوئبلز اور

اس کی بیوی نے اپنے چھ بچوں کو ہلاک کر دیا اور اسکے بعد دونوں نے خودکشی کر لی۔ مارٹن بورمین اور ہٹلر کی محبوبہ ایوا براؤن نے آخری لمحات تک ہٹلر کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس کے باوجود فیوہرر بنکر میں ہٹلر کے اعلیٰ عہدے داروں اور مخصوص عملے میں بڑی حد تک کمی واقع ہو چکی تھی ———— ۲۸ اپریل کو ایک اور انتہائی افسوس ناک اور مایوس کن خبر موصول ہوئی۔ جب اس کو علم ہوا کہ ایس ایس کا افسر اعلیٰ ہملر اتحادیوں سے جنگ روکنے اور ریخ کو اتحادیوں کے سپرد کرنے کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے ———— یہ ہٹلر کے لئے آخری ضرب تھی، کیونکہ اس خبر نے جرمنی کے دفاع کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا ————

۲۹ اپریل کو صبح ہٹلر اور ایوا براؤن شادی کی مختصر اور سادہ سی رسم ادا کر کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ جبکہ روسی توپ خانہ جرمن چانسلری پر گولہ باری کر رہا تھا۔ اس کے بعد ہٹلر نے اپنا وصیت نامہ مرتب کرایا جس میں اس نے گوئرنگ اور ہملر کو نازی پارٹی کی رکنیت سے معزول کر کے کارل ڈونٹز کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔

اس کے بعد ہی ہٹلر کو اطلاع ملی کہ اس کے حلیف مسولینی اور کلارا (مسولینی کی بیوی) کو اتحادیوں نے بیدردی کے ساتھ گولی مار کر ہلاک کر دیا اور ان کی لاشوں کو سر عام نمائش کے لئے لٹکا دیا گیا ———— ہٹلر کو یقین تھا کہ اگر



آخر مئی ۱۹۴۵ء کو ان دو جرمن افسروں نے جنگ ختم کر دی

اتحادیوں نے اس کو زندہ گرفتار کیا تو اس کا حشر بھی عبرتناک ہو گا۔ اس لئے اس نے پہلے ہی ہدایت کر دی تھی کہ اس کی اور ایوا براؤن کی لاشوں کو خودکشی کرنے کے بعد مکمل طور پر نذر آتش کر کے تباہ کر دیا جائے۔ روسی افواج کی پیشقدمی برابر جاری تھی، اور یکم مئی کو روسیوں کا چانسلری پر حملہ کرنے کا منصوبہ تھا۔

۳۰ اپریل کو دن کو دو بجے ہٹلر اور ایوا براؤن نے معمول کے مطابق اپنا لنچ لیا۔ اور اس کے بعد ہٹلر نے ریخ کے اعلیٰ حکام اور اپنے مخصوص عملے سے خاموشی کے ساتھ مصافحہ کیا اور اُن سب پر حسرت و افسوس سے بھرپور الوداعی نظر ڈالتا ہوا وہ ایوا براؤن کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ دروازہ بند ہوا، اور پھر چند لمحوں بعد ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ اور ہزار سالہ جرمن ریخ اپنے اختتام کو پہنچ گئی، اور اس کے ساتھ ہی ظلم، آگ و خون اور دہشت و بربریت کا ایک دور ختم ہو گیا ————

★★



دوسری جنگ عظیم کی کہانیاں

*محراب اردو ڈائجسٹ سے انتخاب

*مشہور عالم ناولوں کی تلخیص

(3)